# عرب اور اسلام

پروفیسر فلپ، کے، حتی کی مشہور و معروف انگریزی کتاب "ہسٹری آف دی عرب" کے خلاصے کا مکمل ترجمہ جس میں یورپ کو اسلام، اس کے پیام، اس کی خدمات اور انسانیت پر اس کے احسانات سے روشناس کرایا گیا ہے۔

مترجمہ

پروفیسر سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔اے (عثمانیہ)

و

محمد معین خاں صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

~~قیمت غیر مجلد تین روپیے آٹھ آنے~~
" مجلد چار روپیے آٹھ آنے

رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۰ھ
جولائی سنہ ۱۹۵۱ء
طبع اول ایک ہزار

مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی

# مضامین کی فہرست

# مترجم کی عرض

پروفیسر فلپ، کے، حِتّی کی انگریزی کتاب History of the Arabs پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اور اشاعت کے ساتھ ہی یورپی ادب میں اسلامیات پر ایک گراں قدر اضافہ تسلیم کرلی گئی۔ حسنِ قبول کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک اس کے چار اڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ نکل گئے۔ دوسری بڑی لڑائی میں مشرق وسطیٰ میں امریکی فوجیں پھیل گئی تھیں امریکہ کے محکمۂ امورِ جنگ نے ان امریکی سپاہیوں کے لیے جہاں اور کتابیں چھاپیں وہاں پروفیسر حتّی سے کہہ کر ان کی مفصل کتاب کا خلاصہ تیار کرایا اور اسے "The Arabs, a Short History" کے نام سے شائع کیا۔ بعد میں یہ خلاصہ عام پڑھنے والوں کے لیے الگ بھی چھاپ دیا گیا۔ اس خلاصہ میں پروفیسر حتّی نے صرف ایسے اجزاء شامل کیے ہیں جن کے ذریعے خاص کر مغرب کو اسلام سے، اسلام کے پیام سے، اس کی خدمات سے، انسانیت پر اس کے احسانات سے روشناس کرایا جاسکتا تھا۔ تاریخی تفصیلات اور وقائع کو انہوں نے اس کتاب میں حذف کر دیا ہے۔ لیکن اس اسپرٹ یا اس روح کو بہت نمایاں کرکے پیش کیا ہے جو اسلام کی تاریخ کی ابتداء سے لے کر اب تک پوری دنیا کے مسلمانوں میں جاری و ساری رہی ہے۔ "عرب اور اسلام" اسی خلاصہ کا ترجمہ ہے۔ یہ خلاصہ بھی اتنا مقبول ہوا کہ انگریزی میں کئی بار چھپنے کے سوا عربی، اسپینی، پرتگالی، فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ خبر آئی تھی کہ پنجاب کا ایک باہمت ادارہ اصل کتاب کو کئی ماہروں کے ذریعہ اردو میں منتقل کرکے چھاپنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اب تک یہ مبارک ارادہ کیوں ملتوی رہا۔

پروفیسر فلپ، کے، حتّی نسلاً شامی عرب، مذہباً نصرانی اور قومیت کے لحاظ سے امریکی

ہیں۔ پہلے فلسطین کی یہودی جامعہ میں اسلامیات کے اُستاد تھے اور علمی دنیا میں اپنی بلند پایہ کتابوں اور عالمانہ مقالوں کی وجہ سے بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اب امریکہ کی جامعۂ پرنسٹن میں سامی ادبیات کے پروفیسر ہیں۔

پروفیسر حتی کی تاریخ عرب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس تعصب سے پاک ہے جو عام طور پر یورپ کے نصرانی مورخوں کی تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسری طرف ان کی کتاب میں وہ تحسین ناشناس بھی موجود نہیں جو بعض یورپی مصنفوں کی کتابوں میں نظر آتی ہے یہ دونوں باتیں علمی تصانیف کو علمی پایہ سے گرا دیتی ہیں، لیکن پروفیسر حتی ہر جگہ اعتدال اور توازن سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نظر حقائق بیں اور دقائق رس ہے۔ وہ اپنے ذہنی مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے۔ اپنی طرف سے حاشیہ آرائی اور رنگ آمیزی نہیں کرتے۔ ایک طرف جہاں انہوں نے اسلام کے پیام کا، اس کی خوبیوں کا، انسانیت پر اس کے احسانات اور اس کی خدمات کا نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور اس کے عروج کی دلپذیر داستان نہایت دلکش انداز میں سنائی ہے تو دوسری طرف اُنہوں نے نام نہاد مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں خود غرضیوں، بے راہ رویوں اور ان کے انحطاط و زوال کے دل خراش اور خونچکاں حادثہ کے اسباب و علل پر بھی منصفانہ بحث کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی بے مثل تاریخ بوجھل عالمانہ حوالوں اور سنین و خشک واقعات کا اکتا دینے والا انبار نہیں، بلکہ اپنے جاذب انداز بیان اور واقعات اور تاریخی حقائق سے نتائج کے دلکش طرز استنباط کی وجہ سے ادب عالیہ کا دل پذیر نمونہ بن گئی ہے۔ اسی لیے عالم اور عامی دونوں کے لیے یکساں مفید اور یکساں جاذب ہے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں میں نے اپنے مکرم دوست اور ساتھی جناب محمد معین خاں صاحب بی، اے (عثمانیہ) کے ساتھ اس کتاب کا ترجمہ شروع کیا۔ ترجمہ کا کام ختم ہونے کے بعد پورے ترجمہ پر کئی بار نظر ثانی کی گئی اور ابہام سے بچنے کے لیے دو چار مقاموں پر خلاصہ کو ترک کر کے اصل

سے رجوع کیا گیا۔ اس کے بعد اس ترجمہ کا مقابلہ عربی ترجمہ سے کیا گیا۔ مقامات اور اشخاص کے ناموں کے املا کی صحت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا اور اپنی بساط کے مطابق کوئی مطلب تشنہ مبہم یا مشتبہ نہیں چھوڑا

یقین ہے جس محنت، جس محبت اور جس خلوصِ نیت کے ساتھ یہ ترجمہ کیا گیا ہے، صاحبانِ نظر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے، اور یہی مترجموں کا سب سے بڑا انعام اور سب سے بڑا صلہ ہے ؎

گرچہ از نیکاں نئیم، لیکن زنیکاں بستہ ایم
درریاضِ آفرینش دستۂ گلدستہ ایم

مبارز الدین رفعت

اورنگ آباد
جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

# مصنف کا دیباچہ

پچھلے چند سالوں کے واقعات نے ہم پر عرب دنیا کی اہمیت کچھ اس طرح واضح کردی ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس کا اندازہ نہ ہوا تھا۔ یہ عرب دنیا ایک ایسی بین قومی تجارتی اور حمل ونقل کی شاہراہ کے اطراف پھیلی ہوئی ہے جو تین تاریخی براعظموں کو ملاتی ہے۔ شمالی افریقہ اور بحیرۂ روم میں جو فوجی کارروائیاں ہوئیں، ایران سے ہوتے ہوئے روس تک سامان پہنچانے کے لیے جو راستہ استعمال کیا گیا، اور کیسا بلانکا، قاہرہ اور طہران میں اتحادیوں کی جو کانفرنسیں ہوئیں، ان سب باتوں سے اس علاقے کی فوجی اہمیت کی طرف ذہن متوجہ ہو گئے۔ حال کے واقعات یہ بات اچھی طرح واضح کر رہے ہیں کہ پائدار امن کے قیام کے لیے اس علاقے کے بعض سیاسی مسئلوں کا سلجھانا ضروری ہے۔ یہ مسائل تمام بڑے یورپی ملکوں کے آپس کے بڑے بڑے جھگڑوں میں الجھ گئے ہیں، اور انہیں افریقہ، ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کے بہت بڑے حصّوں کی سیاست کو متاثر کیے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا جہاں ستائیس کروڑ پچاس لاکھ مسلمان آبادی کا جزو اعظم ہیں۔

اس علاقے سے ہماری دلچسپی صرف سیاسی یا معاشی نہیں۔ برطانوی اور امریکی اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ ایک عرصہ سے ہمارے گہرے ثقافتی تعلقات مشرق قریب سے قائم ہیں، ان اسکولوں اور کالجوں نے اور بہت سے تبلیغی مشنریوں کے کام نے یہاں کے ذہنی نشوونما پر زبردست اثر ڈالا ہے۔

پچھلی بڑی لڑائی تک تقریباً پورا عرب ایشیا، ترکی عثمانی سلطنت میں داخل تھا۔ کچھ دنوں تک برطانوی کٹھ پتلی انتداب میں رہنے کے بعد عراق، بغداد میں ایک عرب بادشاہ

کے تحت ایک آزاد ریاست بن گیا ہے۔ جمہوریۂ شام اور جمہوریۂ لبنان فرانسیسی انتداب کے پھندے سے نکل چکی ہیں۔ عرب جزیرہ نما کا بڑا حصہ دو مقامی حکمرانوں کے تحت ہے۔ ملک ابن سعود شمال میں اور امام یحییٰ جنوب میں۔ اسلامی دنیا کی قیادت کے آرزومند مصر نے سنہ ۱۹۳۶ء میں اپنے نوعمر بادشاہ کو ایک آزاد ریاست کے پہلے خود مختار حکمراں کی حیثیت سے تخت نشین کرایا۔ یمن کے سوا یہ تمام ریاستیں لندن اور واشنگٹن میں اپنے سفیر رکھتی ہیں۔ اور مختلف دروازوں سے مغربی دنیا میں داخل ہونا چاہتی ہیں ان ریاستوں کے مسائل اور ان کی قومی اور بین قومی تمناؤں کو اس وقت تک پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ انہیں ماضی کے پس منظر میں رکھ کر نہ دیکھا جائے

یہ صفحات عالِم کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں، انہیں عام پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ صفحے بہت اختصار کے ساتھ قرون وسطیٰ میں اسلام کے عروج، اس کی فتوحات اس کی مملکت اور اس کی عظمت و زوال کی داستان سناتے ہیں۔ عربوں اور عربی بولنے والی قوموں کی کہانی ہماری نظروں کے آگے تاریخ کا ایک واقعی پُرعظمت اور ہدایت نما منظر پیش کرتی ہے۔ اُمید ہے عرب دنیا کی یہ مختصر تاریخ اس بات کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب رہیگی کہ یہ تاریخ خود ہماری تاریخ کا کتنا اہم حصہ ہے۔

# ۱۔ عرب اور مسلمان

حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر ہی آپؐ کے پیرو ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کے مالک بن گئے تھے جو رومیوں کو ان کے انتہائی عروج کے وقت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے دامن اگر ایک طرف خلیج بسکے (Biscay) سے دریائے سندھ اور چین کی سرحدوں تک پھیل گئے تھے تو دوسری طرف بحیرۂ خوارزم اور دریائے نیل کے شمالی آبشاروں کو انہوں نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ ریگ زارِ عرب کے فرزند رسول کا نام خدائے قدیر اللہ کے نام کے ساتھ دن میں پانچ دفعہ ان سیکڑوں ہزاروں مسجدوں کے بلند میناروں سے پکارا جا رہا تھا جو جنوبی یورپ اور شمالی افریقہ سے لے کر مغربی اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اپنی اس بے نظیر وسعت پذیری کے دور میں مسلمان عربوں نے اپنی دینی عقائد، طرز کلام، حتّٰی کہ اپنے جسمانی خدوخال کے اعتبار سے بھی غیر قوموں کے افراد کی جتنی تعداد کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، اتنی بڑی تعداد میں دنیا کی کوئی قوم آج تک جذب نہ کر سکی — نہ یونانی، نہ رومی، نہ انگلوسیکسن، نہ روسی!

بابلی، اشوری، کلدانی، آرامی اور فنیقی جیسی قوموں کے آباؤ اجداد جزیرہ نمائے عرب ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے تھے لیکن سیکڑوں برس ہوئے زمانے نے صفحۂ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا، لیکن عرب — وہ آج بھی زندگی کے وسعت پذیر میدان میں زندہ قوموں کے ساتھ — شانہ بشانہ نہ سہی — رواں دواں ہیں پہلے کی طرح آج بھی تجارتی دنیا کی ایک عظیم شاہراہ کے قریب عربوں کا وجود قائم و برقرار ہے۔ پہلی بڑی لڑائی کے بعد سے عربوں کو اپنی میراثِ ازلی یعنی آزادی کامل کا شدید ترین شعور پیدا

ہو چلا ہے۔ مصر کے خود مختار اور آزاد مملکت ہونے کا اعلان ہو چکا ہے۔ عراق نے اپنے قدیم دارالامارۃ بغداد میں اپنے بادشاہ کو تخت نشیں کر دیا ہے۔ اور عرب جدید کے مرد توانا ابنِ سعود نے اپنے زور بازو سے ایک بڑی اور مستحکم سلطنت قائم کی ہے جس میں وسطی اور شمال مغربی عرب کا بیشتر حصّہ شامل ہے۔ لبنان پہلی عربی بولنے والی ریاست ہے جس نے اپنے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔

عنقا — ایک عربی پرندہ — پھر پرواز کر رہا ہے۔ اس کے شہپروں کی قوتِ رفتہ عود کر آئی ہے۔ دین اسلام جس کی نیو حضرت محمدؐ کے ہاتھوں نے رکھی تھی اُس میں آج دنیا کی تقریباً تمام نسلوں کے افراد شامل ہیں۔ تقریباً ستائیس کروڑ سے زیادہ انسان اس دین کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ مغرب میں انہیں اکثر "محمڈن" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ خود 'محمڈن' کی بجائے مسلمان کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہماری دنیا کے ہر آٹھ آدمیوں میں ایک آدمی حضرت محمدؐ کا امتی یعنی مسلمان ہے۔ دن اور رات کے چوبیں گھنٹوں میں سے کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرتی کہ کرۂ ارض کے کسی نہ کسی مقام سے مسلمانوں کی اذانیں فضا میں بلند نہ ہوتی ہوں۔

عربوں نے صرف ایک وسیع سلطنت ہی قائم نہیں کی، بلکہ ایک گراں قدر اور رسا ثقافت بھی تعمیر کی۔ اس ثقافت کی تعمیر میں انہوں نے صرف اپنے اس قدیم موروثی تمدن ہی سے فائدہ نہیں اُٹھایا جو کسی زمانہ میں دجلہ و فرات کے کناروں، ارضِ نیل کے میدانوں اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر پروان چڑھا تھا، بلکہ انہوں نے یونان و روما کی ثقافت کی بعض امتیازی خصوصیتوں کو بھی اس میں جذب کر لیا۔ یہی مسلمان آگے چل کر قرونِ وسطیٰ میں یورپ کو ایسے ذہنی تاثرات کے منتقل کرنے کا وسیلہ بنے جنہوں نے مغربی دنیا کو بیدار کر کے اسے نشأۃ جدیدہ کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے قابل بنا دیا۔

انسانیت کی بہتری اور بھلائی کے لیے جو خدمات عربوں نے قرون وسطیٰ کی ابتداء

میں انجام دی ہیں ویسی خدمت کسی اور قوم نے انجام نہیں دی۔ یہاں عربوں سے ہماری مراد دنیا کی تمام عربی بولنے والی آبادی ہے اور اس میں جزیرہ نمائے عرب کے باشندے بھی شامل ہیں۔ اس زمانہ میں جب کہ عرب علماء ارسطو کا مطالعہ کر رہے تھے، یورپ میں شارلمین اور اس کے امراء اپنے نام کے ہجے سیکھ رہے تھے۔ ایک اسلامی شہر قرطبہ ہی میں سترہ بڑے کتب خانے تھے۔ ان میں سے ایک کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں۔ ایسے زمانے میں جبکہ جامعۂ اکسفورڈ کے عالم غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم جانتے تھے، اسی قرطبہ کے مسلمان سائنس داں پُر تکلف اور نزہت بیز حماموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عربوں کی داستان ہمارے لیے اس لیے بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بطن میں دنیا کے تیسرے اور جدید ترین مذہب توحید کی داستان پوشیدہ ہے اور صیہونیت اور نصرانیت سے اس کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ تاریخی اعتبار سے اسلام ان دونوں مذہبوں ہی کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ دنیا کے تمام مذہبوں کے مقابلہ میں صرف اسلام ہی ان سے قریب ترین رشتہ رکھتا ہے۔ یہ تینوں مذہب ایک ہی روحانی سرچشمے یعنی سامی زندگی کے سوتے ہیں۔ ہر مسلمان بے تامل نصرانیت کے بہت سے عقیدوں کا قائل ہے۔ عرب فوجوں کی فتحمندیاں مدوجزر کی طرح گھٹتی بڑھتی رہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ کے پیش کیے ہوئے توحید کے عقیدے ہی نے ابتداء میں بھی اور بعد میں بھی منگولی ترک جیسی طاقتور قوموں پر فتح پائی تھی۔ حالانکہ یہی منگولی ترک دست بدست مقابلوں میں عربوں کو نیچا دکھا چکے تھے۔ نئی دنیا کے لیے اس اہم ترین صداقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام پچھلے زمانہ میں ایک ذی حیات قوت رہا ہے اور آج بھی مراکش سے لے کر ملایا تک اسلام کی یہی حیثیت برقرار ہے۔ اسلام کروڑوں فرزندانِ آدم کا شعارِ حیات ہے۔

آج بھی عربی کم وبیش پانچ کروڑ انسانوں کی زبان ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں صدیوں تک

عربی زبان ساری متمدن دنیا میں علم وثقافت اور ترقی پسند تفکر کے اظہار کا واحد ذریعہ رہی ہے نویں صدی سے لے کر بارہویں صدی کے درمیانی زمانے میں فلسفہ، طب، تاریخ ہیئت اور جغرافیہ کی جتنی کتابیں عربی زبان کے ذریعہ عالم وجود میں آئیں اُتنی کتابیں کسی اور زبان میں نہیں لکھی گئیں۔ مغربی یورپ کی زبانوں پر آج بھی عربی زبان کے اثرات موجود ہیں۔ گو لاطینی رسم کتابت موجودہ دنیا کا وسیع ترین لسانی نظام ہے، اس کے باوجود وسعت کے اعتبار سے عربی حروف ہجا، کا درجہ لاطینی زبان کے حروف تہجی کے بعد ہی آتا ہے۔

دنیا میں اس وقت سامی نسل کے صرف دو ہی نمائندے ہیں ایک عرب اور دوسرے یہودی۔ اس نسل کے جسمانی خدوخال اور ذہنی خصوصیتیں یہودیوں کے مقابلہ میں عربوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ گو ادبی نقطۂ نظر سے عربوں کی زبان سامی گروہ کی سب سے کم عمر زبان ہے، تاہم عبرانی اور دوسری سامی زبانوں کے مقابلہ میں عربی زبان نے اپنی اصل کی امتیازی خصوصیتوں کو زیادہ برقرار رکھا ہے۔ اسلام بھی اپنی اصل کے اعتبار سے سامی مذہب کی منطقی تکمیل ہے۔ یورپ اور امریکہ میں "سامی" کی اصطلاح یہودیوں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ سامیوں یعنی یہودیوں کے امتیازی خدوخال کو جس میں ستواں ناک بھی شامل ہے حقیقی سامی خدوخال سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ تو ہے کہ یہی خدوخال یہودیوں اور سامیوں کے بنیادی فرق کو نمایاں کرتے ہیں اور اسی خدوخال سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ابتدائی عبرانیوں نے حطیوں اور حوریوں میں شادی بیاہ کیا ہے۔ اس طرح خون کے میل سے یہودیوں میں وہ خدوخال نمودار ہوئے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

اس بات کا ثبوت عربوں کی جغرافیائی بے تعلقی اور ریگستان کی غیر تغیر پذیر یکساں زندگی میں تلاش کیا جاسکتا ہے کہ عرب خاص کے باشندے اور خاص کر بادیہ نشین عرب ہی — کیا بلحاظ حیاتیات، کیا بلحاظ نفسیات، کیا بلحاظ عمرانیات اور کیا بلحاظ لسانیات — سامی نسل کے بہترین مظہر ہیں۔ وسط عرب جیسے الگ تھلگ اور تکلیف دہ ماحول میں بے میل

خون ہی قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ "جزیرۃ العرب" زمین اور آبادی کے درمیان ایک ایسے غیر منقطع رشتہ کی مثال پیش کرتا ہے جس کی تقریباً پوری دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اگر سرزمین عرب میں بیرونی قوموں کی موج در موج توطن پذیری اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کی آپس کی لڑائی اور پھر اپنے وطن سے بے دخلی کا کوئی عمل ہوا ہے ـــ جیسا کہ ممالک ہند، یونان، اطالیہ انگلستان اور امریکہ میں ہو چکا ہے ـــ تو اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ دنیا کسی ایسے حملہ آور کے نام سے واقف نہیں جس کو ریگ زار عرب میں در آنے اور مستقل طور پر یہاں قدم جمانے میں کامیابی ہوئی ہو۔ تقریباً تمام تاریخی دوروں میں اہل عرب اور خاص کر بدویوں کی زندگی کا چلن ایک ہی رہا ہے۔ سامی قوم کے آباواجداد ـــ بابلی، اشوری، کلدانی، عموری، آرامی، فنیقی، عبرانی، عرب اور حبشی ـــ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ملک میں انہوں نے کسی زمانے میں ایک قوم کی طرح زندگی بسر کی تھی۔

# ۲۔ اصلی عرب ۔ بدوی

اگرچہ اس کتاب میں ہمارا تعلق ان تمام عربی بولنے والی قوموں سے ہے جو صرف ملک عرب ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک — شام، لبنان، فلسطین، شرق اردن، عراق، ایران، مصر، شمالی افریقہ، صقلیہ (سسلی) اور ہسپانیہ (بعہد وسطیٰ) — میں بھی بستی ہیں۔ تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اصلی عربوں یعنی بدویوں کے حالات پر روشنی ڈالی جائے۔

بدوی اُن جپسیوں ( Gipsys ) کے مانند نہیں ہوتے جو بے مقصد و منزل آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ریگستان کے ساتھ حیاتِ انسانی کی توافق پذیری کے بہترین مظہر ہیں۔ جہاں کہیں گھاس اُگتی ہے وہاں بدوی چراگاہوں کی تلاش میں پہنچ جاتا ہے۔ نفود میں خانہ بدوشی ایسی ہی سائنٹفک طرزِ زندگی ہے جیسی کہ ڈٹریاٹ (امریکہ) اور مینچسٹر (انگلستان) میں صنعتی زندگی۔ بدویت ایک ناسازگار ماحول سے متوازن اور معقول تطابق ہے۔ کیونکہ ایک قابلِ سکونت خطۂ زمین کے سوا جو ساحل سے لگا ہوا چلا گیا ہے، عرب کا تقریباً سارے کا سارا ملک ریگستانی ہے۔ عرب اپنے ملک کو "جزیرہ" کہتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ عرب ایک ایسا جزیرہ ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف ریت ہی ریت ہے۔

ملکِ عرب دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے لیکن اس قدر وسیع ملک ہونے کے باوجود اس کی کل آبادی ساٹھ ستر لاکھ سے زیادہ نہیں۔ طبقات الارض کے ماہر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں عرب کی سرزمین افریقہ کے صحرائے اعظم (جسے اب وادی نیل اور بحیرۂ احمر نے ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہے) اور اس صحرائی ریگنائے کا قدرتی سلسلہ

تھی جو ایشیا میں عرضاً وسطی ایران سے لے کر صحرائے گوبی تک چلی گئی ہے۔ عرب دنیا کا ایک گرم ترین اور خشک ترین ملک ہے۔ اگرچہ عرب کی زمین شرقاً غرباً دو سمندروں کو چیرتی ہوئی چلی گئی ہے لیکن سمندر اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے عرب کی خشک آب و ہوا کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے جنوب میں جو سمندر ہے اس سے یہاں بارش ضرور ہوتی ہے لیکن مان سون (یہ ایک عربی لفظ ہے۔ اصل عربی لفظ سَمُوم ہے) یا موسمی ہوائیں ملک کے اندرونی حصے میں بہت کم برستی ہیں۔ اتنا معلوم ہونے پر یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ خوشگوار اور جانفزا مشرقی ہوائیں (عربی الصبا) ہمیشہ سے عرب شاعروں کے نغموں کا دلپذیر موضوع کیوں بنی رہی ہیں۔

اپنے آباء و اجداد کی طرح بدوی اب بھی بھیڑوں اور اونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں۔ اپنے گلّوں کو انہی قدیم چراگاہوں میں چراتے ہیں۔ اونٹوں اور بھیڑوں کی گلہ بانی کے سوا ایک حد تک گھوڑوں کی پرورش و پرداخت، شکار، اور لوٹ مار بھی بدویوں کی زندگی کے مخصوص مشغلے ہیں۔ وہ زراعت اور ہر قسم کی تجارت و حرفت کو اپنے مرتبہ سے فروتر سمجھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عرب میں کاشت کے قابل زمین بہت تھوڑی ہے۔ یہاں گیہوں بہت کم ہوتا ہے۔ عرب کے حق میں روٹی ایک نعمت ہے۔ کھجور اور اس جھاڑی کے سوا جس سے جنوبی عرب کی مشہور کافی (اسے عربی میں "بن" کہتے ہیں، چودھویں صدی میں اس کا بیج حبشہ سے لاکر یمن میں بویا گیا اور اسی زمانے سے عرب میں اس کا استعمال عام ہوگیا) حاصل کی جاتی ہے۔ یہاں بہت کم درخت پائے جاتے ہیں۔ نخلستان میں انگور کی بیلیں، گنّا، کئی قسم کے میوے اور بادام اور تربوز بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ لوبان کو جنوبی عرب کی ابتدائی تجارتی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کا درخت اب بھی پھلتا پھولتا نظر آتا ہے۔

عربستان ایک نہایت ہی مصائب انگیز ملک ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بالکل خشک

اور زمین شور ہے۔ ملک کے پورے طول و عرض میں کوئی دریا ایسا نہیں پایا جاتا جو برس کے بارہ مہینے بہتا ہوا سمندر میں جا ملتا ہو۔ کوئی دریا جہاز رانی کے قابل نہیں ہے۔ دریاؤں کی جگہ عرب میں پہاڑی نالوں (عربی میں ایسے نالوں کو "وادی" کہتے ہیں) کا جال بچھا ہوا ہے۔ ملک میں جو سیلاب — سیل — آتے ہیں انہیں یہی نالے بہا لے جاتے ہیں۔ ان نالوں سے ایک اور کام لیا جاتا ہے۔ یہ نالے حاجیوں اور کاروانوں کے لیے راستے متعین کرتے ہیں۔ اسلام کے عروج کے بعد سے عرب اور بیرونی دنیا کے درمیان حج بیت اللہ نے ایک اہم اتصالی کڑی کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

سواحلِ عرب کی ہلال نما شاداب سرزمین پر کئی شہنشاہیتیں قائم ہوئیں اور فنا ہو گئیں لیکن اس کے بے آب و گیاہ ریگستان میں رہنے والے بدویوں کی زندگی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ ریگستان پر بدوی، اونٹ اور کھجور کا راج ہے۔ اگر ریت کو بھی ان تینوں کے ساتھ شریک کر لیا جائے تو ان سے ریگستانی ڈرامے کے چار بڑے اداکاروں کی فہرست مکمل ہو جاتی ہے۔

سخت کوشی، محکم گیری، اور قوّتِ تحمل کی بدولت ہی خانہ بدوش بدوی ریگستان جیسے مقام پر جی رہا ہے جہاں کوئی چیز پنپ نہیں سکتی۔ انفرادیت بدوی کی رگ و پے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ سماج کے اعتبار سے وہ کبھی ذی شعور مخلوق نہ بن سکا۔ مفادِ عامہ کے بارے میں اس کے پرخلوص تصورات اپنے قبیلے کی حدوں سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ نظم و ضبط اور حاکم و حکومت کے احترام کے لیے اس کے تصورات میں کوئی جگہ نہیں۔

سامی مذہب کے ابتدائی عقائد کو ریگستان کے مقابلہ میں نخلستانوں میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اور پتھروں اور چشموں کو ان عقائد میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان پتھروں اور چشموں کو توریت کے بیت ایل اور اسلامی حجر اسود کا پیشرو سمجھنا چاہیے۔ لیکن بدوی

کا دل مذہب سے بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے۔ قرآن کی نظر میں عرب کے بادیہ نشین کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں .... اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا .... (التوبہ آیت ۹۷) حد یہ کہ موجودہ زمانہ میں بھی بدوی اپنے پیغمبر سے زبانی اظہارِ عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

بدوی کے جسم کی وضع قطع اور اس کے ذہن کی بناوٹ اس کے ریگستانی وطن کی آب وہوا کی یکسانیت اور خشکی کی سچی آئینہ دار ہے۔ بدوی عصبوں اور نسیجوں اور ہڈیوں کی ایک گٹھری ہوتا ہے۔ کھجور۔ تمر۔ اور دودھ اس کے آذوقۂ حیات کے اہم ترین اجزاء ہیں۔ صرف کھجور اور اونٹ کا گوشت ہی اس کی ٹھوس غذائیں ہیں۔ کھجور میں خمیر پیدا کر کے وہ اپنا مرغوب مشروب۔ نبیذ۔ تیار کرتا ہے۔ کھجور کی گٹھلیوں کی روٹیاں اس کے اونٹ کی روزانہ کی غذا ہے۔ ہر بدوی کھجور اور پانی پر تصرف پانے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔

غذا کی طرح اس کا لباس بھی بہت مختصر ہوتا ہے۔ ایک لمبی قمیص پر کمر بند لپٹا ہوا اور ایک ڈھیلی ڈھالی عبا جو تصویروں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ سر پر ایک شال۔ کوفیہ۔ جس کو ایک ڈوری۔ عقال۔ سے باندھ لیا جاتا ہے۔ پاجامہ نہیں پہنا جاتا، اور جوتا کم ہی استعمال ہوتا ہے۔

عرب کے چوپایوں میں دو جانور بہت اہم ہیں۔ ایک اونٹ اور دوسرا گھوڑا۔ اونٹ کے بغیر تو یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ریگستان کبھی کوئی بسنے کا مقام ہو سکتا ہے۔ اونٹ بدوی کا کفیل، نقل وحمل کا ذریعہ، اور اس کے کاروبار میں آلۂ مبادلہ ہے۔ دلہن کا جہیز، خوں بہا، قمار بازی کی جیت۔ مَیْسِر۔ اور شیخ کی دولت یہ ساری چیزیں اونٹ ہی کی اصطلاح میں شمار کی جاتی ہیں۔ اونٹ بدوی کا جاں نثار رفیق، اس کی دوسری انا، اور اس کی رضاعی ماں، رضاعی باپ ہوتا ہے۔ بدوی پانی کی بجائے اونٹ کا دودھ پیتا ہے اور پانی اپنے چوپایوں کے لیے اٹھا رکھتا ہے۔ اس کا گوشت کھاتا ہے اس کی کھال اوڑھتا ہے، اس کے بالوں سے اپنا خیمہ بنتا ہے، اس کی مینگنیاں ایندھن

کے طور پر جلاتا ہے۔ اس کے پیشاب کو سر کے بالوں میں مقوی دوا کے طور پر ڈالتا ہے اور کیڑے مکوڑے کے کاٹنے سے محفوظ رہنے کے لیے اسے اپنے چہرے پر ملتا ہے۔ غرض اس کے حق میں اونٹ کی حیثیت "جہاز صحرا" سے بھی زیادہ ہے۔ یہ اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔

آج کل کے بدویوں کو بھی اگر "اونٹ والے" — اہل الوبر — کے نام سے مخاطب کیا جائے تو وہ اس خطاب سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ میوسل نے (Musil) اپنی کتاب " قبیلہ رولا کے بدّیوں کے عادات واطوار" میں بیان کیا ہے کہ اس قبیلہ کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی اونٹ کے پیٹ کا پانی نہ پیا ہو۔ ناگہانی صورتوں میں یا تو کسی اونٹ کو ذبح کر لیا جاتا ہے یا پانی اگلوانے کے لیے اس کے حلق میں ایک چھڑی ٹھونس دی جاتی ہے۔ اونٹ کو پانی پیے ہوئے اگر ایک دو دن گزر جائیں تب بھی اس کے پیٹ سے نکلا ہوا پانی انسان کے لیے ہر طرح پینے کے قابل ہوتا ہے۔

عربستان چونکہ اونٹ کی افزائشِ نسل کا اہم ترین مرکز ہے اس لیے اونٹ کی تجارت اور اس سے متعلق صنعتیں اس ملک کی آمدنی کا ایک زبردست ذریعہ ہیں۔ عرب کی معاشی زندگی میں اونٹ کا جو حصہ رہا ہے وہ اس حقیقت سے واضح ہے کہ اس کی بے شمار قسموں، نسلوں، حالتوں اور نشوونما کے درجوں کے لحاظ سے عربی زبان میں اونٹ کے ہزاروں نام ہیں۔ ناموں اور لقبوں کی کثرت کے اعتبار سے تلوار ہی ایک ایسی چیز ہے جو ایک حد تک اونٹ کی حریف بن سکتی ہے۔

اس کے برخلاف گھوڑا ایسا جانور ہے جس کا شمار تعیشات میں کیا جاتا ہے۔ اس کی داشت پرداخت بادیہ نشین کے لیے ایک اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گھوڑے کی ملکیت دولت کی علامت ہے۔ اگرچہ عربی گھوڑے نے اسلامی ادبیات میں خاصی شہرت حاصل کرلی ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ عرب قدیم میں گھوڑا بعد کے زمانے کی درآمد ہے لیکن ایک بار عربستان میں پہنچ جانے کے بعد ہمارا زمانہ شروع ہونے سے پہلے تک گھوڑے

کو اپنی نسل کو ادھر اُدھر کے میل ملاپ سے محفوظ رکھنے کا پورا پورا موقع حاصل تھا۔ عرب کا گھوڑا ۔ الخیل ۔ جسم کی خوبصورتی، قوتِ تحمل، فہم و تمیز اور مالک کے ساتھ جاں نثارانہ وفاداری کے لیے مشہور ہے۔ گھوڑوں کی عمدہ نسل کے متعلق اہل مغرب کی معلومات کا سرچشمہ بھی عرب کا اصیل گھوڑا ہی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں نے اصیل عربی گھوڑے کو اندلس کے ذریعہ یورپ میں متعارف کرایا۔ یہاں اس گھوڑے نے اندلسی اور بربری گھوڑوں میں اپنے دائمی آثار چھوڑے ہیں۔ انگریزی گھوڑوں نے صلیبی لڑائیوں کے دوران میں عربی گھوڑوں کا تازہ خون حاصل کیا تھا۔

عرب کے نزدیک گھوڑے کی سب سے بڑی خوبی اس کی تیز رفتاری ہے کیونکہ بدوی چھاپوں کے لیے تیز رفتاری از بس ضروری ہے۔ گھوڑا گھڑ دوڑ اور شکار جیسی تفریحوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آج بھی اگر کسی عرب کے خیمہ میں پانی کی قلت ہو، یہاں تک کہ خود اس کے بچے پانی کے لیے بلک رہے ہوں، تب بھی صاحب خانہ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر پانی کا آخری قطرہ تک اپنے گھوڑے کی گگری میں ڈالتا نظر آئیگا۔

اگرچہ لوٹ مار یا غزوہ (جس کی شکل بگڑ کر یورپی زبانوں میں Razzia ہو گئی ہے) اکثر صورتوں میں ڈکیتی کے مترادف ہے لیکن عرب کے معاشی و سماجی حالات نے اس کو قومی شعار کا درجہ دے دیا ہے۔ یہ لوٹ مار بدؤوں کی گلہ بانی کی زندگی کی معاشی بنیاد ہے۔ ریگستان میں جہاں جنگ جوئی باشندوں کی فطرتِ ثانی ہے، لوٹ مار کو مردانگی کا اہم ترین مشغلہ شمار کیا جاتا ہے۔ نصرانی عرب قبیلوں کا بھی یہی شعار رہا ہے۔ قرن اول کے ایک شاعر قطامی نے ایسی ہی زندگی کے بنیادی اصول کو ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

وَاَحْیَانًا عَلیٰ بَکْرٍ اَخِینَا　　اِذَا مَالَمْ نَجِدْ اِلَّا اَخَانَا

(اور کبھی کبھار ہم لوٹ ڈالتے ہیں بنی بکر پر جو ہمارے بھائی ہیں جبکہ لوٹنے کے لیے ہیں

اپنے بھائیوں کے سوا اور کوئی نہیں ملتا)

غزوہ ایک قسم کا قومی کھیل بھی ہے۔ اس کے قواعد کی رو سے ناگزیر صورتوں کے سوا خون بہانا جائز نہیں۔ غزوہ سے کھانے والوں کی گنتی تو ایک حد تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے ممکن الحصول رسدوں کی مجموعی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک کمزور قبیلہ یا سرحد کی کوئی حضری آبادی کسی طاقتور قبیلہ کو کچھ خراج ادا کر کے اپنے لیے اس کی حمایت اور سرپرستی حاصل کر لیتی ہے

مہماں نوازی کا اصول بہر حال غزوہ کی برائیوں کی شدت کو ایک حد تک اعتدال پر لے آتا ہے۔ بدوی دشمن کی حیثیت سے چاہے کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو، وہ اپنے آئینِ رفاقت کے دائرے میں وفادار اور کریم النفس بھی واقع ہوا ہے۔ بدویوں میں قوتِ تحمل ۔ صبر ۔ اور شجاعت ۔ حماسہ ۔ کے ساتھ ساتھ مہماں نوازی ۔ ضیافہ ۔ بھی قبیلہ کی اہم ترین خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اسلام سے پہلے کے شاعر جنہیں اپنے زمانے کے صحافت نگار کہنا بے جا نہ ہوگا، مہماں نوازی کے گن گانے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ پانی اور چراگاہ کے لیے بدویوں کی شدید ترین مسابقت ریگستانی آبادی کو مخالف و متحارب قبیلوں میں منقسم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ مسابقت بسا اوقات آپس کی تکرار سے بڑھ کر جنگ و پیکار پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن بے رحم اور سرکش فطرت کے مقابلہ میں بے چارگی کا تمام احساس ایک مقدس جذبے ۔ مہمان نوازی ۔ کی پرورش کرتا ہے۔ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مسافروں کے لیے قیام گاہیں یا سرائیں نہیں، کسی مہمان کو قبول کرنے سے انکار کرنا، یا قبول کر کے اسے تکلیف دینا، شرافت کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ خود حافظِ حقیقی خداوند قدوس سے بھی روگردانی کے برابر ہے۔

خاندانی نظام بدویوں کے معاشرے کی بنیاد ہے۔ ہر خیمہ ایک خاندان اور ہر پڑاؤ ایک عشیرہ ہوتا ہے۔ ایک عشیرہ کے تمام ارکان ایک قوم اور کئی ہم قوم مل کر ایک قبیلہ بناتے

ہیں۔ ایک ہی خاندان کے تمام افراد آپس میں ایک دوسرے کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں اور ایک ہی حاکم اعلیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ حاکم عام طور پر خاندان کا معمر آدمی ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایک ہی نعرۂ جنگ ــ شعار ــ استعمال کرتے ہیں۔ قبیلہ واری نظام میں خونی رشتہ، چاہے وہ حقیقی ہو کہ فرضی (کیونکہ خاندانی رشتہ کسی بھی بچے کے کسی عورت کے دودھ کے چند قطرے پی لینے سے بھی قائم کرلیا جاتا ہے) ایک ایسا عنصر ہے جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ رکھتا ہے۔

خیمہ اور اس کا حقیر اثاثہ فرد کی ملکیت ہوتا ہے لیکن چراگاہ، پانی اور قابل کاشت زمین قبیلہ کی مشترک جائداد ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے عشیرے کے کسی آدمی کو قتل کردے تو قاتل کو کوئی پناہ نہیں دیتا۔ مفرور ہونے کی صورت میں وہ مجرم سمجھا جاتا ہے۔ اگر قتل کا ارتکاب عشیرے کے باہر ہوا ہو تو عشیرے پر اس قتل کا انتقام لینا فرض ہو جاتا ہے اور قاتل کے عشیرے کے کسی نہ کسی فرد کو اپنے خون سے اس خون کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

ریگستان کے قدیم دستور کی رو سے خون کا بدلہ خون ہی ہے اس کے لیے انتقام کے سوا اور کوئی سزا تسلیم نہیں کی جاتی۔ اس سزا کی تعمیل کرانے کی ذمہ داری مقتول کے قریب ترین رشتہ دار پر عائد ہوتی ہے۔ خون کا جھگڑا چالیس سال تک بھی جاری رہتا ہے۔ قبل اسلام کی تمام قبیلہ واری لڑائیوں میں وقائع نگار خون کے جھگڑوں ہی کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ اگرچہ پوشیدہ معاشی اسباب بھی ان لڑائیوں کے مہیج ہو سکتے ہیں۔

کسی بدوی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی کہ اسے اپنے قبیلہ سے خارج کردیا جائے۔ کیونکہ قبیلے سے نکالے ہوئے کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اس کی حیثیت ایک مجرم کی ہو جاتی ہے جو حمایت و حفاظت کی حدوں سے بھی خارج ہو جاتا ہے، قبیلہ واری اسپرٹ ــ عصبیت ــ افراد قبیلہ سے نا محدود اور غیر مشروط وفاداری

کی طالب ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کی شاونیت ( Shawvinism ) ہے قبیلہ کے ساتھ ایسی والہانہ وابستگی جو اصل میں بڑے پیمانہ پر رکن قبیلہ کی انفرادیت کا مظہر ہے، اس کا تصور یہ ہے کہ اس کا قبیلہ ایک خود مکتفی اور مطلق العنان وحدت ہے۔ اس کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے قبیلوں کو اپنی لوٹ مار اور ہلاکت آفرینیوں کا ہدف بنائے۔ اسلام نے اپنے فوجی مقاصد کے سلسلے میں قبیلہ واری نظام سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ اس نے اپنی فوجوں کو ان وحدتوں میں تقسیم کیا جو قبیلہ واری خطوط پر مبنی تھے۔ مسلمانوں نے نوآبادکاروں کو اپنی مقبوضہ زمین پر قبیلوں کی شکل میں بسایا اور مغلوب قوموں کے نومسلموں کو "موالی" کی حیثیت دی۔ عربوں کے نزدیک "مولیٰ" عموماً ایسا شخص مراد لیا جاتا ہے جو اپنی مرضی سے اپنی پسند کے کسی قبیلہ کا رکن بن جائے۔ عروجِ اسلام کے بعد عربوں کا جو کردار رہا اور ظاہر ہوا اُس میں سے بھی انفرادیت کی ان غیر سماجی خصوصیات اور قبیلہ واری عصبیت کو نکالا نہ جا سکا۔ اور بہت سی اسلامی ریاستوں کا شیرازہ بکھیرنے اور آخر کار ان کے تباہ کرنے میں ان ہی چیزوں نے فیصلہ کن عوامل کی حیثیت اختیار کر لی۔

قبیلے کی نمائندگی اس کا برائے نام صدر یعنی شیخ کرتا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں میں جس طرح شیخ کو دکھایا جاتا ہے اس کے برعکس شیخ قبیلہ کا ایک سن رسیدہ رکن ہوتا ہے۔ جب تک وہ صلاح و مشورہ، بھلائی، اچھائی شجاعت و مردانگی کے معاملوں میں احتیاط و فرزانگی سے کام لیتا ہے، اس کی قیادت برقرار رہتی ہے۔ لیکن عدالتی فوجی اور دوسرے مشترک مفاد والے کاموں میں شیخ مختار کل نہیں ہوتا۔ ان باتوں میں اس کو قبائلی مجلس سے مشورہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ قبائلی مجلس متعلقہ خاندانوں کے صدور پر مشتمل ہوتی ہے۔ قبیلہ کے شیخ کی قیادت کی مدت اس کا انتخاب کرنے والوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔

عام طور پر عرب اور خاص طور پر بدوی فطرتاً عمومیت پسند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے شیخ سے برابری سے ملتے ہیں۔ ان کا معاشرہ ہر قسم کے فرقِ مراتب سے بے نیاز ہوتا ہے۔ بیرونی

حاکموں کے سوا عرب کسی کے لیے مَلِک (بادشاہ) کا لقب استعمال نہیں کرتے۔ اس کے باوجود عرب جتنے عمومیت پسند ہیں اتنے ہی اشرافیت پسند بھی واقع ہوئے ہیں۔ ہر عرب اپنے آپ کو موجودات کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک عرب قوم دنیا کی تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے اونچے درجے والی ــ افخر الامم ــ اور عالی ظرف قوم ہے۔ بدوی کے اعلیٰ نقطۂ نظر سے متمدن انسان اطمینانِ قلب کے لحاظ سے کم مطمئن اور مرتبہ کے لحاظ سے بہت زیادہ گرا ہوا ہے۔ عرب اپنے بے میل خون، اپنی ثقافت، اپنی شاعری، اپنی تلوار، اپنے گھوڑے اور سب سے بڑھ کر اپنے اعلیٰ حسب و نسب پر بے انتہا فخر کرتا ہے۔ وہ انساب میں غیر معمولی تحقیق کا شیدائی ہوتا ہے اور اکثر اپنے سلسلۂ نسب کو حضرت آدم تک گِناتا ہے۔

بدوی عورت چاہے وہ زمانۂ اسلام کی ہو کہ قبل اسلام کی ایک مقررہ آزادی سے لطف اندوز ہوتی آئی ہے۔ اور اب بھی اس کا یہی حال ہے حالانکہ اس کی خانہ نشین حضری بہنیں ایسی آزادی سے محروم رہی ہیں۔ وہ پہلے ایک کثیر الازواج گھرانے میں یعنی نظام ازدواج کے تحت زندگی بسر کرتی تھی۔ اس نظام میں مرد کو آقا کی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم اس کو اپنے شوہر کے انتخاب میں آزادی حاصل تھی اور بدسلوکی کی صورت میں اس سے الگ ہو جانے کا حق حاصل تھا۔

عرب کے ان ابنائے بادیہ میں موقع ملنے پر دوسروں کی ثقافتوں کو اپنی ثقافت میں جذب کرنے کی بہت بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ صدیوں کی خوابیدہ ذہنی صلاحیتیں کسی مناسب محرک کے تحت آن واحد میں بیدار ہو کر اثر آفریں قوتوں کی صورت میں منظم ہو جاتی ہیں۔ عرب کی شاداب ہلال نما سرزمین عزائم اور مواقع کا ایک وسیع میدان پیش کرتی ہے۔ اسی ہلال نما سرزمین کی کیمیا اثر خاک سے بابل میں حمورابی، سینا میں موسیٰ، تدمر میں زنوبیا، روما میں فلپ عربی اور بغداد میں ہارون الرشید جیسی نامور ہستیاں اٹھی ہیں۔ اسی سرزمین میں رقیم (Petra) جیسی کئی یادگاریں ہیں جنہیں دیکھ کر

دنیا آج بھی عش عش کرتی ہے۔ ابتدائے اسلام کی نادر ترین اور تقریباً عدیم المثال سربلندیوں میں بدویوں کی ان خوابیدہ صلاحیتوں کا کچھ کم حصّہ نہ تھا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے الفاظ میں "الاعراب اصل العرب ومادۃ الاسلام" بدوی عرب کی اصل اور اسلام کا خام مسالہ ہیں۔

# ۳۔ طلوعِ اسلام سے کچھ پہلے

"جزیرہ" ہونے کے باوجود جزیرہ نمائے عرب اپنے آپ کو چشمِ عالم سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ تاریخ میں عربوں کے متعلق سب سے پہلا قطعی تذکرہ آشوری بادشاہ شلمنا سرسوم کے کتبے میں ملتا ہے۔ اس بادشاہ نے ۸۵۴ ق م میں شاہ دمشق اور اس کے حلیفوں کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تھی۔ شاہ دمشق کے ان حلیفوں میں عرب کا ایک شیخ بھی تھا۔ یہ مہم اس زمانے کے اہم واقعات میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ میں نے اس (شاہ دمشق) کے دار الحکومت قرقر کو پامال کر دیا۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ میں نے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس میں ہَدَدْ عَزَرارام (دمشق) کی بارہ ہزار رتھیں، بارہ ہزار شہسوار، اور بیس ہزار سپاہی .... اور عرب جُندُب کے ایک ہزار اونٹ بھی شامل تھے" یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ منظر تاریخ پر سب سے پہلا عرب بھی اونٹوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

یہاں تک ہم عرب کی اصطلاح، جغرافیائی محلِ وقوع کا لحاظ کیے بغیر جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندوں کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں لیکن اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے باشندوں اور شمالی عرب کے باشندوں میں (ان میں وسطی عرب کے نجدی بھی شامل ہیں) فرق کیا جائے۔ عرب کے دشوار گزار ریگستان نے اس ملک کو جغرافیائی حیثیت سے شمالی اور جنوبی دو خطوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں علاقوں کے باشندوں میں نسلی، ذہنی معاشی او معاشرتی اعتبار سے بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔

شمالی عرب کے باشندوں کے نسلی سلسلے بحیرۂ روم کی نسل سے ملتے ہیں۔ اور جنوبی عرب کے باشندوں کے نسلی سلسلے آلپسی نسل سے ملتے ہیں۔ اس نسل کی نمایاں مثالیں ارمنی حتی یا

عبری ہیں۔ چوڑے جبڑے، ستواں ناک، چپٹے رخسار اور گھنے بال ان لوگوں کے امتیازی خدو خال ہیں۔ سب سے پہلے جنوبی عرب کے عربوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور اپنے ایک الگ تمدن کی داغ بیل ڈالی، اور اس کو پروان چڑھایا۔ لیکن شمالی عرب کے لوگ قرون وسطیٰ میں ظہور اسلام تک بین قومی زندگی کے اسٹیج پر نہیں آئے۔ عرب کے ان دونوں علاقوں کے باشندوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے باہمی اختلاف کی خلیج کبھی پاٹی نہ جاسکی حالانکہ اسلام نے عرب قوم کو بظاہر متحد کر دیا تھا۔ بعد میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب مملکت کو کمزور بنانے میں اس اختلافی خلیج کے اثرات نے بہت بڑا حصہ لیا۔

جزیرہ نمائے عرب ثقافت کے دو قدیم مرکزوں یعنی مصر اور بابل کے درمیان ایک بڑے پچر کی طرح گھسا چلا گیا ہے۔ وہ اپنے دامنِ زندگی کو ان دونوں ملکوں کی تہذیبی اثرات سے پاک نہ رکھ سکا۔ افریقہ عرب کے دامن کو شمال میں جزیرہ نمائے سینا (جہاں طور سینا واقع ہے) کے پاس چھوتا ہے، یہاں سے ایک بری راستہ نکلتا تھا۔ دوسرا اہم راستہ دریائے نیل کے ساتھ ہوتا ہوا تھیبس کے قریب بحیرۂ احمر کی طرف مڑ گیا تھا۔ مصر کے بارہویں خاندان کے زمانے میں، یعنی حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے، ایک نہر۔ نہر سویز کی پیشرو۔ دریائے نیل کے مشرقی حصے کو بحیرۂ احمر کے شمالی حصہ سے ملاتی تھی۔ شاہانِ بطلیموس نے اور بعد میں خلفائے اسلام نے اس نہر کو از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ ۱۴۹۷ء تک یہ نہر استعمال ہوتی رہی اور اس کے بعد اُسے ترک کر دیا گیا کیونکہ اسی سال راسِ امید کے اطراف سے ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچنے کا بحری راستہ معلوم ہو گیا۔ جنوب میں صرف پندرہ میل چوڑا سمندر جزیرۂ نمائے عرب کو افریقہ سے جدا کرتا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں کوئی فوجی تنظیم موجود نہیں تھی۔ قبل اسلام کی تاریخ میں عرب تاجروں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ جنوب میں ان کا ایک شاندار ساحلی تمدن تھا۔ اور

اسی تمدن نے ہندوستان سے افریقیہ کا رشتہ جوڑ دیا تھا۔ اِسی تمدن کی بدولت شمال میں رقیم (پیٹرا) اور تدمر (پالمیرا) نامی دو شہروں کو تجارتی شاہراہوں پر اوجِ کمال نصیب ہوا تھا۔ یہ دونوں شہر اگرچہ مرورِ زمانہ کے ساتھ تباہ و برباد ہو گئے لیکن آج بھی اِن کے کھنڈروں سے تاریخی جاہ و جلال ٹپکتا ہے۔ شہر رقیم (پیٹرا) ایک ٹھوس چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اور رومیوں کی سرپرستی میں اس شہر کی دولت اور شان و شوکت، اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ شہر تدمر (پالمیرا) صحرائے شام میں رومی اور اشکانی دو حریف شہنشاہیتوں کے درمیان واقع تھا۔ اس شہر پر ایک عورت نے بھی حکومت کی ہے۔ اس کا نام زنوبیا تھا۔ یہ بڑی حسین اور نہایت ہی اولوالعزم ملکہ تھی۔ اس کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ایشیائے کوچک کے ایک بڑے علاقہ پر بھی قابض ہو گئی تھی لیکن پھر قسمت نے یکایک پلٹا کھایا۔ سنہ ۲۷۲ء میں اس کے سرداروں کو شہنشاہ اورلیان کے مقابلہ میں شکست اُٹھانی پڑی تو زنوبیا تدمر سے ایک صبا رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر ریگستان میں فرار ہو گئی۔ مگر روما کے دستِ دراز نے آخر اس کو پکڑ ہی لیا۔ اور جب شہنشاہ اورلیان شہر رومہ میں فاتحانہ داخل ہوا تو زمانہ کے رواج کے مطابق اس شکست خوردہ ملکہ کی اس طرح پذیرائی کی گئی کہ وہ سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی فاتح کی رتھ کے آگے چل رہی تھی۔

عرب کی تاریخ کا ایک اور واقعہ ہے جو بظاہر ایسا اہم نہیں معلوم ہوتا لیکن اس واقعہ میں بڑے گہرے معنی پنہاں ہیں۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۲۵ق م میں بنی اسرائیل کے مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دیار سینا و نفود میں چالیس سالہ قیام کے دوران سینا کے جنوبی حصے مدیان میں میثاق بنی اسرائیل عمل میں آیا۔ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ نے وہاں ایک عرب نژاد عورت سے شادی کر لی۔ یہ عورت وہاں کے ایک کاہن کی بیٹی تھی۔ اس رشتۂ ازدواج نے تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ پیش کیا۔ حضرت موسیٰ کی بیوی، یاہو نامی دیوتا کی پرستش کرتی تھی۔ اس دیوتا کا نام یہوہ یا یہود اپڑ گیا۔ یہ ایک ریگستانی دیوتا تھا، سامی

اور تند! اس کا مسکن ایک خیمہ تھا اور اس کی عبادت کی رسمیں بہت ہی سادہ تھیں۔ اور زیادہ تر ریگستانی ضیافتوں، قربانیوں اور بھنے ہوئے چوپایوں کے چڑھاووں پر مشتمل تھیں۔ مدیان کے کاہن کی بیٹی نے حضرت موسیٰ کو اپنے دین کے اصول بتلائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد کیسے حیرت انگیز واقعات رونما ہونے والے تھے۔

عبرانیوں کے اصلاً ریگستانی ہونے کے بیانات سے عہد نامۂ عتیق بھرا پڑا ہے۔ بہت ممکن ہے ارمیا کے 'ملوک' شمالی عرب اور صحرائے شام کے شیخ ہی ہوں۔ حضرت سلیمان سے جو گیت منسوب کیا جاتا ہے اس نے دوشیزۂ شوملیت کے نام کو لازوال زندگی بخشی ہے۔ اس دوشیزہ کا تعلق غالباً عرب ہی کے ایک قبیلے بنو قیدار سے تھا۔ حضرت ایوب جو قدیم سامی شاعری کے شہ پاروں کے مصنف سمجھے جاتے ہیں نسلاً عبرانی نہیں بلکہ عرب ہی تھے۔ وہ 'دانشمندان مشرق' جو ستارے کے پیچھے یروشلم پہنچے تھے، شاید موبدان عجم نہیں بلکہ شمالی عرب کے بدوی تھے۔ اناجیل کے حوالوں کی یہ فہرست اتنی طویل ہو سکتی ہے کہ اس کی کوئی حد نہ ہوگی مختصر یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے یہود عربوں کے قریب ترین ہمسایے اور نسلی اعتبار سے قریب ترین رشتہ دار ہیں۔

مگر یہاں ہمارا تعلق خاص طور پر اسلام کے ظہور سے ہے ۔۔ اسلام جو اللہ کی مشیت اور اس کے ارادے کے سامنے اپنا سر جھکا دینے کا دین ہے۔ یہ ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ جنوبی عرب میں جس قومی زندگی کو عروج حاصل ہوا تھا، اس کا شیرازہ ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا ہی میں بالکل بکھر چکا تھا۔ وہاں افراتفری اور نراج کا دور دورہ تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کے طول و عرض میں عربوں کا دیرینہ شرک (بدویوں کا شرک زیادہ تر چاند کی پرستش کا شرک تھا۔ عام طور پر گرم ملکوں میں گلہ بانی کی زندگی بسر کرنے والی قوموں کا یہی حال ہے۔ رات کی خنکی کو وہ اپنا دوست اور دن کے سورج کو وہ اپنا دشمن پاتے ہیں) ایک ایسے نقطہ پر پہنچ گیا تھا جہاں وہ اپنے پرستاروں کی روحانی مطالبات کی تکمیل سے قاصر تھا۔ وحدانیت کے متعلق

مبہم تصوّرات پیدا ہو چلے تھے۔ اور ان عقائد کا حامل ایک فرقہ بھی نمودار ہو چکا تھا۔ نصرانیت کے اثرات دن پر دن بڑھتے جا رہے تھے۔ اگرچہ مسیحی عقائد کو عرب تصورات پر قبضہ پانے میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی، تاہم منزلِ متعین کی جا چکی تھی، اور ایک عظیم الشان دینی اور قومی رہنما کے ظہور کا وقت آ پہنچا تھا۔

ظہورِ محمدیؐ سے پہلے کے زمانے کو مسلمان "جاہلیت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس اصطلاح کے معنی عموماً "جہالت" اور "بربریت" کے لیے جاتے ہیں۔ گو شمالی عربوں نے حضرت محمدؐ کے زمانے تک تحریر کا کوئی نظام پیش نہیں کیا تھا، تاہم "بربریت" جیسی سخت اصطلاح کا اطلاق ایسے معاشرے پر تو نہ ہونا چاہیے جیسا معاشرہ جنوب میں پھلا پھولا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملکِ عرب میں کوئی مذہبی دستور نہ تھا، کوئی صاحبِ وحی پیغمبر نہ تھا، کوئی الہامی کتاب نہ تھی۔

عربوں کے یہاں ادبی اسلوبِ بیان کی جو والہانہ قدر و منزلت پائی جاتی ہے ایسی دنیا کی کسی قوم میں نظر نہیں آتی اور نہ دنیا کی کسی قوم کا دل و دماغ قوتِ الفاظ سے چاہے وہ تحریری ہوں کہ تقریری، عربوں کے دل و دماغ کی طرح اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ عربی میں اپنے بولنے والوں کی ذہنی قوتوں پر جتنی شدت کے ساتھ اثر انداز ہونے کی خصوصیت پائی جاتی ہے، ایسی خصوصیت دنیا کی کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔ بغداد، دمشق اور قاہرہ کے موجودہ سامعین کے سامنے عربی نظم پڑھی جائے تو اس کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی وہ اس پر وجد کرنے لگتے ہیں اور قدیم ادبی عربی میں ادا ہونے والی تقریروں کو کم ہی سمجھے بغیر جوش میں آ جاتے ہیں۔ قافیے، اوزان اور ترنم ان کے دل و دماغ پر وہ اثر کرتے ہیں جسے وہ "سحرِ حلال" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان مثالی سامیوں یعنی عربوں نے اپنا کوئی خاص آرٹ ایجاد کیا اور نہ کسی آرٹ کو انھوں نے فروغ دیا۔ ان کے جمالیاتی ذوق کو صرف ایک ہی فن یعنی خطابت میں ظاہر ہونے

کا موقع ملا۔ اگر یونانی اپنے مجسموں اور عمارتوں کے ذریعہ چمکے تو عربوں نے قصیدوں کے ذریعہ اور یہودیوں نے مناجات کے ذریعہ اپنے جذبات کے اظہار کا ایک لطیف طرز ایجاد کیا۔ ایک قدیم عربی ضرب المثل ہے "جمال المرء فی فصاحۃ لسانہ" انسان کا حسن اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ بعد کی ایک کہاوت ہے "فضل اللہ اہل الصین فی الصناعات، والیونانیون فی الحکم والادب والعرب فی اللسان" فضیلت بخشی ہے اللہ نے چینیوں کو مصنوعات میں، یونانیوں کو ادب اور حکمت میں اور عربوں کو خطابت لسانی میں۔ عہد جاہلیت میں فصاحت (نظم و نثر میں زور اور نفاست کے ساتھ اظہار خیال کی صلاحیت) تیر اندازی اور شہسواری مہذب انسان کے تین بنیادی لوازم سمجھے جاتے تھے۔ عربی زبان اپنی نادر ترکیبوں کی بدولت ایک جامع اور لطیف طرز خطابت کے سانچے میں بڑی خوبی کے ساتھ ڈھل جاتی ہے۔ اسلام نے عربی زبان کی اس امتیازی خصوصیت اور عربوں کی نفسیاتی ندرت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوب بیان اور اس کے الفاظ کی بندش کے اسی 'اعجاز' کو مسلمان اپنے دین کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اسلام کی فتح ایک حد تک ایک زبان کی اور خاص کر ایک کتاب کی فتح تھی۔

صرف شاعری کا میدان ہی ایسا تھا جس میں قبل اسلام عرب کا کوئی حریف نہ تھا۔ بدویوں کا ایک ہی ثقافتی اثاثہ تھا۔ اور وہ ان کا شاعرانہ ذوق تھا۔

جوں جوں شاعری کو فروغ ہوتا گیا، شاعر معاشرے کے گوناگوں مشاغل میں حصہ لینے لگا۔ میدان کارزار میں اس کی زبان اس قوم کی بہادری کی طرح اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ امن کے زمانے میں وہ اپنے آتش بار اشعار کی بدولت نظم عام کے لیے خطرہ بن سکتا تھا اس کا قصیدہ قبیلہ کو آمادۂ عمل کرنے کے لیے ایسا ہی ابھارا کرتا تھا جیسے آج کل سیاسی مجانی پر فتنہ انگیز مقرر کی تقریریں عوام کو ابھارتی ہیں۔ اپنے زمانے کے صحافتی نمائندہ یعنی جرنلسٹ

کی حیثیت سے اس کی حمایت وعنایت بیش بہا تحفوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں۔ اس کے قصیدے لوگ زبانی یاد کرلیتے اور ایک دوسرے سے اس کی روایت کرتے رہتے تھے۔ اس طرح یہ قصیدے تشہیر کا ایک انمول ذریعہ ہوتے تھے۔ شاعر بیک وقت رائے عامہ کا نمائندہ اور اس کا بنانے والا ہوتا تھا۔ قطع اللسان، یعنی زبان کاٹ دینے کی قدیم اصطلاح شاعر کا منہ بند کرنے اور اس طرح اس کی ہجو سے بچنے کے لیے استعمال کیجاتی تھی۔

شاعر اپنی جماعت کا مشیر، رہبر، خطیب اور نقیب ہونے کے ساتھ مورخ اور ضرورت کے وقت سائنس داں بھی ہوتا تھا۔ بدوی ذکاوت وذہانت کو شاعری کی میزان میں تولتے تھے۔ چنانچہ عرب قدیم کا ایک شاعر کہتا ہے:

مَنْ یفاخرنی من بینا فرنی بینی عامر بن صعصعہ

فرسانًا و شعراء و عددًا و فعالًا ؟!

"شعراء، اشعار، اور شہ سواروں کے لحاظ سے جو بڑائی عامر بن صعصعہ کے قبیلے کو حاصل ہے۔ کون ہے جو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی جسارت کرسکتا ہے"

فوجی قوت فہم و ذکا، اور تعداد یہی تین عناصر تھے جن پر عرب قدیم کے کسی قبیلے کی عظمت و اقتدار کی بنیادیں استوار ہوتی تھیں۔

قدیم شاعری میں اسلوب بیان اور سلاست کے سوا تاریخی قدر بھی ہوتی ہے جس عہد میں یہ شاعری وجود میں آئی ہے اس عہد کے مطالعے کے لیے یہ ایک مادی ماخذ کا کام دیتی ہے اور حقیقت میں ہمارے پاس قدیم شاعری ہی ایک ایسی مشعل ہے جس سے زمانۂ قبل اسلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی لیے یہ کہاوت مشہور ہے کہ "الشعر دیوان العرب" عربی شعر عرب کی تاریخ ہے

شاعری کی روشنی میں اگر بت پرست بدویوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو حضرت محمد سے پہلے کفر و شرک کے سوا ان کا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ قبیلوں کی کورانہ روایت پرستی نے آزاد

فکر و عمل کی تمام قوتوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیے تھے۔ بدوی اسی راستے پر چل رہا تھا جس پر اس کا سارے کا سارا قبیلہ گامزن تھا، اور جس کی آخری منزل قبائلی جمود تھا۔ ہمیں ایسی کوئی واضح شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس زمانے کے بدوی سچے دل سے کسی دیوتا ہی کی پرستش کرتے ہوں۔ ان لوگوں نے سارے ریگستان کو بہیمانہ فطرت کی ذی حیات مخلوق سے معمور کر رکھا تھا جس کو یہ جن یا عفریت کہتے تھے۔ اجنہ اپنی فطرت کے لحاظ سے دیوتاؤں سے اتنے مختلف ہیں جتنے کہ یہ انسانوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے دیوتا دوست دار اور مائل بہ کرم ہوتے ہیں۔ لیکن جن کینہ پرور اور مائل بہ عناد ہوتے ہیں ـــ جن ریگستان کی وحشیانہ زندگی، ریگستانی زندگی کی شکلوں اور اس کی بے بنیاد دہشتوں کے گویا مجسمے ہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی جنوں کا تصور دماغوں سے نہ نکل سکا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جنوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا کیونکہ معبودانِ باطل نے اپنے زوال کے بعد ان ہی جنوں کا روپ اختیار کیا تھا۔

لیکن ارضِ حجاز (حجاز کا یہ بنجر علاقہ نجد کے بالائی علاقے اور زیریں ساحلی علاقوں کے درمیان ایک قدرتی حد فاصل کی طرح پھیلا ہوا ہے) کے شہر مکہ میں ان معبودوں کے سوا ایک ایسا معبود بھی تھا جس کا نام "اللہ" تھا۔ یہ ایک پرانا نام تھا۔ مکہ کے رہنے والے اللہ کو خالق اور رازق حقیقی سمجھتے تھے اور شدید خطروں میں اسی سے مدد کے لیے طالب ہوتے تھے۔ بہت جلد اسی شہر مکہ کی ایک گرامی ہستی کی زبان رشد و ہدایت سے عربی زبان کا وہ عظیم ترین اور وہ گرج دار اور چونکا دینے والا نعرہ فضا میں بلند ہونے والا تھا جس کے بے پناہ سیلاب میں عرب کے دنیا ناآشنا بدوی دنیائے معلوم کے آخری کناروں تک بہتے چلے جانے والے تھے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!!

# اللہ کے رسول محمدؐ

## (صلی اللہ علیہ وسلم)

۵۷۱ء یا اس کے لگ بھگ مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ قریش کا یہ قبیلہ شہر کے معبد کعبہ کا متولی تھا جس میں بے شمار بت تھے، اور یہ معبد گرد و نواح کے زائرین کا مرجع تھا۔ بچے کی ماں نے اپنے بچے کا کیا نام رکھا تھا، اس کی آج تک کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی۔ اس قبیلے کے لوگ اس بچے کو "امین" پکارا کرتے تھے جو بظاہر ایک اعزازی لقب تھا۔ قرآن میں اس بچے کا نام "محمد" اور ایک جگہ "احمد" آیا ہے۔ یہ نام جس کے معنی "بہت تعریف کیا ہوا" کے ہیں۔ وہ نام ہے جس پر دنیا کے اتنے لڑکوں کے نام رکھے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس بچے کے والد نے اس کی ولادت سے پہلے ہی وفات پائی، اور جب وہ چھ سال کا ہوا تو ماں بھی گزر گئیں۔

اگرچہ حضرت محمدؐ عالمی پیغمبروں میں اکیلے ایک ایسے پیغمبر ہیں جنہوں نے تاریخ کی پوری روشنی میں ولادت پائی ہے، لیکن آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت ہی کم ملتے ہیں حصول معیشت کے لیے آپ کی جد و جہد، تکمیل ذات کے لیے آپ کی مساعی اور آئندہ آپ کو جو کارِ عظیم انجام دینا تھا اس کے متعلق تدریجی احساس اور تصور، غرض ان تمام باتوں کے متعلق ہمیں بہت کم قابل اعتماد معلومات حاصل ہیں پچیس سال کی عمر میں آپ نے مکہ کی ایک مالدار قریشی بی بی سے نکاح کیا جس کا نام خدیجہ تھا۔ یہ عالی ظرف بی بی عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی اور ایک فارغ البال تاجر کی بیوہ تھیں۔ اس رشتۂ ازدواج کے ساتھ ہی حضرت محمد واضح تاریخی دور میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ بی بی خدیجہ آزادانہ طور پر تجارتی کاروبار کیا کرتی تھیں اور اسی کاروبار کے ضمن میں آپ نے حضرت محمدؐ کی خدمات حاصل کی تھیں

جب تک یہ شریف اور عالی کردار بی بی بقید حیات رہیں، حضرت محمدؐ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں فرمایا۔

اس رشتۂ ازدواج سے حضرت محمدؐ کو فکر معیشت سے ایک گونہ چھٹکارا مل گیا اور آپ اپنے تصورات وتخیلات میں زیادہ مستغرق رہنے لگے۔ اس زمانہ میں آپ کا زیادہ وقت مکّہ کے باہر ایک پہاڑ کے چھوٹے سے غار میں مراقبہ اور یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔ حق وصداقت کی اسی جستجو کے دوران میں ایک دن آپ نے ایک آواز سُنی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا: "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا (قرآن۔ علق ۹۶: ۱) یہ پہلی وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ رب العزت کی بارگاہ سے آپ کو نبوت عطا کی گئی۔ منصب نبوت عطا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد آپ پر دوسری وحی نازل ہوئی۔ آپ خوف ودہشت کی حالت میں جلد جلد گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی سے کچھ اُڑھانے کے لیے فرمایا۔ اس پر یہ وحی نازل ہوئی۔ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ "اے کپڑے میں لپٹنے والے اُٹھ، پھر ڈرا سے (قرآن مدثر: ۱) یہ غیبی آوازیں مختلف قسم کی ہوتی تھیں۔ کبھی یہ ایسی ہوتی تھیں جیسے گھنٹی بج رہی ہو۔ لیکن بعد میں صرف ایک ہی قسم کی آواز آنے لگی اور اس کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ خدا کے فرشتے جبرئیل کی آواز تھی۔

محمدؐ عربی کا پیغام توراۃ کے عبرانی پیغمبروں کے پیغام سے مشابہ تھا۔ خدا ایک ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ خالق کائنات ہے۔ قیامت کا ایک دن آنے والا ہے۔ جو لوگ احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں وہ جنت میں بے حساب انعاموں سے سرفراز ہونگے۔ جو لوگ ان احکام کی تعمیل سے سرتابی کرتے ہیں وہ دوزخ کی دردناک اذیتوں اور عذابوں میں جھونکے جائینگے۔

مبعوث ہونے کے بعد حضرت محمدؐ نے سب سے پہلے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو اسلام کا پیغام سُنا کر انہیں پند ونصیحت کے ذریعہ رشد وہدایت کی طرف بلانا شروع کیا۔ وہ آپ کا مذاق اُڑاتے اور آپ کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دینا چاہتے تھے۔ آپ لوگوں کو جنت کی

بشارتیں دیتے اور دوزخ کے عذابوں سے ڈراتے تھے۔ اور اپنے سُننے والوں کو روزِ قیامت کے سر پر پہنچ جانے کا خوف بھی دلایا کرتے تھے۔ لیکن ابتدائی وحی جتنی موثر اور مختصر تھی اتنے ہی کم لوگ اسلام قبول کر رہے تھے۔ آپ کی بیوی خدیجہؓ، آپ کے چچا زاد بھائی علیؓ اور ایک رشتہ دار ابو بکرؓ نے آپ کی رسالت کو تسلیم کیا۔ اور آپ پر ایمان لے آئے۔ مگر قریش کے بااثر اور صاحب امارت لوگ آپ کے راستہ میں پہاڑ بنے کھڑے رہے۔ تاہم آہستہ آہستہ اور لوگ بھی ایمان لانے لگے اور مسلمانوں کی صفیں بڑھنے لگیں۔ سابقین اولین کا تعلق زیادہ تر غلاموں اور غریبوں کے طبقے سے تھا۔ اہل قریش نے جب یہ دیکھا کہ اسلام سے ان کی کھلی مخالفت، اس کی بُرائی اور ہنسی اُڑانے کے باوجود وہ اسلام کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے تو اُنھوں نے اسلام اور داعیِ اسلام کو مؤثر طور پر نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے گیارہ گھرانوں کو جو اسلام لا چکے تھے مجبوراً حبش کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ اور ۶۱۵ء میں تراسی مسلمانوں نے ہجرت کی۔ ان مہاجروں کو نصرانی نجاشی کی سلطنت (حبش) میں پناہ ملی۔ نجاشی نے ان لوگوں کو مکہ کے ظالموں کے حوالے کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ قریش کی زیادتیوں اور ایذا رسانیوں کے ان تاریک دنوں میں اتنے مسلمانوں کے شہر مکہ سے باہر چلے جانے سے حضرت محمدؐ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے بلکہ آپ پہلے سے بھی زیادہ دلیری اور بیباکی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کرنے اور لوگوں کو بت پرستی سے منع کرنے اور اُنھیں ایک اور حقیقی معبود اللہ کی عبادت کی طرف بلانے لگے۔ وحی برابر نازل ہو رہی تھی۔ وہ جو کسی وقت یہودیوں اور نصرانیوں کو اہل کتاب دیکھ کر حیرت کرتا تھا، اب خود اس کی قوم بھی ایک دن صاحب کتاب ہونے والی تھی۔

اس کے بعد ہی عمر بن الخطاب طاعتِ الٰہی کے پیمان میں باندھے گئے۔ ان کی قسمت میں اسلامی مملکت کے قیام میں نمایاں حصہ لینے کی سعادت مقدر کی جا چکی تھی۔ اسی زمانے میں معراج کا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ رسول اللہ آن واحد میں بیت اللہ سے بیت المقدس پہنچے اور وہاں سے ساتویں آسمان پر تشریف لے گئے۔ چونکہ بیت المقدس نے اس یادگار سفر کی ایک ارضی منزل کا کام دیا تھا اس لیے یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح مسلمانوں کے لیے بھی یہ شہر مقدس قرار دیا گیا۔ اور آج بھی مکہ اور مدینہ کے بعد بیت المقدس اسلام کا تیسرا مقدس مقام ہے۔ بعد میں معراج کے واقعہ سے متعلق بہت ہی روایتیں گھڑلی گئی ہیں۔ اور آج بھی ترکستان اور ایران کے صوفی حلقوں میں یہ واقعہ بڑے اشتیاق سے سُنا اور بیان کیا جاتا ہے۔ ایک اسپینی عالم نے اس واقعہ کو دانتے کے طربیہ خداوندی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ معراج کا واقعہ اب بھی اسلام میں ایک زندہ اور متحرک قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں فلسطین کا خطرناک فساد اس حقیقت کو خوب واضح کرتا ہے۔ یہ فساد بیت المقدس میں یہودیوں کی "دیوار گریہ" سے متعلق تھا۔ اس دیوار کے متعلق مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ وہ مرکب پرّاں (بُراق) جس کا چہرہ عورت کا اور دُم مور کی تھی اور جس پر سوار ہو کر رسول اللہ آسمان پر گئے تھے، اسی مقام سے روانہ ہوا تھا۔

معراج کے واقعہ کے دو سال بعد تہتر آدمیوں کے ایک وفد نے حضرت محمدؐ کو مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ مدینہ میں یہودی ایک مسیحا کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس مسیحا کی پذیرائی کے لیے اُنھوں نے اپنے مشرک ہموطنوں کو ہموار کر لیا تھا۔ حضرت محمدؐ نے دو سو مسلمانوں کو قریش کی نظر بچا کر خاموشی کے ساتھ اپنی والدہ کے شہر، مدینہ چلے جانے کی اجازت دی۔ اس کے بعد آپ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اور ۲۴۔ اگست سنہ ۶۲۲ء کو آپ مدینہ پہنچ گئے۔ یہ شہرہ آفاق ہجرت جس کو محض فرار کا مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا، نقل مکان کا ایک ایسا منصوبہ تھا جس پر تقریباً دو سال سے بڑی احتیاط کے ساتھ غور کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے سترہ سال بعد خلیفہ عمرؓ نے تقویم ہلالی (آغاز ۱۶۔ جولائی) کی بنیاد رکھی جس میں ہجرت کو اسلامی عہد کے سرکاری نقطۂ آغاز کی حیثیت دی گئی ہے۔

ہجرت نبوی سے مکی دور ختم اور مدنی دور شروع ہوتا ہے۔ یہ واقعہ حضرت محمدؐ کی زندگی

میں ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہوا۔ آپ نے اپنے مولد مکہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے خیرباد کہا جس کی لوگوں نے کوئی قدر نہ پہچانی اور اپنے وطن ثانی مدینہ میں ایک ایسے سردار کی حیثیت سے داخل ہوئے جسے لوگوں نے اپنے سر آنکھوں پر لیا۔ یہاں سے آپ کی ریاضت کا دور پس منظر میں چلا جاتا ہے اور منصب نبوت میں عملی سیاست اپنے جوہر دکھلانے لگتی ہے

مدینہ پہنچ کر حضرت محمدؐ نے مدینہ کے مسلمانوں (یہ انصار کہلائے) اور مہاجروں کے درمیان بھائی چارہ ۔ اخوۃ ۔ قائم کیا۔ مدینہ کے انصار اپنے دینی بھائیوں کے لیے زندگی کا اسباب مہیا کرنے کے بارے میں پریشان تھے۔ اتنے میں خبر لگی کہ ایک قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے حضرت محمدؐ کی قیادت میں اس قافلہ کو روک لیا۔ اس سے شہر مکہ کی تجارتی زندگی کے سب سے زیادہ طاقتور بازو پر مسلمانوں کا نہایت ہی کامیاب وار پڑا۔ قافلے کے سردار کو مسلمانوں کے عزم وارادے کا حال پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے مکہ کی طرف آدمی دوڑائے۔ مکہ سے بہت جلد کمک پہنچ گئی اور مسلمانوں کے ساتھ مکہ والوں کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں رسول اللہ کی فیض اثر قیادت کی بدولت تین سو مسلمانوں کو ایک ہزار مکہ والوں پر پوری پوری فتح حاصل ہوئی۔ فوجی اعتبار سے یہ لڑائی کتنی ہی غیر اہم سہی، تاہم اسی نے حضرت محمدؐ کی دنیوی طاقت کی بنیاد رکھ دی اسلام نے اپنی سب سے پہلی اور فیصلہ کن فوجی فتح حاصل کر لی اور اس فتح کی تعبیر اس طرح کی گئی کہ دین اسلام کو بارگاہ رب العزت سے تائید کا شرف عطا کیا گیا۔

نظم وضبط کی اسپرٹ اور موت کے خوف سے ناآشنائی کا جو مظاہرہ اسلام کی اس اولین مسلح لڑائی میں ہوا ہے وہ بعد کی اس سے بڑی فتوحات میں ایک امتیازی خصوصیت ثابت ہوا۔ یہ سچ ہے کہ دوسرے ہی سال مکہ والوں نے اپنی شکست کا انتقام لے لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے رسول خدا کو زخمی بھی کر دیا۔ لیکن ان کی یہ کامیابی کچھ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ اسلام پھر سنبھلا، اور اس نے بتدریج مدافعانہ نوعیت سے جارحانہ حیثیت اختیار کر لی۔ اور

اب اس کی اشاعت اوراس کی ترقی یقینی ہو چکی تھی ۔اس وقت تک اسلام کی حیثیت ریاست کے اندر ایک دین کی سی تھی ۔ مدینہ میں اس کی حیثیت سرکاری دین سے بھی بڑھ گئی تھی ۔ اب اسلام خود ریاست بن گیا تھا ۔بس اسی وقت سے اسلام نے ایک حربی نظام سیاست کی حیثیت اختیار کی ۔اوراس کی یہی حیثیت دنیا نے ہمیشہ تسلیم کی ہے ۔

اس کے بعد رسول اللہ نے ان یہودیوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جنہوں نے دشمنوں کی طرف داری کی تھی ۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے کے پانچ سو سے زیادہ جسیم آدمی مارے گئے اور باقی مدینہ سے نکال دیے گئے ۔ان کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں اور انہیں نخلستانوں میں بسایا گیا ۔یہودیوں کا یہی وہ سب سے پہلا دشمن اسلام قبیلہ تھا جس کو جلاوطنی اور موت کی دو متبادل صورتیں پیش کی گئی تھیں ۔

اسی مدنی دور میں اسلام کو ایک مخصوص عربی یا قومی مزاج عطا ہوا ۔رسول اللہ نے یہودیت اور نصرانیت دونوں سے اپنے تعلقات منقطع کرلیے ۔سبت کا بدل جمعہ کا دن مقرر کیا گیا ۔ناقوس اور گھنٹوں کی جگہ اونچے مینار سے اذان دینے کا حکم دیا گیا ۔رمضان روزے رکھنے کا مہینہ قرار دیا گیا ۔نماز کے لیے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی سمت اختیار کی گئی ۔ حج کعبہ اور حجر اسود کو بوسہ دینے کے — اور یہ زمانہ قبل اسلام کا عقیدہ ہے — احکام صادر ہوئے ۔

سنہ ۶۲۸ء میں حضرت محمدؐ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ اپنے مولد مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں وہ معاہدہ — صلح حدیبیہ — طے فرمایا جس کی رو سے اہل مکہ اور مسلمانوں کو مساوی حقوق عطا کیے گئے ۔اس معاہدہ نے عملاً حضرت محمدؐ اور آپ کے قبیلے والوں یعنی اہل قریش کے آپس کے جھگڑے کا خاتمہ کردیا ۔قریش کے اور لوگوں میں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص نے اسی سال اسلام قبول کیا ۔اور یہ دونوں آگے چل کر عساکر اسلام کی طاقتور شمشیریں بننے والے تھے ۔ دو سال بعد جنوری سنہ ۶۳۰ء کے ختم پر (۸ سنہ ہجری) مکہ پوری طرح فتح ہو گیا ۔حضرت

محمدؐ شہر کے سب سے بڑے حرم میں داخل ہوئے اور آپ نے یہاں کے تمام بت توڑ ڈالے۔ ان بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ بیان کی جاتی ہے۔ آپ "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" (حق آیا اور باطل چلا گیا (قرآن بنی اسرائیل ۱۵) فرماتے جاتے تھے، اور بتوں کو توڑتے جاتے تھے لیکن خود شہر کے لوگوں کے ساتھ آپ نے بڑی فراخ دلی برتی۔ مفتوحہ شہر میں اس شان سے کسی فاتح کے داخل ہونے کی مثال اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

غالباً اسی زمانہ میں حضرت محمدؐ نے کعبہ کے اطراف کی زمین ۔ حطیم ۔ کو مقدس اور حرمت والی قرار دیا۔ اور قرآن کی ایک سورت بھی نازل ہوئی جس کی بعد میں یہ تفسیر کی گئی کہ اس سورۃ میں تمام غیر مسلموں کو حرم کعبہ میں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ اس آیت کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ حج کے موقعوں پر بت پرستوں اور مشرکوں کو کعبہ کے قریب آنے سے روکا جائے۔ لیکن جو تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے اس پر اب بھی عمل ہوتا ہے۔ جن نصرانی فرنگیوں کو ان دو مقدس شہروں کے دیکھنے اور اپنی جان سلامت لے جانے میں کامیابی ہوئی ہے ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ پہلا نصرانی فرنگی بولگنا واقع اطالیہ کا ورتھما تھا جس نے ۱۵۰۳ء میں مکہ اور مدینہ کی سیر کی اور آخری شخص ایک انگریز ایلڈن رٹر تھا۔ ان تمام سیاحوں کی داستانوں میں سر رچرڈ برٹن کی داستان سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

۹ سنہ ہجری میں حضرت محمدؐ نے العقبہ کے نصرانی سردار اور ان یہودی قبیلوں سے معاہدے طے فرمائے جو جنوب میں مقنا، اذرح اور جربی کے نخلستانوں میں آباد تھے مقامی یہودیوں اور نصرانیوں کو اس شرط کے ساتھ نوعمر ملت اسلامیہ کی پناہ میں لیا گیا کہ وہ ایک مقررہ محصول ۔ جزیہ ۔ ادا کریں۔ جزیہ میں زمینی اور شخصی دونوں محصول شامل تھے۔ اس طرز عمل نے ایک ایسی مثال قائم کر دی جو اپنے آئندہ نتائج کے اعتبار سے بڑی دور رس ثابت ہوئی۔

ہجرت کا نواں سال (۶۳۰ء۔۶۳۱ء) "عام الوفود" یعنی وفدوں کا سال کہلاتا ہے۔ اس

سال کے دوران میں وفد پر وفد اسلامی مملکت کے صدر رسول خدا کے سامنے اظہار اطاعت کے لیے آتے گئے۔ عقیدے سے قطع نظر عرب قبیلوں کو اپنی سلامتی اور اپنی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ تمام عرب قبیلے آپس میں متحد ہو جائیں۔ اور اسلام زبانی ایمان کے اظہار اور زکوٰۃ لینے پر قانع رہا۔ عمان، حضرموت اور یمن جیسے دور دور کے علاقوں سے لوگ آتے رہے۔ بڑے بڑے قبیلوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ سرزمین عرب جس نے آج تک کسی فرد واحد کے آگے اپنی گردن نہیں جھکائی تھی اب حضرت محمدؐ کے آگے سر اطاعت خم کرنے اور آپ کی قائم کی ہوئی تنظیم میں گتھ جانے پر راضی نظر آتی تھی اس کی بت پرستی اس سے بہتر دین اور اس سے بہتر اخلاق کے آگے اپنی سپر ڈال رہی تھی۔

ہجرت کے دسویں سال حضرت محمدؐ نے اپنے دینی صدر مقام مکہ میں حج بیت اللہ کی بڑی شان کے ساتھ قیادت فرمائی۔ یہ آپ کا آخری حج تھا، اسی لیے اس حج کو "حجۃ الوداع" کہا گیا ہے۔ مدینہ واپس آنے کے تین مہینے بعد آپ یکایک بیمار ہو گئے۔ آپ کو شدید درد سر اور بخار لاحق ہو گیا۔ اسی علالت میں ۸۔ جون سنہ ۶۳۲ء کو آپ نے انتقال فرمایا۔

رسول اللہ کی زندگی کے مدنی دور میں قرآن کی سب سے طویل سورتیں نازل ہوئیں یہ سورتیں روزہ، زکوٰۃ، صدقہ اور نماز کے دینی قوانین کے سوا معاشرتی اور سیاسی احکام پر بھی حاوی ہیں اور یہ نکاح، طلاق، غلاموں، جنگی قیدیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک سے متعلق ہیں۔ وہ جو خود کبھی ایک نادار یتیم رہ چکا تھا، اس کے قوانین غلاموں، یتیموں، کمزوروں اور مظلوموں کے حق میں خاص طور پر فیاضانہ ہیں۔

دیار عرب و شام میں بعض ایسی قدیم وضع کے مٹی کے گھر اب بھی نظر آتے ہیں جن میں چند کمرے ہوتے ہیں جو ایک دالان میں کھلتے ہیں۔ اور اسی دالان سے کمروں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی مٹی کے بنے ہوئے ایک گھر میں حضرت محمدؐ نے انتہائی عروج پر پہنچنے کے باوجود ظاہری نمود و نمائش سے پاک زندگی بسر فرمائی۔ اپنے کپڑوں کو آپ اکثر خود ہی سی لیا کرتے تھے۔ آپ تک ہر شخص کو ہر وقت رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ ہوگارتھ کہتا ہے: "آپ کے ہر قول و فعل نے خواہ

وہ معمولی ہو کہ اہم، شرعی حکم کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ دنیا کے کروڑوں آدمی آج بھی پورے شعور کے ساتھ ان احکام کی پابندی کرتے ہیں نسلِ انسانی کے کسی حصہ نے کسی کو اس طرح انسان کامل مان کر اس کی اتنی زیادہ تقلید نہیں کی ہے۔"

آپ نے جو تھوڑا سا اثاثہ چھوڑا اسے بھی آپ نے بیت المال کی ملک قرار دیا۔ آپؐ نے کوئی بارہ نکاح کیے تھے۔ چند نکاح محبت کی بنا پر اور چند سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہوئے تھے ان تمام بیبیوں میں آپ کی سب سے محبوب بی بی عائشہ حضرت ابوبکر کی نوعمر صاحبزادی تھیں۔ بی بی خدیجہ سے آپ کی کئی اولادیں ہوئیں۔ لیکن ان میں سے ایک یعنی بی بی فاطمہ کے سوا، جو حضرت علیؓ کے نکاح میں دی گئی تھیں، آپ کی تمام اولاد آپ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئی۔ حضرت محمدؐ کو اپنے شیر خوار صاحبزادے ابراہیم کی وفات کا بڑا رنج ہوا تھا۔ یہ صاحبزادے آپ کی قبطی نصرانی بی بی ماریہ کے بطن سے تولد ہوئے تھے

مدینہ کی دینی جماعت کے افق سے اسلامی ریاست کا آفتاب طلوع ہوا۔ مہاجرین اور انصار کی یہ جماعت امت یا اللہ کی جماعت، دین کی اساس پر قائم کی گئی تھی۔ یہ تاریخِ عرب میں سماجی تنظیم کی پہلی کوشش تھی جس کی بنا خونی رشتوں کی جگہ دینی تعلقات پر رکھی گئی تھی۔ مملکت کا مقتدرِ اعلیٰ صرف اللہ کو مانا گیا اور اللہ کا رسول عمر بھر کے لیے زمین پر اس کا حقیقی اور حکمران اعلیٰ قرار دیا گیا۔ اس طرح حضرت محمدؐ نے اپنے روحانی اقتدار کے ساتھ ساتھ بالکل ویسا ہی دنیوی اقتدار استعمال فرمایا جو کسی مملکت کا مقتدرِ اعلیٰ استعمال کر سکتا تھا۔ اس جماعت کے سارے افراد اپنے قبائلی حسب و نسب اور قدیم مذہبی عقائد کا لحاظ کیے بغیر کم از کم اصولی حیثیت سے آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی قرار دیے گئے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ نے جو اعلیٰ درجہ کا بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس کے الفاظ ہیں:

"لوگو! میری باتوں کو دل لگا کر سنو۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اب تم سب کا تعلق ایک ہی برادری سے ہے۔ اس لیے تم میں سے کسی کو یہ حق

حاصل نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی کسی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اپنے قبضے یا استعمال میں لائے . . . . "

اس طرح عربوں کے تعلقات یعنی قبائلی رشتہ داری کی گرہ ایک ہی وار میں کٹ گئی۔ اور اس کی جگہ ایمان کی مضبوط گرہ لگادی گئی۔ ملک عرب کے لیے ایک طرح کی اسلامی برادری قائم کردی گئی۔ اس نئی جماعت میں نہ تو کسی قسم کا کاہنی نظام تھا، نہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت تھی اور نہ کوئی مرکزی دینی عدالت تھی۔ اس کی مسجدیں مشترک عبادت کا مقام ہونے کے علاوہ عام اجتماعی اور فوجی تربیت کا مقام بھی ہوتی تھیں۔ مسجد میں امام عبادت کے موقعوں پر مسلمانوں کی قیادت کرنے کے سوا میدانِ کارزار میں اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بھی ہوا کرتا تھا۔ اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ساری دنیا کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی امداد اور حفاظت کریں۔ وہ تمام عرب جو اب بھی مشرک تھے، امداد اور حفاظت کی حدود سے خارج تھے۔ ان کی حیثیت مجرموں کی سی تھی۔ اسلام نے پچھلی زندگی کی باتوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا۔ شراب اور قمار بازی کو۔۔۔ جو عورت کے بعد عربوں کی زندگی کے دو محبوب ترین مشغلے تھے ۔۔۔ ایک ہی آیت کے ذریعہ حرام کردیا گیا۔ گانا بجانا بھی عربوں کو اتنا ہی مرغوب تھا۔ لیکن اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی جانے لگی۔

مدینہ سے اسلام کی دینی حکومت عرب کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے مغربی ایشیا، اور شمالی افریقہ کے ایک بڑے حصہ کو بھی مسخر کرلیا۔ مدینہ کی اسلامی جماعت گویا مستقبل کی ملت اسلامیہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ حضرت محمدؐ نے اپنی مختصر سی نبوی زندگی میں ایک غیر امید افزا سی ہو لیے سی عرب جیسے گم نام اور دنیا سے الگ تھلگ ملک میں ایسی قوم پیدا کی جس کی شیرازہ بندی آپ سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے ایک ایسا دین پیش کیا جس نے دنیا کے وسیع و عریض علاقوں میں یہودیت اور نصرانیت کو ان کے اونچے مقام سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لے لی۔ اور آج بھی اولاد آدم کی بہت بڑی تعداد

اسی دین کی پیروی کرتی ہے۔ آپ نے ایک ایسی مملکت کا سنگ بنیاد رکھا جو اس وقت کی متمدن دنیا کے بہترین علاقوں کو بہت جلد اپنے وسیع و عریض دامنوں میں سمیٹ لینے والی تھی۔ آپ اُمّی تھے لیکن آپ کے وسیلے ایک ایسی کتاب منظر شہود پر آئی جس کے متعلق دنیا کی آبادی کے آٹھویں حصّہ کا یہ یقین اور ایمان ہے کہ یہ کتاب تمام حکمت، فلسفہ اور شریعت کا سرچشمہ ہے۔

# ۵۔ کتاب اور ایمان

آج بھی آپ کو بہت سے مسلمان گلی کوچوں اور شاہراہوں سے کاغذ کے پرزوں کو اُٹھا کر انہیں قریب کی دیواروں کے سوراخوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ ٹھونستے نظر آئینگے کہ کہیں کسی کاغذ پر اللہ کا نام نہ لکھا ہو۔ اللہ کی کتاب قرآن کا مسلمان حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور جبرئیل فرشتہ کے ذریعہ حضرت محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ (بجز پاک کے اس کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ قرآن ۵۶: ۷۹)

دنیا میں نصرانیوں کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً دوگنی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی تمام کتابوں کے مقابلے میں صرف قرآن ہی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادتوں میں استعمال ہونے کے سوا یہ ایک ایسی درسی کتاب بھی ہے جس کے ذریعہ عملاً ہر نوجوان مسلمان عربی پڑھنا سیکھتا ہے۔ ترکی زبان کے سرکاری ترجمہ کے سوا قرآن کا کوئی مستند سرکاری اسلامی ترجمہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود دنیا کی کوئی چالیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان میں راڈول (Rodwell) کا کیا ہوا ترجمہ جو 'ایوری مین سیریز' میں چھپا ہے آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ مغربی زبانوں میں قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا تھا۔ یہ ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں کلنی کے پادری پیٹر نے کیا تھا۔ اس نے یہ کام بزعم خود اسلام کے عقائد کی تکذیب اور بانیِ اسلام کی رسوائی کے لیے کیا تھا۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ سب سے پہلے ۱۶۴۹ء میں فرانسیسی زبان سے کیرس بروک کے پادری الگزینڈر راس نے کیا تھا۔ اس ترجمہ کی غرض و غایت اس کے سرورق کی اس عبارت سے ظاہر ہے: "قرآن محمدی ۔ ان تمام لوگوں کی رہنمائی کے لیے جو ترکوں کے جھوٹے دعووں سے واقف

ہونا چاہتے ہیں"

انجیل کے مقابلہ میں قرآن کے متن میں بہت کم شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ قرآن پہلی مرتبہ حضرت محمدؐ کی وفات کے انیس ۱۹ سال بعد کتابی شکل میں مرتب کیا گیا تھا اور اس کی یہی ترتیب آج تک آخری اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اسلام کی مختلف لڑائیوں میں قرآن کے حافظ بڑی تعداد میں شہید ہو رہے تھے۔ اس سے بھی پہلے قرآن "کھجور کے پتوں، پتھر کی سفید تختیوں اور انسانی سینوں سے کتابی شکل میں مدوّن کیا جا چکا تھا۔ لیکن اس کی یہ تدوین مستند اور سرکاری نہ تھی۔ اس لیے اس کے تمام نسخے تلف کر دیے گئے۔ قرآن کی (۶۲۳۹) آیتیں، اس کے (۷۷۹۳۲) الفاظ۔ اور (۳۲۳۶۲۱) حروف اب بھی بڑی دقت نظری اور دیدہ ریزی کے ساتھ شمار کیے جاتے ہیں۔ قرآن صرف ایک مذہب کا دل اور آسمانی بادشاہت کا راستہ دکھانے والا ہی نہیں، بلکہ وہ علوم وفنون اور سائنس وحکمت کا نچوڑ اور ایک ایسی سیاسی دستاویز بھی ہے جس میں ارضی بادشاہت کے قوانین بھی پیش کیے گئے ہیں۔

توریت اور قرآن میں بہت ہی نمایاں مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ قرآن کے تقریباً تمام تاریخی قصے گویا انجیلی قصوں کے تتمے ہیں۔ توریت کے جو کردار قرآن میں پیش کیے گئے ہیں ان میں آدم، نوح، ابراہیم (کوئی سترہ باران کا ذکر آیا ہے) اسماعیل، لوط، یوسف، موسیٰ (چونتیس ۳۴ سورتوں میں ان کا نام آیا ہے) طالوت، داؤد، سلیمان، الیاس، ایوب اور یونس کو بڑا نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ آدم کی تخلیق اور جنت سے نکالے جانے کا پانچ مرتبہ، طوفانِ نوح اور لوط کے قصہ کا ذکر آٹھ مرتبہ آیا ہے۔ انجیل کے کرداروں میں صرف زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور مریم کو اہمیت دی گئی ہے۔ توریت اور انجیل اور قرآن میں قدیم سامی زبان کی بہت سی ایسی ضرب الامثال اور کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں جو عبرانی اور عرب دونوں قوموں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آنکھ کے بدلے آنکھ والعین بالعین، ریت پر مکان بنانا:

اَسَّسَ بنیانہ علیٰ شفا جرُفٍ ھارٍ" اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا" یلج الجمل فی سَمِّ الخیاط" "ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے" کل نفسٍ ذائقۃ الموت۔ بعض معجزات جو حضرت عیسیٰ سے منسوب ہیں جیسے ان کا ایام شیرخواری میں جھولے میں بات کرنا یا مٹی کے پرندوں میں جان ڈال کر انہیں اُڑا دینا، ان معجزات کی یاد دلاتے ہیں جو تحریف شدہ مسیحی مبشرات میں مذکور ہیں

قرآنی مذہب انجیل کے دین مسیحی کے مقابلہ میں توریت کے دین یہودیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اسلام اور ان دونوں مذہبوں میں اتنی قریبی مشابہتیں پائی جاتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ابتداء میں یہ ایک الگ واضح دین کی بجائے نصرانیت کی کسی بدعتی شاخ کی صورت میں رونما ہوا ہو گا۔ دلانتے نے اپنی کتاب طربیہ خداوندی میں حضرت محمد کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے جیسے اس نے اس دین کو ایسا ہی سمجھا تھا

قرآنی ابواب ۔ سورہ ۔ کچھ اس طرح مرتب کیے گئے ہیں کہ سب سے پہلی سورت سب سے زیادہ طویل ملیگی۔ اور اس کے بعد کی ہر سورہ اپنی پچھلی سورۃ کے مقابلہ میں چھوٹی ہوتی جائیگی یہاں تک کہ آخری سورتیں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ملینگی۔ قرآن کی سورتیں پہلے پہل مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان کی تعداد تقریباً نوے ہے۔ ان سورتوں کا تعلق چونکہ زمانہ جدوجہد سے ہے اس لیے یہ مختصر، اسلوب میں پرجوش، آتشیں، پرغضب، اور پیغمبرانہ احساسات سے لبریز ہیں۔ خدا کی وحدت اور اس کے صفات، انسانکے اخلاقی فرائض اور مکافاتِ عمل ان سورتوں کے اہم موضوع ہیں۔ باقی سورتیں مدنی ہیں۔ ان کی تعداد چوبیس ہے (یہ قرآن کے ایک تہائی حصہ پر مشتمل ہیں)۔ یہ سورتیں زمانہ فتح میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں سے اکثر سورتیں بہت ہی طویل اور شریعت سازی کے لوازم سے مملو ہیں۔ ان سورتوں میں دینی عقائد اور دینی فرائض جیسے باجماعت نماز، روزہ، حج اور مقدس مہینوں سے متعلق قواعد و ضوابط پیش کیے گئے ہیں ان میں شراب اور سور کے گوشت کے استعمال اور قمار بازی کے امتناعی احکام، زکوٰۃ، قتال و

جہاد کے قواعد اور قتل انسان، قرابت داری وصلہ رحمی، چوری، نکاح، زنا، وراثت اور غلاموں کی آزادی سے متعلق دیوانی اور تعزیری قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ نکاح کا جو بار بار ذکر کیا گیا ہے اس سے کثرتِ ازدواج کی ترغیب نہیں بلکہ کچھ تحدید ہی ہوتی ہے۔ بعض یورپی ناقدوں نے طلاق کے قوانین پر اعتراض کیے ہیں (۴: ۲۴؛ ۳۳: ۴۸؛ ۲: ۲۲۹) لیکن غلاموں، یتیموں اور اجنبیوں کے ساتھ سلوک کرنے سے متعلق جو قوانین قرآن میں پیش کیے گئے ہیں (۴: ۲؛ ۳: ۴۰؛ ۱۶: ۷۳؛ ۲۴: ۳۳) ان کو یہی لوگ اسلامی مجموعۂ قوانین کے ایسے اجزا تصور کرتے ہیں جو انسان دوستی سے لبریز ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب کچھ اس انداز سے دلائی گئی ہے کہ گویا یہ عمل خدا کے نزدیک بے انتہا پسندیدہ اور بہت سے گناہوں کا کفارہ ہے۔

خود لفظ قرآن کے معنی پڑھائی، تقریر اور مکالمہ کے ہیں۔ یہ کتاب ایک قوی اور زندہ آواز ہے۔ اس کو زبان سے پڑھنے اور اس کے اصلی متن کو سننے ہی سے اس کی حقیقی قدر و قیمت پہچانی جاسکتی ہے۔ اس کی قوتِ تاثیر زیادہ تر اس کے خطیبانہ انداز، قافیہ بندی، لحن، ترتیل اور الفاظ کے سبک پن میں مضمر ہے۔ اور اس کی یہ خصوصیات ترجمہ میں بالکل منتقل نہیں کی جاسکتیں۔ قرآن انجیل کے $\frac{۴}{۵}$ حصے کے مساوی ہے۔ اسلام کی اساس اور مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی معاملات میں قطعی حکم ہونے کے اعتبار سے قرآن نے مسلمانوں کے فکر و عمل پر جو اثرات مرتب کیے ہیں وہ مسلمانوں کی داستان کا صرف ایک حصہ ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک دینیات؛ فقہ، اور سائنس ایک مشعل کی کرنیں ہیں اس لیے اوسط تعلیم کے لیے قرآن سائنس کی رہنما اور ایک درسی کتاب کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی، جامعہ ازہر جیسے ادارے میں یہ کتاب اب بھی پورے نصاب کی بنیاد قرار دی گئی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف قرآن ہی کے طفیل عربی بولنے والی قوموں کی متعدد مقامی بولیوں نے رومانسی بولیوں کی طرح ایک دوسرے

سے الگ ہو کر مستقل حیثیت اختیار نہیں کر لی ہے تو اس وقت ہی ہم قرآن کی ادبی تاثیر کو پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے آج ایک عراقی کسی مراکشی کی گفتگو آسانی کے ساتھ نہ سمجھ سکے، لیکن اس کی تحریری زبان کے سمجھنے میں عراقی کو کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شام، عرب اور مصر کی طرح عراق اور مراکش میں ہر جگہ وہی کلاسیکل عربی زبان رائج ہے جس کی تشکیل قرآن نے کی ہے۔ حضرت محمدؐ کے زمانے میں عربی نثر کا کوئی ادبی کارنامہ موجود نہ تھا۔ قرآن عربی نثر کا سب سے پہلا نمونہ ہے۔ اور ہر زمانے میں اس سے نثر کے اعلیٰ نمونے کی حیثیت سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی مقفیٰ نثر نے عربی ادب میں ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے کہ آج کے زمانے کا ہر قدامت پسند عربی ادیب بھی اس کی ہو بہو نقل اتارنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ نکلسن نے اپنی انگریزی کتاب 'عربوں کی ادبی تاریخ' میں سورۂ فاتحہ کا جو ترجمہ دیا ہے اس میں اصل عربی کی چاشنی باقی رکھنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔

مسلمان علما، اپنے دین کے اساسی اصول پر بحث کرتے وقت دینی عقائد اور عبادت یعنی دینی فرائض کو الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

دینی عقیدہ ایمان، اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ قیامت کو برحق جاننے اور اس پر یقین رکھنے کا نام ہے۔ ایمان کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا جزو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے جس کے معنیٰ ہیں سوائے اللہ کے اور کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے۔ ایمان میں خدا کے تصور کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ حقیقت میں مسلم دینیات کا ننانوے فی صد سے زیادہ حصہ اللہ کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ (اللہ) واحد اور حقیقی خدا ہے۔ وہی حقیقت عظمیٰ ہے۔ وہ ازلی ہے، خالق ہے، علیم و قدیم اور قادر مطلق ہے۔ اس کے ننانوے نام اور اتنے ہی صفات ہیں۔ اس کے ننانوے ناموں کے مطابق اسلامی تسبیح کے دانے بھی ننانوے ہوتے ہیں۔ اس کی صفات مہر و الطاف اس کی صفات قہر و جلال سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ اسلام

اللہ کی مشیت و رضا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے کا مذہب ہے۔ آزمائش عظیم میں حضرت ابراہیم اور آپ کے فرزند کے رضائے الٰہی کے آگے جھک جانے اور اللہ کی راہ میں باپ کی طرف سے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کو قرآن میں "اسلما" (۳۷ : ۱۰۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت محمد نے اپنے دین کا نام بھی اسی "اسلما" سے لیا ہے۔

دین کی حیثیت سے اسلام کی حقیقی طاقت اور قوت کا راز توحید کے ٹھوس اور غیر متزلزل عقیدے اور اس یقین کامل میں مضمر ہے کہ ایک ہستی مطلق ساری کائنات پر قادر اور حکمراں ہے۔ اہل اسلام ایک ایسی طمانیت، اور تسلیم و رضا کی دولت سے بہرہ ور ہیں جس سے دوسرے مذہبوں کے پیرو محروم ہیں۔ اسی لیے اسلامی ملکوں میں خودکشی کی وارداتیں شاذ و نادر ہی پیش آتی ہیں۔

ایمان کا دوسرا جزو یہ ہے کہ حضرت محمد اللہ کے رسول، نبی اور اپنی اُمت کے ہادی ہیں۔ آپ نبیوں کے طویل سلسلے کے آخر میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ہیں۔ قرآن کے دینی نظام میں حضرت محمد ایک بشر ہیں اور ان کا واحد معجزہ قرآن کی معجز بیانی ہے لیکن عام روایتوں اور عوامی قصّوں میں آپ کو نورِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ کا دین نمایاں طور پر ایک عملی دین ہے، اور اپنے بانی کی عملی اور اثر آفریں روح کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتا جو پہنچ سے باہر اور ناممکن الحصول ہو۔ اس دین کا دامن ہر قسم کی مذہبی مشکلوں اور الجھنوں سے پاک ہے۔ اس میں کسی قسم کے رموز اور اشارے نہیں ہیں۔ اس میں کسی خاص فرقے، جماعت یا فرد کو روحانی اجارہ حاصل نہیں ہے۔ اور نہ وہ کسی متوارث تقدیس اور متوارث منصب رشد و ہدایت کے نظام کو اپنے اندر جگہ دیتا ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے۔ یہ آخری وحی کا حامل اور "غیر مخلوق" ہے۔ قرآن کی ہر عبارت "قال اللہ" کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ قرآن اپنی صوتی اور تحریری تکرار اور اپنی لسانی شکل و صورت کے اعتبار سے آسمانی نقشِ اول (لوحِ محفوظ) کی طرح قدیم ہے، اور یہی اس کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ دنیا کے تمام اجنہ اور انسان سر جوڑ کر بیٹھیں تب بھی قرآن کی نظیر پیش نہیں کر سکتے ہیں۔

اسلامی علم الملائکہ میں جبرئیل فرشتہ کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ یہ فرشتہ حاملِ وحی بھی ہے، روح القدس بھی اور روح الامین بھی۔ خدائے بزرگ و برتر کا قاصد ہونے کے اعتبار سے جبرئیل فرشتہ یونانی صنمیات کے عطارد (Hermes) سے ملتا جلتا ہے۔

گناہ یا تو اخلاقی ہوسکتا ہے یا رسمی۔ سب سے بدترین اور ناقابل عفو گناہ شرک ہے۔ اور شرک خدائے برحق کے ساتھ کسی ایک یا کئی ہستیوں کو اس کی صفات میں شریک کرنے یا اس کے برابر سمجھنے کا نام ہے۔ حضرت محمدؐ کے نزدیک کئی خداؤں کی پرستش بے انتہا قابل نفرت چیز تھی۔ اس لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں مشرکوں کو روزِ قیامت کے ذکر سے مسلسل ڈرایا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو مشرک نہیں سمجھتے تھے لیکن بعض مفسر اس بارے میں مختلف الخیال ہیں۔

قرآن کے موثر ترین اور سب سے زیادہ دل نشین حصوں میں وہ حصے بھی ہیں جن میں آنے والی زندگی سے بحث کی گئی ہے۔ آنے والی زندگی کے برحق ہونے کی اہمیت پر 'یوم الدین'، 'یوم البعث'، 'الیوم'، 'الساعۃ'، 'الحاقۃ'، کے متواتر تذکروں کے ذریعہ بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں آنے والی زندگی کا جو تصور اس کی جسمانی سزاؤں اور جسمانی لذتوں کے ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق مرنے کے بعد جسم کے ساتھ جی اُٹھنے پر ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی عبادتیں یا دینی فرائض اسلام کے ارکان خمسہ پر مبنی ہیں۔

اقرار ایمان اسلام کا پہلا رکن ہے۔ اس کا خلاصہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ محمد رسول اللہ کے عظیم کلمہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر نومولود مسلمان بچے کے کانوں میں سب سے پہلے یہی الفاظ پہنچائے جاتے ہیں اور مسلمان کی قبر پر سب سے آخر میں یہی الفاظ کہے جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان اور کوئی لفظ اس کثرت کے ساتھ نہیں دہرائے جاتے۔ مسجدوں کے میناروں کی بلندیوں سے پانچ وقتوں کی نمازوں کے لیے مؤذنوں کی اذانوں میں یہی الفاظ بلند ہوتے ہیں۔ اسلام میں عام طور پر ایمان کا صرف زبانی اقرار کافی سمجھا جاتا ہے۔ جب

کوئی عقیدۂ توحید کو قبول کرکے اس کا اقرار کرتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔

دن میں پانچ مرتبہ — طلوع آفتاب سے پہلے (فجر)، دوپہر کو (ظہر)، دوپہر ڈھلنے کے بعد (عصر)، غروب آفتاب کے عین بعد (مغرب) اور رات میں (عشاء) — ہر سچا مسلمان کعبہ کی طرف منہ کرکے اپنی مقررہ نماز ادا کرتا ہے۔ نماز اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ کسی نماز کے وقت اگر دنیائے اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو عبادت گذاروں کی بے شمار صفیں سیرالیون (Sirra Leeone، امریکہ) سے کینٹن (Conton) تک اور ٹوبولسک (Tobolsk) سے کیپ ٹاؤن تک کے وسیع و عریض اور دائم وسعت پذیر رقبہ میں مکہ کو اپنا مرکز بنائے کھڑی نظر آئیں گی۔

نماز — صلوٰۃ — ایک ایسا مذہبی فعل ہے جس کی شریعت نے پوری پوری وضاحت کردی ہے اور تمام مسلمان ایک خاص سمت — کعبہ کی طرف — منہ کرکے جسمانی اعضاء کی مخصوص حرکتوں کے ساتھ اور ایک خاص انداز سے تکبیر، قیام، رکوع، سجود، قعود اور سلام ادا کرتے ہیں۔ صلوٰۃ کے لیے نمازی کا شرعاً پاک ہونا اور عربی زبان کو بطور ذریعۂ اظہار استعمال کرنا ضروری ہے۔ چاہے اس کی مادری زبان کچھ ہی ہو۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صلوٰۃ کو تضرع و التجا کی بہ نسبت اللہ کی حمد و ثنا اور ذکر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ فاتحہ یعنی ابتداء کا سادہ اور پرمعنی سورہ انجیلی حمد و ثنا سے مشابہ ہے۔ ہر سچا مسلمان دن میں بیس مرتبہ اس کا ورد کرتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام اوراد میں سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ پڑھا جانے والا کلام ہے۔ وسط شب کی نماز اختیاری عبادت کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ اور اللہ کے پاس دونے ثواب کی مستحق ہے۔

جمعہ کی نماز دوپہر کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ یہ ایسی نماز ہے جس میں شہر کے تمام مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ نماز تمام بالغ مردوں پر فرض ہے۔ بعض مسجدوں میں عورتوں کے لیے بھی جگہ محفوظ رکھی جاتی ہے۔ نماز جمعہ کی ایک خصوصیت خطبہ ہے جو امام پڑھتا ہے۔ اس

میں صدرِ مملکت یا امیر کے لیے دعا بھی کی جاتی ہو۔ یہ دینی اجتماع اپنی اصل کے اعتبار سے یہودی صلوٰۃ سے مشابہ تھا لیکن آگے چل کر اس نے عیسائیوں کی اتوار کی عبادت کا اثر قبول کرلیا۔ اجتماعی عبادت کے اعتبار سے جمعہ کی نماز اپنے شکوہ، اپنی سادگی، اپنے نظم وضبط کے لیے اپنی آپ نظیر ہے۔ مسجدوں میں مسلمان اپنی خود تنظیم صفوں میں امام کے پیچھے سیدھے کھڑے ہوکر اس کی تقلید جس صحت واحترام کے ساتھ کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ایک بڑا اثر آفریں منظر ہوتا ہے۔ نظم وضبط کے لحاظ سے یہ اجتماعی عبادت ریگستان عرب کے مغرور اور انفرادیت پسند ابناء بادیہ میں معاشرتی مساوات کا احساس پیدا کرنے اور اتحادِ عمل کے شعور کو فروغ دینے میں بے انتہا مفید اور فیض بخش ثابت ہوئی۔ اس عبادت نے مسلمانوں کی اس اخوت کو بے حد تقویت اور ترقی دی جس کو حضرت محمدؐ کے لائے ہوئے دین نے فطری طور پر خونی رشتہ کے بدل کی صورت میں پیش کیا تھا۔ مسلمانوں کی مسجدیں "اسلام کی پہلی قواعد گاہیں بن گئیں"۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ ابتدا میں زکوٰۃ کو ایک کارِ خیر قرار دیا گیا تھا اور اس کو خدا ترسی اور تقویٰ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ پھر اس نے رفتہ رفتہ لازمی محصولِ جائداد کی صورت اختیار کرلی اور اس میں زر و دولت، مویشی، اناج، میوے اور اسباب تجارت کو شامل کیا گیا۔ اسلام کی نوخیز مملکت اپنے سرکاری عہدہ داروں کے ذریعہ زکوٰۃ وصول کرکے اسے ایک مرکزی خزانے ۔بیت المال۔ میں جمع کرتی تھی۔ اور اسے معاشرے کے غریبوں اور مسکینوں کی امداد، مسجدوں کی تعمیر اور حکومتی اخراجات پر صرف کرتی تھی۔ یلینی کی رائے میں زکوٰۃ کا بنیادی اصول ایک حد تک اس عشرہ کے مشابہ ہے جو جنوبی عرب کے عربوں کو اپنا مال تجارت فروخت کرنے سے پہلے اپنے دیوتا کے نذر کرنا پڑتا تھا۔ زکوٰۃ کی شرح مختلف رہی ہے لیکن اس کا اوسط علی العموم مال کا ۲½ فی صد ہوتا ہے۔ سپاہیوں کے وظائف بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے۔ بعد میں جب حقیقی اسلامی مملکت کا وجود باقی نہ رہا تو زکوٰۃ کی ادائی

مسلمانوں کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی۔

اگرچہ قرآن میں کفارے کے روزوں کا ذکر متعدد مقاموں پر کیا گیا ہے لیکن رمضان کا ذکر ماہ صیام کی حیثیت سے صرف ایک ہی جگہ آیا ہے۔ رمضان میں طلوع آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اسلامی ملکوں میں حکومت یا عوام کی جانب سے غیر روزہ دار پر تشدد برتنے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں قبل اسلام کے بت پرست عرب میں روزے کے رواج کا کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہود و نصاریٰ میں روزے کا دستور مستقل حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہی روزہ اسلام کا چوتھا رکن بن گیا۔

حج، اسلام کا پانچواں اور آخری رکن ہے۔ ہر صاحبِ استطاعت مسلمان (چاہے مرد ہو کہ عورت) پر زندگی میں ایک بار سال کے مقررہ مہینے میں مکہ کا سفر کرنا فرض ہے۔ حاجی جب تک حالت احرام۔ احرام ایک بن سلا کپڑا ہوتا ہے جسے حاجی حج کے موقع پر پہنتے ہیں۔ میں ہوتا ہے۔ ان ممنوعات سے محترز رہنے کے سوا جو رمضان کے ضمن میں عائد کی گئی ہیں (مثلاً جنسی ملاپ کی ممانعت) اس کو قتل، شکار اور درخت کاٹنے کے خصوصی امتناعی احکام کی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ مقدس مقاموں کی زیارت قدیم سامیوں کی رسم تھی جو توریت کے دنوں تک جاری رہی۔ اصل میں یہ کسی سورج پرست فرقہ کی خصوصیت ہوگی اور اس کا تہوار بہار کے موسم میں آتا ہوگا یہ گویا جلانے والے سورج کی حکومت کے اختتام اور برق و باراں کے جان بخش دیوتا کے خیر مقدم کی رسم تھی۔

وسطی افریقہ کے اس سرے سے اس سرے تک سنی گال، لائبیریا، اور نائجیریا کے زائرون کا ایک لامتناہی سلسلہ مشرق کی طرف جاتا ہوا ہمیشہ نظر آتا ہے۔ اور جوں جوں یہ سلسلہ آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے، اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کچھ زائر پیدل ہوتے ہیں اور باقی اونٹوں پر۔ کثرت مردوں کی ہوتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

یہ لوگ تجارت بھی کرتے ہیں۔ بھیک بھی مانگتے ہیں۔ بہت سے راستہ میں مرکر شہید کہلاتے ہیں جو باقی رہ جاتے ہیں آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ بحیرۂ احمر کی کسی بندرگاہ تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ یہاں سے وہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ بحیرۂ احمر کے اس پار پہنچا دیے جاتے ہیں لیکن عراق شام اور مصر کے کارواں سب سے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ چاروں ملک اپنے اپنے کاروانوں کے آگے ہر سال ایک محمل بھیجا کرتے تھے جو کارواں کی عظمت و احترام کی علامت ہوتا تھا محمل ایک میانہ ہوتا ہے جس کو بڑے اہتمام کے ساتھ سجایا جاتا ہے۔ جس اونٹ کی پیٹھ پر محمل رکھا ہوتا ہے اس پر کوئی سوار نہیں ہوتا۔ تزک و احتشام اور شان و شکوہ کے لحاظ سے آج کل صرف مصر کا کارواں ہی ایسا رہ گیا ہے جس کو قدیم کاروانوں کے ساتھ نسبت دی جا سکتی ہے۔

پہلی عالمی جنگ عظیم سے لے کر دوسری عالمی جنگ عظیم کے دوران میں حاجیوں کی سالانہ تعداد اوسطاً (۱۷۲۰۰۰) رہی ہے۔ ترکی کے سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ۱۹۰۷ء میں حاجیوں کی تعداد (۲۸۰۰۰۰) تھی۔ ملایا سے حسب معمول آنے والے حاجیوں کی تعداد سب ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی تقریباً (۳۰۰۰۰) ہوتی ہے۔ فریضۂ حج صدیوں سے اسلام میں متحد کرنے والی ایک زبردست قوت اور مختلف عقیدے کے لوگوں کے درمیاں ایک موثر ترین رابطۂ عام کا کام دیتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے تقریباً ہر مستطیع مسلمان کو زندگی میں کم سے کم ایک بار سفر کرنے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ تمام عالم کی مسلم برادری کے اس عظیم اجتماع کی اشتراکیت ساز قوت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس نے حبشیوں، بربریوں، چینیوں، ایرانیوں، ترکوں اور عربوں — امیر ہوں کہ غریب، اعلیٰ ہوں کہ ادنیٰ — کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے اور مذہب کی مشترک سطح پر ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع عطا کیے۔ دنیا کے تمام مذہبوں کے مقابلہ میں صرف اسلام ہی کو کم سے کم اپنی جماعت کی حدوں کے اندر رنگ و نسل اور قومیت کے امتیاز مٹا دینے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ خطِ فاصل صرف مسلمانوں اور باقی انسانیت کے درمیان کھینچا جاتا ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا

ہر کران اجتماعوں (حج) نے اس مقصد کے حصول میں نہایت اہم حصّہ لیا ہے۔ ان اجتماعوں نے ایسے ایسے علاقوں میں بھی دین اسلام کو پھیلانے کے بہترین مواقع فراہم کیے جو نہ صرف ابھی تک جدید ذرائع حمل ونقل کے ذریعہ متمدن دنیا سے مربوط نہیں ہوئے ہیں، بلکہ وہاں صحافت کی زندہ آواز بھی معدوم ہے۔

جہاد کو مسلمانوں کے صرف ایک ہی فرقہ یعنی خارجیوں نے اسلام کے چھٹے رکن کا مرتبہ دیا ہے۔ جہاں تک اسلام کی دنیوی طاقت کا تعلق ہے اس کا بے نظیر پھیلاؤ جہاد ہی کا مرہون منت ہے "دارالسلام" اور "دارالحرب" کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی جغرافیائی دیواروں کو توڑتے رہنا خلیفہ کا ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ حالیہ زمانوں میں جتنے جہادوں کا اعلان ہوا ان کو عالم اسلام کی تائید کم ہی حاصل رہی اسلام اب تو بہت سی بے گانی حکومتوں کے تحت بھی پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ حکومتیں یا تو بہت زیادہ طاقتور ہیں یا بہت زیادہ فراخ دل اور فیاض واقع ہوئی ہیں۔ اسی لیے ان حکومتوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ غیر مسلموں کے خلاف جہاد کا آخری اعلان ۱۹۱۴ء کے موسم خزاں میں ترکی سلطان محمد رشاد کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اعلان بالکل ناکام ثابت ہوا۔ ایک مستشرق نے اس کو اپنی کتاب "دی ہولی وار اِن جرمنی" کا موضوع بنایا ہے۔

اوپر جن احکام اور دینی واجبات یعنی عبادات کا ذکر ہوا یہی اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن میں صرف یہی احکام درج ہیں۔ بنیادی طور پر مسلمان کے ہر فعل کی رہنمائی کا معیار رضائے الٰہی ہے جو حضرت محمدؐ کے ذریعہ قرآن میں پیش کی گئی ہے۔

# ۶۔ اسلام کا عُروج

قرونِ وسطیٰ کی ابتدا میں جو واقعات پیش آئے ہیں، ان میں دو واقعات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایک واقعہ تو ٹیوٹانی قوم کا ترکِ وطن ہے جس کی وجہ سے مقدس رومی شہنشاہیت تقسیم ہوگئی اور اس میں انتشار رونما ہوا۔ دوسرا واقعہ عربوں کی فتوحات ہے۔ ایک طرف عربوں نے ایرانی شہنشاہیت کے پرخچے اُڑا دیے۔ دوسری طرف انہوں نے بازنطینی سلطنت کی بنیاد دہلا ڈالی۔ اگر کوئی ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی تین پینتیس سالوں میں یہ پیشین گوئی کرنے کی جرأت کرتا کہ دس بیس سال کے اندر اندر ایک نامعلوم طاقت عرب جیسی غیر متمدن اور غیر معروف سرزمین سے اُٹھیگی اور اپنے زمانے کی دو نہایت بڑی سلطنتوں پر دھاوا کرکے ایک پر قابض و متصرف ہو جائیگی اور دوسری سے اس کے بہترین علاقے چھین لیگی، تو یقیناً اسے پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے بالکل ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کی وفات کے بعد عرب کی بانجھ زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے مردم خیز خطہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھر تو اس کی خاک سے ایسے ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ لوگ اُٹھے کہ شمار اور صفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ عراق، شام اور مصر میں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص نے جو معرکے سر کیے ہیں، حربیات کی تاریخ میں ان کا شمار ایسی فوجی مہموں میں ہوتا ہے جو نہایت ہی دلیرانہ سر ہوئے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ بجا طور پر نپولین، ہنی بال، اور سکندر کی جنگی مہموں سے کیا جا سکتا ہے۔

ساسانی اور بازنطینی شہنشاہیتیں باہمی رشک و حسد اور رقابت کی بدولت سالہا سال سے ایک دوسرے سے دست بگریباں رہیں۔ اس وجہ سے یہ شہنشاہیتیں بہت کمزور

ہوگئی تھیں۔ پھران باہمی لڑائیوں کے بیش قرار مصارف ادا کرنے کے لیے دونوں سلطنتوں میں شہریوں پر بھاری محصول عائد کیے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں شہنشاہیتوں کے عوام کی وفاداریوں کو گھن لگ گیا۔ بعض عرب قبیلوں کو بلادِ شام و عراق اور خاص کر سواحلِ عرب میں سیاسی حقوق پہلے ہی سے حاصل ہو چکے تھے۔ نصرانی کلیسا میں عقائد کے اختلاف رونما ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ یونانی کلیسا کے مظالم بہت بڑھ چکے تھے۔ غرض ان تمام عوامل نے مل کر عرب فوجوں کی حیرتناک کامرانیوں کے لیے راستہ صاف کیا۔ شام اور فلسطین کے سامی اور مصر کے حامی باشندوں نے نو وارد عربوں کو اپنے نفرت انگیز اور ستم شعار حکمرانوں کے مقابلہ میں اپنا قریب تر رشتہ دار اور عزیز جانا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے متعلق یہ خیال کرنا چاہیے کہ انھی کی وساطت سے قدیم مشرق قریب نے اپنا کھویا ہوا وقار و اقتدار دوبارہ حاصل کرلیا۔ اسلامی تحریک ہی کے زیر اثر مشرق جاگا اور اس نے مغرب کی ہزار سالہ غلامی کے طوق کو اپنے گلے سے اُتار پھینکا۔ اس کے سوا نئے فاتحوں نے مفتوحہ ملکوں پر جو خراج عائد کیا تھا اس کی مقدار پچھلے حاکموں کے عائد کیے ہوئے محصولوں کے مقابلے میں کم تھی۔ اور اب مفتوح زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکتے تھے۔ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے ان کی مثال ایک چست و چالاک اور طاقتور خاندان کی سی تھی جس کے افراد میں ایک نیا جوش اور ولولہ بھرا تھا، جن میں عزم و ایقان تھا، اور ان کے نئے دین نے ان کو موت کے ڈر سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔

مسلمانوں کی معجزنما فتوحات میں اس فوجی تکنیک کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جو انھوں نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے کف دست اور لق و دق صحراؤں کی مہمات جنگ میں استعمال کی تھی۔ اس تکنیک سے ہماری مراد اسپ سوار اور شتر سوار فوجی دستوں کا استعمال ہے جس میں رومیوں کو کبھی مہارت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ فوج، قلب، میمنہ اور میسرہ میں تقسیم کی جاتی تھی۔ میمنہ اور میسرہ سواروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ فوج کی تقسیم میں قبائلی وحدت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

ہر قبیلہ کا نشان الگ ہوتا تھا۔ نیزے سے ایک کپڑا باندھ دیا جاتا تھا اور اس کو قبیلہ کا سب سے بہادر آدمی اُٹھا لیتا تھا۔ یہی لِوا قبیلہ کا نشان تھا۔ رسول اللہ کے پرچم پر عقاب بنا ہوا تھا۔ پیدل فوج تیر و کمان، فلاخن، اور کبھی تلوار اور سپر استعمال کرتی تھی۔ تلوار میان میں رکھ کر بائیں کندھے پر لٹکائی جاتی تھی۔ بعد میں چھوٹی برچھیاں بھی رائج ہو گئی تھیں۔ یہ حربہ حبشیوں سے لیا گیا تھا۔ سوار فوج کا سب سے بڑا ہتھیار نیزہ تھا۔ نیزہ اور تیر و کمان ہی گویا عربوں کے قومی ہتھیار تھے۔ مدافعتی زرہ بازنطینوں کی زرہ کے مقابلہ میں سبک ہوتی تھی اور اس میں جوشن اور سپر ہوتی تھی۔

فوجوں کی ترتیب قدیم طریقہ پر ہوتی تھی۔ تمام فوجوں کو قطار در قطار صفوں اور پروں میں ترتیب دیا جاتا تھا۔ لڑائی کی ابتدا مشہور اور نبرد آزما سورماؤں کے انفرادی مقابلوں سے ہوتی تھی۔ یہ اپنی صفوں سے آگے نکل نکل کر حریف فوجوں کے سورماؤں کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ عرب مجاہد کو اپنے حریف ایرانی یا بازنطینی سپاہی کے مقابلے میں جاں بازی کا صلہ زیادہ ملا کرتا تھا۔ اس کے سوا مالِ غنیمت میں بھی اس کا حصّہ ہوا کرتا تھا۔ جہاد نہ صرف اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ رفیع اور پسندیدہ پیشہ تھا بلکہ یہ معیشت کا سب سے زیادہ منفعت بخش ذریعہ بھی تھا۔ اسلامی فوجوں کی طاقت کا راز نہ توان کے ہتھیاروں میں پوشیدہ تھا اور نہ ان کی تنظیم کی عمدگی میں بلکہ یہ ان کے بلند ترین اخلاق اور سیرت کا اعجاز تھا جس کے بنانے میں ان کے دین کا حصّہ کچھ کم نہ تھا۔ یہ ان کی قوتِ برداشت کا کرشمہ تھا جو بادیہ نشینی نے ان کی فطرت میں ودیعت کر دی تھی۔ یہ ان کی حیرت انگیز سریع الحرکتی کا نتیجہ تھا جو بڑی حد تک شتر سواری نے ان میں پیدا کر دی تھی۔

عربی تاریخوں میں اسلامی تحریک کی جو "ملّایانہ" تعبیر کی گئی ہے اس میں بڑا زور اس کے تمام تر دینی تحریک ہونے پر صرف کیا گیا ہے، اور اس کے اندر جو معاشی عوامل کام کر رہے تھے ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایسے ہی اور اتنے ہی غلط دعوے بہت سے نصرانی مصنفوں نے کیے

ہیں جن میں ان عرب مسلمانوں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک ہاتھ سے قرآن اور دوسرے ہاتھ سے تلوار پیش کیا کرتے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے باہر اور خاص کر یہودیوں اور نصرانیوں کے سلسلے میں ایک تیسری چیز بھی کام کر رہی تھی، اور یہ فاتحوں کے نقطۂ نظر سے قرآن یا تلوار کے بدل سے بھی زیادہ پسندیدہ بدل —— خراج تھا۔

| | |
|---|---|
| قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ | اہل کتاب جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ |
| لَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا | قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام |
| حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ | سمجھتے ہیں جن کو خدا اور اس کے رسول نے |
| دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ | حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے |
| حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ | ہیں، اُن سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت |
| صَاغِرُونَ۔ (۲۹:۹) | ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں۔ |

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک نیا نعرۂ جنگ اور اجماع کا ایک نیا نقطہ پیش کیا۔ اس نے ایک موزوں جماعتی تصور کی بنیاد رکھی ہے۔ بے شبہ اس نے ایسی پراگندہ آبادی کو ایک مرکز پر جمع کیا جو اس سے پہلے کبھی یکجا جمع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک زبردست سیلانی طاقت بھی پیدا کر دی لیکن فتوحات کی تنہا یہی چیزیں ذمہ دار نہ تھیں۔ معاشی احتیاج کے سوا مذہبی جنون کوئی ایسی چیز نہ تھی جو بدوی غولوں کو (کیونکہ فوج کے بیشتر سپاہی بدوی قبیلوں سے بھرتی کیے جاتے تھے) اپنے بے آب و گیاہ مرز بوم کی حدود سے نکال کر شمال کے زرخیز خطوں میں کھینچ لے جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں جنت کے تصور نے بھی بعضوں کو متاثر کیا ہو۔ لیکن ہلال نما شاداب سرزمین کے متمدن خطوں کی تن آسانیوں اور عیش سامانیوں کی تمنا بھی بہتوں کا دل گرما رہی تھی۔ اسلام کی وسعت و اشاعت سے ان منتشر جماعتوں کی غیر مرعی وطن پذیری کی آخری منزل کا پتہ چلتا ہے جو عرب کے بے آب و گیاہ ریگستان کے متصلہ شاداب خطوں میں سالہا سال سے جاری تھی۔ اور یہ سامیوں کی آخری اور مہتم بالشان

تو طن پذیری تھی۔

وہ تمام وقائع نگار جنھوں نے اسلامی فتوحات کے واقعات کا مطالعہ ان کے انجام و نتائج کی روشنی میں کیا ہے، ہمیں یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ اسلام کی تمام جنگی مہمیں پہلے خلفاء۔ خاص کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فراست اور مدبرانہ رہبری میں مرتبہ منصوبوں کا نتیجہ تھا لیکن تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات کی ابتداء کرنے والوں نے پہلے ہی سے ان کے راستے کی پیش بینی بھی کر لی ہو۔ اسلامی جنگی مہمیں محتاط اور منضبط تخمینوں اور پیش بینوں ہی کا نتیجہ نہیں تھیں۔ چونکہ باہمی جدال و قتال کی حرمت اسلام میں صادر ہو چکی تھی اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ ان مہموں کی ابتداء قبیلوں کی جنگجویانہ اسپرٹ کے لیے نئی راہیں پیدا کرنے کی خاطر لوٹ مار کی صورت میں ہوئی ہو، کیونکہ اکثر لڑائیاں محض مال غنیمت کے لیے لڑی گئی ہیں اور اس وقت کسی ملک پر مستقل قبضہ و تصرف کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ مشین بنائی تھی وہ خود اس کے بنانے والوں کے قابو سے باہر ہو گئی۔ جب مجاہد فتح پر فتح حاصل کرنے لگے تو جہاد کی تحریک درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اسی زمانہ میں منظم معرکے شروع ہوئے اور ناگزیر طور پر عرب سلطنت عالم وجود میں آئی اس طرح عرب سلطنت کی تخلیق ابتدائی منصوبوں کی بہ نسبت بعد کے حالات کی رہینِ منت ہے۔

عبرانی تاریخ کی تورانی تعبیر اور قرون وسطیٰ میں نصرانی تاریخ کے فلسفہ کی طرح اشاعت اسلام کے متعلق 'تائید ربانی' کا 'ملّایانہ' یا دینیاتی نقطۂ نظر غلط لسانیاتی اساس پر مبنی ہے۔ اسلام کی اصطلاح کو تین معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے :- ابتداء میں اسلام کی حیثیت ایک دین کی تھی۔ اس کے بعد اسلام ایک مملکت بن گیا اور آخر میں اسلام نے ایک ثقافت کی صورت اختیار کر لی۔ یہودیت اور قدیم بدھ مت کے برخلاف اسلام، نصرانیت کی طرح ایک تبلیغی اور جارحانہ دین ثابت ہوا۔ آخرکار اس نے ایک مملکت قائم

کرلی۔ اسلام نے شمالی منطقوں کو فتح کیا تھا، لیکن یہ دین اسلام کی فتح نہیں بلکہ اسلامی مملکت کی فتح تھی۔ عربوں نے ایک انجان دنیا پر قومی حکومت الٰہیہ کے ارکان کی حیثیت سے اچانک دھاوا بول دیا تھا۔ فتح کا سہرا سب سے پہلے جس کے سر بندھا تھا وہ بڑی حد تک عربیت تھی، اسلام نہ تھا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری تک بھی شام وعراق اور ایران کے عوام دین اسلام قبول نہیں کر پائے تھے۔ مسلمانوں کے فوجی تسلط کے ایک مدت دراز کے بعد ان علاقوں کی آبادی نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی ایک بڑی وجہ خود ان کا ذاتی مفاد تھا — جزیہ کی ادائی سے بچنا اور حکمران طبقہ میں ضم ہوجانا۔ ثقافت کی حیثیت سے اسلام نے اپنی فوجی فتوحات کے بعد پھلی پھولی گذری ہوئی شامی، ارمنی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں کی بنیاد پر اپنا قصر استوار کیا ہے۔ اسلام کی بدولت مشرق قریب کو نہ صرف اپنا کھویا ہوا سیاسی اقتدار ہی واپس مل گیا اقلیم ثقافت میں بھی اسے اپنا قدیم ذہنی تفوق بھی دوبارہ حاصل ہوگیا۔

دوسرے ملکوں کی تسخیر پر کمر باندھنے سے پہلے خود ملک عرب کا آپ منظم و متحد ہونا ضروری تھا۔ وہ اس تنظیم اور اتحاد کا سامان کر ہی رہا تھا کہ وہ یک بیک حضرت محمدؐ کی جانشینی یعنی خلافت کے دشوار مسئلہ سے دوچار ہوگیا۔

جب تک حضرت محمدؐ زندہ رہے آپ نبی، قانون ساز، دینی پیشوا، منصف اعلیٰ، سپہ سالار اور صدر مملکت کے جملہ فرائض اکیلے انجام دیتے رہے۔ لیکن اب حضرت محمدؐ وفات پا چکے تھے۔ منصب نبوت کے سوا آپ کے تمام فرائض کو ادا کرنے والا آپ کا جانشین یا خلیفہ کون ہو؟ نبی کی حیثیت سے حضرت محمدؐ نے انسانیت تک خدا کا آخری پیام پہنچا دیا تھا، اس لیے آپ کے بعد نبوت کسی اور کو نہ مل سکتی تھی۔

رسول اللہ نے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ صرف آپ کی ایک صاحبزادی حضرت علیؓ کی بی بی فاطمہ آپ کے بعد زندہ تھیں۔ لیکن عرب میں حکمرانی یا شیخ کا منصب بالکل موروثی

نہ تھا۔ یہ بڑی حد تک انتخابی چیز تھی اور اس کا انحصار قبائلی کلدنیت پر تھا۔ یعنی قبیلہ کا معمر آدمی اس منصب کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر حضرت محمدؐ کے صاحبزادے زندہ بھی ہوتے تو آپ کی جانشینی کا مسئلہ آسانی کے ساتھ طے نہیں ہوسکتا تھا۔ خود حضرت محمدؐ نے بھی واضح طور پر اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا۔ خلافت کا مسئلہ ان تمام مسائل میں سب سے زیادہ قدیم ہے جن سے اسلام کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ مسئلہ آج بھی موجود اور متنازع فیہ ہے سلطانی طریقِ حکومت کی موقوفی کے سولہ مہینے بعد مارچ ۱۹۲۴ء میں کمالی ترکوں نے قسطنطنیہ میں خلافت عثمانیہ کو ختم کردیا۔ اس وقت منصب خلافت پر سلطان عبدالمجید ثانی فائز تھے۔ اس زمانے سے لے کر اب تک قاہرہ اور مکہ میں کئی اسلامی کانفرنسیں رسول اللہ کے حقیقی جانشین کے انتخاب کے لیے منعقد کی گئیں لیکن ان کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا۔ اسلام کے متنازع فیہ مسائل میں خلافت سے بڑھ کر کوئی اور مسئلہ جدال و قتال کا باعث نہ بنا"

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے جب کوئی اہم مسئلہ غور و فکر کے لیے جمہور کے آگے پیش کیا جاتا ہے تو جمہور میں خیالات کے اعتبار سے مختلف جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی صورت حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد پیش آئی۔ خلافت کی دعویدار دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت مہاجرین کی تھی جس کا دعویٰ تھا کہ ہمارا تعلق رسول اللہ کے قبیلہ سے ہے اور سب سے پہلے ہم ہی نے رسول اللہ کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ دوسری جماعت مدینہ کے انصار کی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو ایسے نازک موقع پر اپنے پاس پناہ دی تھی کہ بظاہر ان کے لیے اور کوئی سہارا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بعد میں یہ دونوں جماعتیں صحابہ میں سے ایک جماعت کو منتخب کرنے کے لیے یکجا ہوئیں۔ اس وقت وہ لوگ جو رسول اللہ کی جانشینی کو موروثی سمجھتے تھے، آگے بڑھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسول مومنوں کی جماعت کو کسی انتخاب کرنے والی جماعت کے خیال اور ان کی مرضی پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ضرور ایسی ہدایتیں

موجود ہونی چاہئیں جن میں کسی خاص شخص کو رسول اللہ نے اپنا جانشین مقرر کیا ہوگا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ صرف رسول اللہ کے عم زاد بھائی اور آپ کی ایک ہی بقید حیات صاحبزادی کے شوہر حضرت علیؓ جن کا شمار سب سے پہلے ایمان لانے والے دو تین مسلمانوں میں ہوتا تھا رسول اللہ کے واحد جائز جانشین ہو سکتے تھے۔ صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جو اصولِ انتخاب کے برخلاف نیابت الٰہی کی حامی تھی۔ امرائے قریش یعنی بنی امیہ جن کے ہاتھوں میں اسلام سے پہلے دولت اور قوت کی باگ ڈور تھی لیکن جو اسلام لانے میں سب سے آخر تھے، اپنے آپ کو خلافت کا جائز حقدار سمجھتے تھے۔

اس کشمکش میں کامیابی پہلی یعنی مہاجرین کی جماعت کو ہوئی۔ سن رسیدہ اور متقی حضرت ابوبکر جو رسول اللہ کے خسر اور اولین ایمان لانے والے تین چار مسلمانوں میں تھے، سب سے پہلے خلیفہ منتخب ہوے۔ اور اکابر شیوخ نے جو اس جلسہ میں موجود تھے، ان کے ہاتھ پر بیعت کی حضرت ابوبکر کے بعد خلفاء راشدین کی فہرست میں علی الترتیب عمر، عثمان اور علی کے نام شریک ہیں۔ یہ چاروں خلفاء رسول اللہ کے قریب ترین صحابی اور رشتہ دار تھے۔ اور ان کی زندگیاں رسول اللہ کی زندگی کے فیضان سے اتنی اثر پذیر ہو چکی تھیں کہ ان کے اعمال اور خیالات میں اسی نور کا اثر اور اس کی جھلک نمایاں رہی۔ مدینہ اسلام کا صدر مقام قرار پایا۔

عرب وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ جیسے ہی حضرت محمدؐ کا انتقال ہوا، ارضِ حجاز کے سوا سارا عرب نو قائم شدہ مملکت سے ٹوٹ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع آمد و رفت کی قلت، منظم تبلیغی طریقوں کی غیر موجودگی اور وقت کی کمی کے باعث رسول اللہ کی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کا صرف ایک تہائی حصہ ہی اسلام قبول کر پایا تھا۔ حتیٰ کہ حجاز نے بھی، جو قریب ترین میدان عمل تھا، آپ کی وفات کے سال دو سال پہلے تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

مسلسل کئی چھوٹی لیکن سخت لڑائیوں کے بعد حضرت ابوبکر نے مرتدوں کو یکے بعد دیگرے زیر کیا۔ فوج کی قیادت خالد بن ولید کے ہاتھ میں دی گئی اور انہوں نے فوجی قیادت کے جوہر

خوب ہی دکھائے۔ جلد ہی اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ مجتمع ہوگیا اور وہ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوگیا

سب سے پہلے جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں واقع ملک شام کی باری آئی۔ تقریباً ایک ہزار سال سے بازنطینی اس ملک کو رومیوں اور سکندر کا ورثہ سمجھتے چلے آرہے تھے۔ ان کے سرداروں کو اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ عرب کے رہزن جو اس وقت معمول سے زیادہ اپنی سرحدوں سے آگے نکل کر ان کے علاقوں پر چھاپے مارنے لگے تھے، شتر سوار چھاپے مارنے والوں سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں۔ لیکن اُنہیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ان کا دشمن ایک نئی قوت کا حامل اور ایک نئے ہتھیار۔ نقل مقام کی اعلیٰ صلاحیت ۔۔ کا مالک ہے لڑائیوں میں عربی اونٹ ایک ناقابل مزاحمت عنصر کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ عرب فوجیں بازنطینیوں سے مغلوب ہو رہی تھیں کہ ایسے میں خالدؓ "سیف اللہ" کو ان کی کمک پر جانے کا حکم ملا۔ حکم ملتے ہی خالد نے ایک آزمودہ کار جمعیت کے ساتھ اونٹوں پر لمبی لمبی منزلیں مارتے زیریں عراق سے لق و دق صحراء کو پار کیا اور ڈرامائی تیزی کے ساتھ شام کے صدر مقام دمشق کے نواح میں آدھمکے۔ فوجوں کے لیے پانی "مشکیزوں" میں لایا گیا۔ کھلنے کے لیے بوڑھے اونٹ ذبح کیے گئے اور ان کے پیٹ سے جو پانی نکلا اس نے گھوڑوں کے لیے گویا پانی کے ذخیروں کا کام دیا۔ دو ہفتوں کے بعد پوری عرب فوج کو اپنے زیر کمان لیے خالدؓ شہر کے دروازے پر آپہنچے۔

دمشق جس کی شہر پناہ سے اپنی فرار کی یادگار رات کو پالؔ ایک ٹوکری کے ذریعہ نیچے اتارا گیا، روایتوں کی رو سے دنیا کا قدیم ترین شہر مانا جاتا تھا۔ بہت جلد یہ شہر اسلامی مملکت کا صدر مقام بننے والا تھا۔ اس نے اب کوئی چھ مہینے کے محاصرے کے بعد ہار مان لی۔ اس کے بعد دوسرے شہر شطرنج کے مہروں کی طرح یکے بعد دیگرے فاتحوں کی زد میں آتے چلے گئے۔ ابھی ایک اور لڑائی باقی تھی۔ مشرقی مملکت کے حکمراں ہرقل نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر بھیجا۔ خالد نے ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو اپنے حریف

کی نصف تعداد ہی کے ساتھ دریائے یرموک کی وادی میں، جو اردن کا ایک معاون ہے، اس لشکر کا مقابلہ کیا۔ یہ دنیا کے بنجر ترین مقاموں میں سے ایک مقام تھا۔ اس روز گرمی انتہائی پر تھی اور آندھی کی وجہ سے فضا گرد و غبار سے اٹ گئی تھی۔ عرب فوجوں کے قائد نے بظاہر یہ دن بڑی دانائی اور تدبر کے ساتھ منتخب کیا تھا۔ مذہبی مقتداؤں کے رجز اور دعاؤں اور ان کی صلیبوں کی موجودگی کے باوجود عرب کے ان صحرائی فرزندوں کے ہولناک دھاووں کے سامنے بازنطینی فوجوں کی کوششیں ناکام رہیں اور بازنطینیوں کی بزم طرب مقتل بن گئی۔ اب کوئی طاقت اسلامی فوجوں کی سدِ راہ نہ تھی۔ ان کا بے پناہ سیلاب ملک شام کی قدرتی حدود یعنی جبال طورس تک بڑھتا ہی چلا گیا۔

اپنے زمانے کے سب سے زیادہ طاقتور حکمراں کے ہاتھوں سے ایسے اہم علاقہ کا اتنی تیزی اور اتنی آسانی کے ساتھ چھین لینا ایک ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا کی نظروں میں اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کا مرتبہ بڑھا دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اس کو اپنی تقدیر پر بھروسہ پیدا ہوگیا۔ اب شام کے مرکز سے آرمینیہ، شمالی عراق، گرجستان اور آذربائیجان پر دھاوا کرنا ممکن ہوگیا تھا۔ چنانچہ بعد میں زمانہ دراز تک ایشائے کوچک کے خلاف یہیں سے چھاپے مارے گئے اور یہیں سے حملے ہوتے رہے۔

اس کے بعد جب اللہ کے مجاہدوں نے ایران کا رخ کیا تو یہاں بھی انھوں نے ایسی ہی پھرتی دکھائی اور وہی حربی چال اختیار کی۔ ۶۳۷ء میں ساسانیوں کا جرار لشکر گرد و غبار کے ایک طوفانی دن منتشر اور پارہ پارہ ہوگیا۔ اس کے بعد زیریں عراق اور دجلہ کے مغرب کا زرخیز علاقہ حملہ آوروں کے لیے کھلا تھا۔ اپنی مخصوص پھرتی اور دلیری کے ساتھ مسلمان آگے بڑھتے گئے اور دجلہ کو ایک پایاب مقام سے عبور کیا۔ موسم بہار کے سیلابوں سے یہ دریا کافی پھیل گیا تھا۔ اس کے باوجود کچھ اس کمال سے دریا کو عبور کیا گیا کہ ایک بھی سپاہی کی جان ضائع نہ گئی۔ شامیوں کی طرح عراقیوں نے بھی نو واردوں کا استقبال کیا۔ شامی اور عراقی

دونوں اپنے اپنے دیرینہ حکمرانوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے اور انہیں اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اگرچہ یونانی اور ایرانی ثقافتیں شام اور عراق کے سر جبراً و قہراً منڈھی گئی تھیں لیکن یہاں کے بسنے والوں نے ان ثقافتوں کو کبھی بھی پوری طرح نہ اپنایا تھا۔ شہنشاہ ایران اور اس کی فوجوں نے لڑے بھڑے بغیر اپنا دار السلطنت تسیفون (مدائن) خالی کر دیا، اور مسلمان اس حصۂ ایشیا کے عظیم ترین شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے۔ شہنشاہ ایران کو اس کی رعایا کے ایک آدمی نے اس کے تاج کے جواہرات کے لالچ میں قتل کر ڈالا۔ ایرانی شہنشاہیت مسلسل بارہ سو سال سے قائم و دائم چلی آ رہی تھی، ساسانی شہنشاہ کے قتل کے ساتھ ہی اس شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور پھر آنے والے کوئی آٹھ سو سال تک یہ شہنشاہیت ابھر نہ سکی۔

اب پہلی بار بنجر عرب کے رہنے والوں نے زندگی کے عیش اور آرام دیکھے۔ ایران کا شاہی محل اپنی وسیع بارگاہ، حسین محرابوں اور بیش بہا پرتکلف آرائشوں کے ساتھ جزیرہ نمائے عرب کے مٹی کے مکانوں کے مقابلہ میں ایک نہایت تلخ اور ناگوار فرق و امتیاز پیش کر رہا تھا۔ اس زمانے میں عربوں کی تعلیم دینی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی اور جیسا کہ ایسی صورتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے ان کی تعلیم کا یہ زمانہ مضحکہ خیز واقعات سے خالی نہ تھا۔ عربوں نے کافور کبھی دیکھا نہ تھا، اس پر انہیں نمک کا دھوکا ہوا، اور اسے کھانے میں ڈال لیا۔ عرب فوج کے بعض سپاہی سونے سے ناواقف نکلے، اور اس کو چاندی سے بدلنے کے لیے دوڑے۔ ایک سپاہی نے ایک امیر خاندان کی لڑکی کو جو مال غنیمت کی صورت میں اس کے حصہ میں آئی تھی صرف ایک ہزار درم میں بیچ ڈالا، اور اس پر ملامت ہوئی تو جواب دیا "مجھے کیا معلوم کہ دس سو سے بھی زیادہ گنتی ہوتی ہے!"

ایک بار عراق کی سرحد پار کر لینے کے بعد ایران خاص میں حملہ آوروں کو سخت مقاومت سے دوچار ہونا پڑا اور ملک پر پوری طرح قبضہ پانے کے لیے دس سال درکار ہوئے۔ ایرانیوں کا تعلق آریائی نسل سے تھا اور سامی نسل سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ میدان کارزار میں

میں ایک اعلیٰ منظم فوجی طاقت لے کر آئے تھے جو پچھلے چار سو سالوں سے بھی زیادہ مدت سے رومی طاقت کے ساتھ مسلسل زور آزمائی کرتی چلی آرہی تھی۔ لیکن اس نے بھی یہاں گھٹنے ٹیک دیے۔ ۶۴۳ء میں عرب ہندوستان کی سرحدوں پر پہنچ گئے۔

ادھر تو مشرق میں مسلمانوں کی فاتحانہ پیش قدمی جاری تھی ادھر ایسے ہی مغرب میں بھی ان کا سیلاب بڑھتا جاتا تھا۔ شام اور حجاز سے خطرناک حد تک لگے ہوئے مصر کو اہم حربی موقف حاصل تھا۔ زمین کی زرخیزی نے اس ملک کو قسطنطنیہ کی حکومت کے لیے غلہ کا گودام بنا رکھا تھا۔ اس کا صدر مقام اسکندریہ حقیقت میں بازنطینی بحریہ کا مرکز تھا اور مصر باقی شمالی افریقہ کے لیے گویا دروازے کا کام دے رہا تھا ـــ ان تمام باتوں نے اپنے پھیلاؤ کے ابتدائی دور ہی میں عربوں کی آنکھیں اشتیاق کے ساتھ وادیِ نیل کی سرزمین کی طرف پھیر دی تھیں۔ اپنے نامور رقیب خالد سے بازی لے جانے کے لیے عمرو بن العاص نے ۶۳۹ء میں چار ہزار سواروں کو لے کر فلسطین سے سمندر کے کنارے کنارے اسی پامال راستے سے مصر کا رُخ کیا جسے کسی زمانہ میں حضرت ابراہیم، ایرانی شہنشاہ کمبوجیہ، اسکندر، انطیوخوس، بی بی مریم اور حضرت عیسیٰ روند چکے تھے۔ بعد میں نپولین اور جمال پاشا کو بھی اسی راستے پر سے گزرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ دنیائے قدیم کی بین قومی شاہراہ تھی۔

چشمِ فلک نے پھر وہی نظارہ دیکھا۔ ایک جلسۂ طرب ـــ محاصرہ اور پھر فتح و کامرانی کا ولولہ انگیز نعرہ ـــ اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

اب کی بار بابل بھی فتح ہو چکا تھا۔

عمرو بن العاص کے لشکر میں عرب سپاہی جوق در جوق بھرتی ہوتے گئے۔ اور جب لشکر کی کی تعداد بیس ہزار کے قریب پہنچ گئی تو ایک صبح وہ مصر کے صدر مقام اور اس کی سب سے بڑی بندرگاہ اسکندریہ کی بظاہر ناقابلِ تسخیر شہر پناہ کے سامنے نظر آئے۔ یہاں ایک طرف فلک بوس سراپیم کھڑا تھا، جس میں کبھی سراپیس کا ہیکل اور اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ دوسری جانب

سینٹ مارک (مرقس نبی) کا حسین کلیسا واقع تھا۔ اس میں پہلے قیصر کا ہیکل تھا جسے قلوپطرہ نے جولیس سیزر کی یادگار میں بنانا شروع کیا تھا اور آگسٹس نے مکمل کیا تھا۔ دور مغربی جانب قلوپطرہ سے منسوب دو سُرخ مینار نظر آرہے تھے۔ حالانکہ انہیں طوطمس سوم نے ۱۴۵۰ق م میں قائم کیا تھا۔ پتھر کے یہ مخروطی مینار وہی ہیں جو آج لندن میں دریائے ٹیمز کی بندرگاہ اور نیویارک کے سنٹرل پارک کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ پس منظر میں روشنی کا مینار جو بجا طور پر دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ دن میں سورج کی شعاعوں کو منعکس کرتا اور رات میں اپنی روشنی فضائے بسیط میں پھیلاتا کھڑا تھا۔ کچھ عجب نہیں اس منظر کا عربوں کے دل و دماغ پر وہی اثر پڑا جو کسی نووارد پر عہد حاضر کے نیویارک کی اسکائی لائن عمارتوں اور فلک بوس دو کشوں کو دیکھنے سے ہوا کرتا ہے۔

اسکندریہ کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار کی فوجِ گراں موجود تھی اور اس کے پیچھے بازنطینی بحریہ کی پوری قوت موجود تھی جس کا مرکز خود شہر اسکندریہ تھا۔ اس پوری قوت کے مقابلہ میں حملہ آور نہ صرف تعداد ہی میں بہت کم تھے بلکہ ساز و سامان کے اعتبار سے بھی وہ کسی شمار میں نہ تھے۔ ان کے پاس ایک بھی جہاز نہ تھا، قلعہ شکن آلات نہ تھے اور سپاہیوں کے لیے غذا کی بہم رسانی کا کوئی فوری وسیلہ بھی موجود نہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود ایک سال کے اندر ہی خلیفہ عمرؓ کی بارگاہ میں جو اس وقت مدینہ میں خلیفہ ہو گئے تھے، ان الفاظ میں فتح مصر کی نوید بھیجی گئی:-

"امابعد، میں نے شہر فتح کر لیا۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے سے میں احتراز کرونگا۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اس شہر میں چار ہزار محل، چار ہزار حمام، چالیس ہزار محصول ادا کرنے والے یہودی اور چار سو شاہی تفریح گاہیں ہیں۔ ان سب پر میں نے قبضہ کر لیا ہے!"

خلیفہ نے اس فتح کی خبر لانے والے قاصد کی تواضع روٹی اور کھجور سے فرمائی اور مسجد نبوی

میں سادہ لیکن پُرشکوہ نماز شکرانہ ادا کی۔۔۔ الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر!

بلی پولس (فسطاط) میں جس جگہ عمرو بن العاص کا خیمہ نصب تھا وہاں نئے صدر مقام کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ مقام آج بھی قاہرۂ قدیم کے نام سے موجود ہے۔ یہاں فاتح مصر نے ایک سیدھی سادی مسجد بنائی تھی جو مصر کی پہلی مسجد تھی۔ آج بھی یہ مسجد اپنی مرمت شدہ حالت میں باقی چلی آرہی ہے۔

یہ قصہ مشہور ہے کہ عمرو بن العاص چودہ مہینے کی طویل مدت تک اسکندریہ کے کتب خانے کی کتابوں کو شہر کے مختلف حماموں کی بھٹیوں میں ایندھن کے طور پر جلواتے رہے یہ قصہ بالکل من گھڑت اور بے بنیاد ہے۔ اس سے دلچسپ افسانہ طرازی تو ہوتی ہے لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے یہ خرافات کے سوا اور کچھ نہیں۔ بطلیموسی کتب خانہ کو جولیس سیزر نے ۴۸ ق م ہی میں نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور کتب خانہ کو جس کا نام "چھوٹا کتب خانہ" تھا، ایک رومی شہنشاہ تھیوڈوسس کے فرمان کی بنا پر سنہ ۳۸۹ء میں برباد کر دیا گیا جس زمانے میں عربوں نے اسکندریہ کو فتح کیا اس وقت وہاں کوئی مشہور کتب خانہ موجود نہ تھا۔ اور نہ اس وقت کے کسی مورخ ہی نے یہ الزام عمرو بن العاص یا عمر فاروق پر لگایا ہے۔

مصر کی فتح نے ان بازنطینی صوبوں کے دروازے بالکل کھول دیے جن کے ڈانڈے مصر کی سرحدوں سے ملے ہوئے تھے۔ اب کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی تھی۔ اسکندریہ فتح ہو جانے کے بعد عمرو بن العاص اپنی فوج کے پچھلے حصے کو پچھانے کے لیے سوار فوج کو لے کر اپنی مخصوص سرعت کے ساتھ مغرب کی جانب بڑھے۔ ان کی یلغار نے افریقہ کے شمالی ساحل سے لے کر بلاد بربر کے شہر طرابلس تک رسول اللہ کا پرچم لہرا دیا اور وہ وقت اب کچھ زیادہ دور نہیں تھا جبکہ یہ علم طرابلس سے بھی آگے کے اقطاعِ عالم پر لہرانے والا تھا۔

---

# ۷۔ خلافت

تاریخ کا ایک محبوب موضوع ایسی نوخیز اور غیر مہذب قوموں کی داستان ہے جو اپنی تازہ دم قوت سے کسی پرانے تمدن پر غالب آجاتی ہیں اور نئی تہذیب سے مسحور ہو کر بالآخر اس کی عیش سامانیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اب ہم قوم عرب کی ایسی ہی داستان سنانے والے ہیں

عرب کی شاداب ہلال نما سرزمین اور دیارِ مصر و ایران کی فتوحات سے ساری دنیا کے قدیم ترین تمدنی مرکز عربوں کے قبضہ و تصرف میں آ گئے۔ آرٹ ہو کہ فن تعمیر، فلسفہ ہو کہ طب، سائنس ہو کہ ادب، حکومت ہو کہ سیاست، غرض زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اصلی عرب یعنی بدوی اس قابل نہ تھے کہ وہ دوسروں کو کچھ سکھا سکتے۔ ہر قدم پر وہ خود اوروں کے محتاج تھے۔ پھر ان تمام چیزوں کے سیکھنے کی کتنی رغبت، کتنے ذوق اور کتنی شیفتگی کا انہوں نے مظاہرہ کیا! اس سے پہلے عربوں میں تحقیق اور جستجو کا ایسا ولولہ پیدا نہ ہوا تھا اور ان کی مخفی قوتیں کبھی اتنی بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ اور ایک بار جب ان قوتوں نے اپنا کرشمہ دکھایا تو پھر مسلمان عربوں نے اپنی مفتوحہ قوموں کی امداد سے ان تمام چیزوں کو سیکھا، انہیں اپنایا اور پھر انہیں اپنا رنگ دے کر اپنا ذہنی اور جمالیاتی ورثہ پیش کرنا شروع کیا۔ طیسفون (مدائن)، دمشق، یروشلم اور اسکندریہ میں انہوں نے بڑے بڑے معماروں، فن کاروں، جوہریوں اور صناعوں کی کاریگری کے کارنامے دیکھے، ان کی داد دی اور آپ خود بھی ان کے قدم بقدم چلنے لگے۔ قدیم ثقافت کے ان تمام مرکزوں میں وہ آئے، تہذیب و تمدن کی رنگینیوں سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں — وہ اپنا دل ہار بیٹھے۔

آج ہم جس تمدن کو "عربی تمدن" کہتے ہیں وہ نہ تو اصل کے اعتبار سے عربی تھا اور نہ اپنی اساسی ترکیب کے لحاظ سے اور نہ علم الانسان کے بنیادی اصولوں کے تحت وہ عربی کہلا

سکتا ہے۔ اس تمدن میں عربوں کا مخصوص حصہ لسانی اور ایک حد تک دینی علوم کا حصہ ہے۔ جس طرح مفتوح یونانیوں نے علم وشائستگی میں فاتح رومیوں کی رہبری کی تھی بالکل اسی طرح خلافت کے پورے دور میں شامی، ایرانی، مصری اور دوسری قوموں جیسے نومسلم نصرانی اور یہودی علم وشائستگی کے مشعل بردار بنے رہے۔ عربوں کا اسلامی تمدن اپنی اصل کے اعتبار سے یونانی، آرامی اور ایرانی تمدن کا امتزاج تھا۔ اسی تمدن نے خلافت کی سرپرستی میں فروغ پایا اور عربی زبان کے ذریعہ اس کی اشاعت ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں عربی تمدن ہلال نما شاداب خطہ کے قدیم سامی تمدن کا منطقی تسلسل تھا جس کی داغ بیل بابل کے اشوریوں اور فنیقیوں، آرامیوں اور عبرانیوں نے ڈالی تھی اور اسے پروان چڑھایا تھا۔ اسی تمدن کے ذریعہ مغربی ایشیا کے بحر روم کے تمدن کی وحدت کو اپنا انتہائی عروج نصیب ہوا۔

ہمیں پہلے دو خلفا، یعنی حضرت ابوبکر (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) اور حضرت عمر (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) کی ذات میں اس خاص کردار کا ممتاز نمونہ نظر آتا ہے جسے عرب دنیا کے آگے پیش کر رہا تھا۔ عرب کے فاتح اور متحد کرنے والے حضرت ابوبکر نے ایک سردار قبیلہ کی سی سیدھی سادی زندگی بسر کی۔ جب آپ خلیفہ منتخب ہوئے، اس وقت آپ السنح کے ایک معمولی مکان میں اپنی بیوی حبیبہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اپنے مختصر سے دور خلافت کے ابتدائی چھ مہینوں تک آپ فرائض خلافت انجام دینے کے لیے روزانہ السنح سے مدینہ آتے جاتے رہے۔ اس زمانے میں اسلامی مملکت کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے آپ کو کوئی وظیفہ نہیں ملتا تھا، مملکت کے سارے کاروبار آپ مسجد نبوی کے صحن میں انجام دیتے تھے۔

حضرت ابوبکر کے جانشین حضرت عمر بڑے ذکی، بڑے فریس، مستعد اور صاحب عمل آدمی تھے۔ آپ کی زندگی سادی اور بڑی محتاط تھی۔ آپ بہت اونچے اور مضبوط جسم کے آدمی تھے خلیفہ ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک آپ تجارت کے ذریعہ اپنی گزر بسر کرتے رہے۔ ایک بدوی شیخ کی زندگی کی طرح آپ کی زندگی بھی نمود و نمائش اور ظاہری طمطراق سے پاک تھی۔ حضرت عمر کا نام اسلامی روایات کے اعتبار سے

عظمت و شہرت میں حضرت محمدؐ کے نام کے بعد ہی آتا ہے۔ آپ کے زہد و تقویٰ، آپ کی عدل گستری اور آپ کی بزرگانہ سادگی کی مسلمان مصنفوں نے حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔ وہ آپ کے نام کو ان تمام اوصاف و فضائل کا نمونہ سمجھتے ہیں جن سے ایک خلیفہ کو متصف اور بہرہ ور ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس صرف ایک قمیص اور ایک تہمد تھا۔ اور ان میں بھی کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپ کھجور کی چٹائی پر سویا کرتے تھے، آپ کو دین حق کے قیام، عدل و انصاف کے استقرار اور اسلام اور عربوں کی حفاظت و ترقی کے سوا کسی اور چیز کی فکر و انگیز نہ رہتی تھی عربی ادب آپ کی سخت گیری کے قصّوں سے معمور ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک صاحبزادے کو شراب پینے اور بدکاری کی سزا میں اتنے کوڑے لگائے کہ ان کا کام تمام ہو گیا۔ ایک بار آپ بہت غصّہ میں تھے، ایسے میں ایک بدوی آپ کے پاس کسی شخص کے ظلم و ستم کے خلاف فریاد لے کر آیا۔ آپ نے اُسی کے کوڑے لگوائے۔ پھر جب غصّہ کم ہوا تو آپ اپنے کیے پر بے حد نادم ہوئے اور بدوی سے درخواست کی کہ وہ بھی آپ کے اتنے ہی کوڑے لگائے لیکن بدوی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ اپنے گھر لوٹے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔

"اے ابن الخطاب! تو بے حیثیت تھا، اللہ نے تجھے عزت بخشی۔ تو گمراہ تھا، اللہ نے تیری رہبری کی۔ تو عاجز تھا، اللہ نے تجھے طاقت عطا کی۔ اس نے تیرے لوگوں کی گردنوں پر حکومت کرنے کے لیے تجھ کو چنا، اور جب ان میں کا ایک آدمی تجھ سے مدد مانگنے کے لیے آیا تو تو نے اس کو مارا۔ کل جب تو خود اپنے رب کے سامنے جائیگا تو اس وقت تو کیا جواب دیگا!"

یہ بات قابل غور ہے کہ ایسے وقت جب کہ آپ اپنے منتہائے عروج پر تھے ایک عجمی نژاد نصرانی غلام نے زہر آلود خنجر سے آپ کو شہید کر ڈالا۔

حضرت عمرؓ کے جانشین حضرت عثمانؓ نے بارہ سال تک حکومت کی۔ اور خود مسلمانوں نے ایک شورش کے دوران میں آپ کو شہید کر ڈالا۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کو اگرچہ عملاً پوری

دنیائے اسلام نے اپنا خلیفہ مان لیا تھا، لیکن جلد ہی ایک جماعت آپ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی، اور پھر ان خاندانی لڑائیوں کی بنیاد پڑی جنھوں نے اسلام کو اپنی آگ میں لپیٹ لیا، اور کبھی کبھی تو اُنھوں نے اس کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں پانچ سال کے بعد حضرت علیؓ بھی ایک زہر آلود تلوار کے ذریعہ شہید کر دیے گئے۔

ہمیں یہاں اس عام مغالطے سے بچنا چاہیے کہ خلافت ایک دینی عہدہ تھا۔ اس سلسلہ میں مقدس رومی شہنشاہیت اور کیتھولک کلیسا کی امارت سے جو تشبیہیں دی جاتی ہیں وہ گمراہ کن ہیں۔ مسلمانوں کے سپہ سالار کی حیثیت سے خلیفہ کے فوجی عہدہ پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ امام کی حیثیت سے خلیفہ مسلمانوں کو نماز پڑھا سکتا تھا اور پڑھاتا بھی تھا، اور جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتا تھا لیکن یہ کام ایسا تھا کہ اس کو معمولی سے معمولی مسلمان بھی انجام دے سکتا تھا۔ حضرت محمدؐ کی جانشینی (خلافت) سے مراد اقتدارِ اعلیٰ کی جانشینی کے ہیں۔ اللہ کے نبی، مہبطِ وحی اور رسول ہونے کی حیثیت سے حضرت محمدؐ کا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا تھا۔ دین سے خلیفہ کا تعلق صرف اتنا ہی تھا کہ وہ اس کا محافظ اور اس کا نگراں ہوتا تھا۔ خلیفہ دین کی حفاظت اور مدافعت اس طرح کرتا تھا جیسی کہ کسی یورپی شہنشاہ سے توقع کی جا سکتی تھی۔ خلیفہ رفض و ارتداد کا قلع قمع کرتا، کافروں اور بے دینوں کے خلاف جنگ کرتا، "دارالسلام" کی سرحدوں کو وسعت دیتا اور پھیلاتا تھا۔ اور ان سب مقاصد کی بجا آوری میں وہ اپنی دنیوی فوج کی طاقت سے کام لیتا تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپ میں اس قسم کا کوئی تصور پایا ہی نہیں جاتا تھا کہ مسلمان خلیفہ کی حیثیت ایک طرح کے پوپ کی سی ہے جس کو دنیا جہان کے مسلمانوں پر روحانی اقتدار حاصل ہے۔ عبدالحمید ثانی ایک مدبر سیاسی حکمراں تھا۔ اس کے زمانے میں یورپی حکومتیں ایشیا اور یورپ کی اکثر اسلامی مملکتوں پر قابض و متصرف ہو گئی تھیں۔ اس لیے عبدالحمید نے ان یورپی حکومتوں کے پاس اپنا موقف قوی تر بنانے کی خاطر تصورِ خلافت سے بڑی دانائی

کے ساتھ استفادہ کیا تھا۔ پچھلی صدی کے آخر میں ایک مبہم سی تحریک کی ابتداء ہوئی جس نے پان اسلامیزم یا اتحاد بین المسلمین کے نام سے نصرانی حکومتوں کے خلاف ایک حد تک اتحادِ عمل پیدا کرنے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ یہ تحریک ترکی سلطنت سے شروع ہوئی تھی۔ اس نے خلافت کے اس ہمہ گیر پہلو کو بیجا اہمیت دے دی۔

حضرت علی کے مقابلہ میں خلافت کے ایک دعویدار شام کے فرماں روا حضرت معاویہ تھے۔ یہ حضرت علی کے بنی اعمام میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے اقتدارِ اعلیٰ کے اصول نے ایک نیا چولا بدلا۔ خلافت ایک ایسے سلسلۂ حکمرانی میں مبدل ہوگئی جس کی بنیاد ہی اصولِ وراثت پر رکھی گئیں حالانکہ اب تک موقتی انتخاب کے اصول پر عمل ہوتا رہا تھا۔ اس زمانہ میں تین ذی اثر خاندان سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک خاندان تو بنی اُمیہ کا تھا جس کی ابتداء ۶۶۱ء میں دمشق میں حضرت معاویہ کی خلافت سے ہوئی تھی۔ دوسرا خاندان عباسیوں کا تھا جو بغداد میں برسر اقتدار آیا اور ۷۵۰ء سے لے کر ۱۲۵۸ء تک قائم رہا۔ تیسرا خاندان فاطمیوں کا تھا۔ اس نے ۹۰۹ء سے لے کر ۱۱۷۱ء تک فرمانروائی کی۔ فاطمیوں کا پایہ تخت قاہرہ تھا بنی اُمیہ کی ایک نامور شاخ اسپین میں ۹۲۹ء سے لے کر ۱۰۳۱ء تک حکومت کرتی رہی اس کا دارالحکومت قرطبہ تھا۔ خلافت کے ان تمام سلسلوں میں صرف فاطمی ہی ایسے تھے جو اولادِ علی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ خاندانی حکومت کے اصول سے مملکت میں سیاسی استحکام پیدا کرنا مقصود تھا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں شاید ہی کوئی ایسی طویل مدت گزری ہوگی جس میں داخلی فتنوں اور خونریزیوں نے اسلام پر مصیبت کے پہاڑ نہ توڑے ہوں اور ایسے بھی وقت آئے ہیں جب کہ خود خلیفۂ وقت دارالخلافۃ کو بھی اپنے قابو میں نہ رکھ سکا۔ حالانکہ وہ اسلامی مملکت کا صدر مانا جاتا تھا۔

حضرت معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے اُن میں ایک ایسی صدا بھی بلند ہوئی جس کی گونج بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ بعد کی تمام صدیوں میں سنائی

دیتی رہی۔ عراق نے حضرت علی کے صاحبزادے حضرت حسن کے بارے میں یہ اعلان کر دیا کہ وہی تخت کے جائز وارث ہیں۔ اہل عراق کی منطق یہ تھی کہ حضرت حسن گزرے ہوئے خلیفہ حضرت علی اور بی بی فاطمہ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ اور بی بی فاطمہ رسول اللہ کی ایک ہی صاحبزادی تھیں جو آپ کی وفات کے بعد بھی زندہ رہیں لیکن بدقسمتی سے رسول اللہ کے یہ نواسے ایک عرصے تک عیش و آرام کی زندگی گزار چکے تھے ان کی صلاحیتیں ملکی نظم و نسق کے میدانوں کے مقابلہ میں دوسرے میدانوں میں مصروف بکار تھیں۔ اگرچہ ان کی وفات پینتالیس سال کی عمر میں واقع ہوئی لیکن اس مدت میں وہ کم سے کم ایک سو نکاح کر کے اتنی ہی طلاقیں دے چکے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں "مطلاق" بہت زیادہ طلاق دینے والا — کا بالکل انفرادی لقب ملا تھا۔ بہرحال حضرت حسن اپنی حقیقی قابلیت سے کبھی ناواقف نہیں رہے۔ بڑی زندہ دلی کے ساتھ انہوں نے حضرت معاویہ کا تاحیات وظیفہ قبول کر لیا اور خلافت کی اُمیدواری سے دست بردار ہو گئے۔

آپ کے چھوٹے بھائی حضرت حسین حضرت معاویہ کے پورے دورِ حکومت میں مدینہ میں عزلت گزیں رہے۔ پھر جب ۶۰ھ میں آپ سے معاویہ کے بیٹے اور ان کے جانشین یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے کہا گیا تو آپ نے اس سے انکار کیا۔ اس کے بعد عراقیوں نے آپ کو اپنا جائز خلیفہ مان کر بار بار آپ کو عراق آنے کی پُرزور دعوت دی۔ آپ نے یہ دعوت قبول کر لی اور اپنے خاندان والوں اور چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے دسویں محرم ۶۱ھ کو جب آپ اپنے دو سو ساتھیوں کے قافلے کے ساتھ کوفہ سے شمال مغرب میں پچیس میل فاصلہ پر کربلا کے مقام پر پہنچے تو امویوں کے سپہ سالار عمرو بن سعد نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ آپ کو گھیر لیا۔ آپ سے یزید کی اطاعت کے لئے کہا گیا۔ لیکن آپ نے اس سے انکار کیا۔ چار ہزار سپاہیوں کی فوج نے آپ پر یورش کی اور کچھ عورتوں اور بچوں کے سوا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ حضرت محمدؐ کے نواسے کے جسم پر بے شمار زخم لگے

اوران کا سران کے جسد سے الگ کر کے یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ بعد میں یہ سر آپ کی بہن اور آپ کے صاحبزادے کے حوالے کر دیا گیا جو اس کے ساتھ دمشق بھیجے گئے تھے۔ پھر آپ کا سر اور جسد دونوں کربلا میں دفن کر دیے گیے۔ حضرت حسین کی شہادت کی یاد میں شیعہ مسلمان ہر سال محرم کے پہلے دس دنوں کو ماتم کے دن مانتے ہیں۔ ان دنوں میں مجلسیں ہوتی ہیں اور ایک طرح کا ڈراما ہوتا ہے جس میں آپ کی مصیبتوں اور آپ کے صبر کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

خلافت بنو امیہ کے بانی حضرت معاویہ غیر معمولی انتظامی قابلیت رکھنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے بظاہر ایک منتشر اور پراگندہ جماعت سے ایک شائستہ مسلم معاشرہ پیدا کیا اور اس کو فروغ دیا۔ تمام اسلامی معرکوں میں پہلی فوج ان ہی کی تھی جو نظم و ترتیب سے آراستہ ہو کر میدانِ کارزار میں آتی تھی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت معاویہ ہی نے رجسٹری کا سرکاری محکمہ قائم کیا اور انہوں نے ہی سب سے پہلے محکمۂ ڈاک۔ البرید۔ سے دلچسپی لی۔ یہی محکمہ بہت جلد خبر رسانی کا ایک بہترین نظام بنا اور اس نے مختلف اور دور دست اقطاعِ مملکت کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔

سیاسی شعور کو جس حد تک حضرت معاویہ کی ذات میں فروغ پانے کا موقع ملا، اس حد تک غالباً کوئی اور خلیفہ اس سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ ان کے عرب سوانح نگاروں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا حلم تھا۔ اور حلم سے مُراد مزاج کی نرمی یعنی ہر صورت میں پُرامن طریقہ استعمال کرنے اور صرف ناگزیر صورتوں میں ہی قوت سے کام لینے کی غیر معمولی صلاحیت کے ہیں۔ اپنی محتاط نرم مزاجی سے وہ اپنے حریف کے ہتھیار اور اپنے مخالف کو اپنے کیے پر شرمار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے مزاج کے دھیمے پن اور اپنے انتہائی ضبطِ نفس کی وجہ سے وہ ہر صورتِ حال پر غالب آجایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ "جہاں میرا کوڑا کافی ہو وہاں میں اپنی تلوار استعمال نہیں کرتا، اور جہاں

میری زبان کافی ہو وہاں اپنا کوڑا بھی استعمال نہیں کرتا۔ اپنے ساتھیوں سے مجھے چاہے ایک بال ہی سے کیوں نہ باندھا گیا ہو، میں اس بال کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ جب وہ کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں، اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو اس وقت میں کھینچتا ہوں"۔ یہاں ہم حضرت معاویہ کا ایک مکتوب نقل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خط انہوں نے حضرت حسن کو ان کی خلافت سے دست برداری کے موقع پر لکھا تھا: "میں تسلیم کرتا ہوں کہ خونی رشتہ کے اعتبار سے آپ اس منصبِ جلیلہ کے مجھ سے زیادہ اہل ہیں۔ اگر مجھ کو اس بات کا یقین ہوتا کہ آپ اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری میں مجھ سے بہتر صلاحیت رکھتے ہیں تو میں کسی پس وپیش کے بغیر آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں" اس کے ساتھ ایک سادہ کاغذ ملفوف تھا جس پر حضرت معاویہ کے دستخط ثبت تھے۔ اس کاغذ کی خانہ پری حضرت حسن کو کرنی تھی۔ مستقبل کے حریف حضرت معاویہ کے اس پیش کش سے طبعی طور پر مسخر ہو گئے۔

جیسا کہ بعد کے خلفاء نے کیا، حضرت معاویہ بھی بازنطینیوں سے شمشیر آزمائی کرتے رہے۔ اور دو بار آپ نے خود قسطنطنیہ پر چڑھائی کی۔ آپ کے عہد حکومت میں اسلامی بحریہ نے بازنطینی بحری قوت کو دعوتِ پیکار دی۔ اور ایشیائے کوچک کے ساحل سے پرے ایک خون آشام معرکے میں اسلام کو پہلی عظیم الشان بحری فتح حاصل ہوئی۔ قسطنطنیہ اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی ترکوں کے زمانے تک فتح نہ ہو سکا اور خود عربوں نے بھی ایشیائے کوچک میں مستقل طور پر اپنے قدم جمانے اور سمندر کو عبور کرنے کا سامان نہیں کیا۔ مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں کم سے کم مزاحمت نظر آئی ادھر ان کی عظیم ترین قوت کا رُخ پھر جاتا تھا۔ بیرونی ملکوں پر عربوں کی یلغار حضرت معاویہ کے دور میں پھر سے شروع ہو گئی۔

---

# ۸۔ اسپین کی فتح

مصر، شام، عراق اور ایران کی تسخیر پر اسلامی فتوحات کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد خانہ جنگیوں کا ایک مختصر دور آتا ہے اور پھر دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔

مشرق میں مسلمانوں کی طوفانی صفوں نے دریائے دجلہ کے اس پار جہاں فارسی اور ترکی بولنے والی ایرانی اور تورانی قوموں کے درمیان روایاتی حدِ فاصل قائم تھی اور اس کے آگے بیرونی منگولیا تک اسلامی پرچم لہرا دیا۔ بخارا، تاشقند اور سمرقند جیسے قدیم افسانوی شہروں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور وسطی ایشیا میں اسلام کی عظمت اور برتری اس قدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی کہ چینیوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک دوسرے مشرقی لشکر نے جنوب کی طرف اس علاقہ میں پیش قدمی کی جو آج کل بلوچستان کہلاتا ہے اور ۷۱۲ء میں دریائے سندھ کی زیریں وادی اور اس کے دہانہ پر مسلمانوں نے اپنا تسلط جما لیا پھر فتح کا دائرہ اور وسیع ہوا تو جنوبی پنجاب کے شہر ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ جہاں بدھ مت کا ایک مشہور معبد واقع تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے یہ سرحدی صوبے ہمیشہ کے لیے اسلامی بن گئے یہاں اسلام نے ایک نئی بدھی ثقافت سے اپنا ربط قائم کیا۔

شمال وسطی محاذ پر عربی فوج معمول کے مطابق قسطنطنیہ کی فصیلوں سے پھر ایک بار ٹکرائی۔ عرب اس دفعہ بازنطینی صدر مقام کا مسلسل ایک سال یعنی اگست ۷۱۶ء سے ستمبر ۷۱۷ء تک یادگار محاصرہ کیے پڑے رہے۔ اس معرکے میں عربی بحریہ کا راستہ خلیج باسفورس میں ایک زبردست زنجیر کے ذریعہ روک دیا گیا تھا۔

لیکن مغرب میں مسلمان آگے بڑھتے ہی گئے اور اسی طرف انہیں سب سے زیادہ شاندار فتح حاصل ہوئی۔ وہ شمالی افریقہ میں قرطاجنہ قدیم تک تو پہنچ ہی چکے تھے اور اب وہ اسلام

کے ایک زبردست سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے زیر کمان بربریں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بربروں کا تعلق سفید فام نسل کی حامی شاخ سے ہے اور غالباً ماقبل تاریخ زمانوں میں ان کی اور سامیوں کی اصل ایک ہی رہی ہے۔ ساحل کے اکثر بربر نصرانی ہو چکے تھے ترتلیانوس (Tertullian)، قبریانوس (St. Cyprian)، اور سب سے بڑھ کر اغسطینوس (St. Augustine) جن کا شمار اولین نصرانی اولیاء میں ہوتا ہے، اسی خاک سے اُٹھے تھے لیکن ساحل سے اندر کی طرف جو دیسی آبادی پھیلی ہوئی تھی اُس پر رومی یا بازنطینی تہذیب وتمدن کا کوئی گہرا اثر نہیں پڑا تھا۔ کیونکہ یہ ثقافت شمالی افریقہ کے ان خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش لوگوں کی ذہنیت سے ذرا بھی میل نہ کھاتی تھی۔

بربر قوم ثقافت کی جس منزل میں تھی ایسی قوموں کے لیے اسلام میں ایک خاص کشش پائی جاتی تھی۔ اور سامی عربوں نے اپنے حامی بنی اعمام کے ساتھ بہت جلد گہرے تعلقات قائم کر لیے۔ ایک نیم وحشی قوم کے مذہب کو اسلامی بنانے اور اس کی زبان کو عربی سانچے میں ڈھالنے میں پھر ایک بار اسلام نے اپنا اعجاز دکھایا۔ اس طرح مسلمان فاتحوں کا خون نئی نسلوں کے خون سے ملا، اسی امتزاج سے نئی نسلیں شاداب ہوئیں۔ عربی زبان کو فتح وکامرانی کا ایک وسیع میدان ہاتھ آیا، اور اُبھرتے ہوئے اسلام کو دنیوی عظمت اور سربلندی کی معراج تک پہنچنے کے لیے ایک نیا زینہ مل گیا۔

قرون وسطیٰ کی حربی تاریخ میں برق آسائی اور پوری پوری کامیابی کے لحاظ سے ہسپانیہ کی مہم کی کوئی نظیر دکھائی نہیں دیتی۔ اندلس پر پہلا حملہ جولائی ۷۱۰ء میں کیا گیا۔ اس حملہ میں چار سو پیدل سپاہی اور ایک سو سوار — جو سب کے سب بربر اور شمالی افریقہ میں اموی خلیفہ کے مقرر کیے ہوئے والی موسیٰ کے سپاہی تھے — اس چھوٹے سے جزیرہ نما (طریفہ) پر اترے جو اقلیم یورپ کا تقریباً انتہائی جنوبی سرا ہے۔

موسیٰ جو ۶۹۹ء میں افریقہ کا والی مقرر ہوا تھا، بازنطینیوں کو قرطاجنہ کے مغربی

علاقہ سے ہمیشہ کے لیے نکال باہر کر چکا تھا اور اب وہ بحرِ ظلمات کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا اور تسخیرِ یورپ کے لیے اسلامی مورچے اور دمدمے قائم کرتا چلا جا رہا تھا پہلے حملہ کی کامیابی اور اسپین کے وسقوطی (Visigothic) کے خاندانی جھگڑوں نے موسیٰ کے حوصلے بڑھا دیے اور فتح و کامرانی کی ترغیب سے زیادہ خواہش یغما کی شہ پاکر موسیٰ نے ۷۱۱ء میں اپنے آزاد کردہ بربر غلام طارق کو سات ہزار آدمیوں کے ساتھ جن میں بڑی تعداد بربروں کی تھی، اسپین کے اندر گھس جانے کا حکم دیا۔ طارق اس عظیم الشان چٹان یعنی جبل الطارق کے قریب اترا جس نے اس وقت سے اس کے نام کو حیاتِ جاوید بخش دی ہے۔ یہاں آبنائے کی چوڑائی صرف تیرہ میل رہ جاتی ہے۔ روایت ہے کہ ایک افسانوی شخصیت یعنی جولین کونٹ آف سیوٹا نے طارق کے لیے جہاز فراہم کیے تھے طارق کی فوجوں سے جن میں اب بارہ ہزار تک اضافہ ہو گیا تھا شاہ لذریق (Roderick) کی فوجوں نے جنزہ (Janda) کے کنارے دریائے بگّاہ (Salado) کے دہانے پر ۹ا جولائی ۷۱۱ء کو مقابلہ کیا۔ لذریق نے اپنے پیش رو غیطشہ (Witiza) کے لڑکے کو معزول کر کے خود تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اگرچہ وسقوطی لشکر کی تعداد پچیس ہزار تھی، لیکن اسلامی فوجوں نے اس کو شکست فاش دے دی۔ خود لذریق کا کیا حشر ہوا، یہ بات معمہ ہی بنی رہی۔ اسپینی اور عربی دونوں تاریخوں میں عام طور پر صرف یہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غائب ہو گیا۔

اس فیصلہ کن فتح کے بعد اندلس میں مسلمانوں کی یلغار ایسی ہو گئی جیسے وہ چمن کی روشوں پر ٹہل رہے تھے۔ صرف وہی شہر موثر مقاومت کر رہے تھے جن پر وسقوطی سردار قابض تھے۔ طارق نے لشکر کے بڑے حصہ کے ساتھ استجہ کے راستے دارالحکومت طلیطلہ جاتے ہوئے متصلہ شہروں کی تسخیر کے لیے فوجی دستے روانہ کیے۔ جنوب میں اشبیلیہ کو جس کا قلعہ نہایت مستحکم تھا، نظرانداز کر دیا گیا۔ فوج کے ایک دستے نے ارشیدونہ پر

قبضہ کرلیا۔ دوسرا دستہ البیرہ پر مسلط ہوگیا اور تیسرے دستہ نے جو سواروں پر مشتمل تھا، قرطبہ پر چڑھائی کردی۔ دو مہینے کے مسلسل محاصرے کے بعد مسلمانوں کا یہ آئندہ دارالحکومت کہتے ہیں ایک چرواہے کی غداری کی وجہ سے حملہ آوروں کے قبضہ میں آگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس چرواہے نے حملہ آوروں کو دیوار شہر کے ایک رخنہ کی نشاں دہی کی تھی۔ ملاغہ نے کوئی مزاحمت پیش نہیں کی۔ البیرہ جو اس مقام کے قریب واقع تھا جہاں آج غرناطہ واقع ہے، بڑی آسانی کے ساتھ فتح ہوگیا۔ اسپینی مہم کی سخت ترین لڑائی استجہ میں لڑی گئی اور نتیجۃً حملہ آور ہی شادکام رہے۔ وسقوطی حکمرانوں کا صدر مقام طلیطلہ چند یہودیوں کی سازش سے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس طرح طارق نے ۷۱۱ء کے موسم بہار میں اس مہم کی ابتدا ایک یورش کی صورت میں کی تھی، اور موسم گرما کے آخر تک وہ آدھے اسپین کا مالک بن چکا تھا۔ اس نے ایک پوری سلطنت تباہ کردی تھی۔

اپنے نائب کی اس غیر متوقع اور حیرت انگیز کامیابی پر خار کھا کر موسیٰ دس ہزار فوج کے ساتھ (جن میں سب کے سب عرب اور شامی تھے) جون ۷۱۲ء میں اسپین کی طرف جھپٹ پڑا۔ مدن، شذونہ، اور قرمونہ کے مستحکم قلعوں اور شہروں کو جنہیں طارق نے چھوڑ دیا تھا، موسیٰ نے اپنے نرغوں کے لیے منتخب کیا۔ اشبیلیہ جو اسپین کا وسیع ترین شہر اور علمی مرکز تھا، اور کسی زمانے میں رومی دارالحکومت بھی رہ چکا تھا، جون ۷۱۳ء تک محصور رہا۔ لیکن شدید ترین مقاومت کا سامنا ماردہ (Merida) میں ہوا۔ تاہم ایک سال کے محاصرہ کے بعد یہ شہر بھی پہلی جون ۷۱۳ء کو نرغہ کرکے فتح کرلیا گیا۔

طلیطلہ یا اس کے نواح میں موسیٰ، طارق سے ملا۔ کہتے ہیں یہاں موسیٰ نے اپنے نائب کو اس خطا پر کوڑے لگوائے اور زنجیریں پہنائیں کہ مہم کے ابتدائی دنوں میں اس نے طارق کو کہیں رک جانے کا حکم دیا تھا لیکن طارق نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ مگر فتح کا سلسلہ بڑھتا ہی رہا۔ بہت جلد اسلامی فوجیں شمال میں سرقسطہ پہنچ گئیں اور وہاں

سے سطوح مرتفع اراغون، لیون، استوریہ اور جلیقیہ تک بڑھ گئیں۔ اسی سال کے موسم خزاں میں خلیفہ ولید (۷۰۵ء۔۷۱۵ء) نے موسیٰ کو اسی جرم میں دمشق طلب کیا جس جرم کا الزام رکھ کر موسیٰ نے اپنے بربر ماتحت طارق کو تادیبی سزا دی تھی۔ والیٔ افریقہ ہونے کے اعتبار سے خلیفہ کے سوا موسیٰ کا کوئی اور حاکم بالادست نہ تھا۔

نئے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اپنے دوسرے لڑکے عبدالعزیز کے سپرد کر کے موسیٰ آہستہ آہستہ خشکی کے راستے شام کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں چار سو وسقوطی شہزادے جو موسیٰ کے عہدہ دار تھے، سروں پر تاج پہنے، کمر میں سنہری پٹکے باندھے، بے شمار غلاموں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ جو غنیمت کے بے حساب خزانوں سے لدے ہوئے تھے، موسیٰ کے ہم رکاب ہوئے۔ شمالی افریقہ میں سے مغرب سے مشرق کی طرف اس شاہانہ خدم و حشم اور اس فیروزمندانہ جلوس کے گزرنے کی کہانی عرب مورخوں کا دلچسپ اور پسندیدہ موضوع ہے۔ جب ہم اس جلوس کی تفصیلات پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے رومی جرنلوں کے قدیم فاتحانہ جلوسوں کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس اثرآفریں جلوس کی آمد آمد کی خبر جلوس سے پہلے دمشق پہنچ چکی تھی۔ جب موسیٰ فلسطین میں طبریہ کے مقام پر پہنچا تو اسے بیمار خلیفہ ولید کے بھائی اور ولی عہد سلیمان کے یہ احکام ملے کہ وہ دارالخلافہ پہنچنے میں ذرا تاخیر سے کام لے۔ مستقبل کا خلیفہ یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ اس دوران میں وہ مسند خلافت پر متمکن ہو جائیگا اور موسیٰ کے ورود سے اس کے جشن مسند نشینی کی رونق بڑھ جائیگی۔

فروری ۷۱۵ء میں موسیٰ اپنے وسقوطی سرداروں کے ساتھ جو ہیرے جواہرات سے آراستہ تھے، دمشق میں داخل ہوا۔ خلیفہ ولید نے اس کا بظاہر پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ عظیم الشان مسجد اموی کے صحن میں جس شان اور شکوہ کے ساتھ اس جلوس کا استقبال کیا گیا وہ اسلامی فتوحات کی تاریخ میں ایک نہایت درخشاں واقعہ ہے۔ پہلی بار یہیں مغرب کے

سیکڑوں شاہی خانوادے اور ہزاروں فرنگی قیدی امیر المومنین کی بارگاہ میں ہدیۂ اطاعت و پیمان وفاداری پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

موسیٰ نے فتح کے بے شمار تحفوں کے ساتھ ساتھ بارگاہِ خلافت میں وہ شاندار میز بھی پیش کی جس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس کو حضرت سلیمان کے ایک جن خادم نے بنایا تھا کہتے ہیں کہ یروشلم سے آرٹ کے اس شہ کار کو رومی لوٹ کر اپنے دار السلطنت میں لے آئے تھے۔ بعد میں وسقوطی فاتحوں نے اُسے رومیوں سے چھین لیا۔ اور ہر وسقوطی بادشاہ اس میز کو ہیرے جواہرات سے آراستہ کرنے میں اپنے پیش رو سے سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہ بے بہا گنجینہ ایک کلیسا میں رکھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے حملہ کے وقت ایک پادری اس کو لے کر فرار ہو رہا تھا کہ طارق نے اس کو پکڑ لیا۔ جب موسیٰ طلیطلہ میں طارق سے ملا اور اس کو تادیبی سزا دی تو اس میز کو بھی اس سے لے لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ طارق نے اس میز کا ایک پایہ چھپا لیا تھا اور خلیفہ کے سامنے ایک ڈرامائی طریقے سے اس نے اس پایہ کو اپنے ذاتی کارنامے کے ثبوت میں پیش کیا۔

دوسرے اور بہت سے کامیاب عرب سپہ سالاروں کو جس بدبختی سے دوچار ہونا پڑا ہے، وہی بدبختی موسیٰ پر بھی نازل ہونے والی تھی۔ ولید کے جانشین نے موسیٰ کو بہت ذلیل کیا۔ اس نے موسیٰ کو نہ صرف سزا کے طور پر اتنی دیر تک دھوپ میں کھڑا رکھا کہ وہ تھک کر چور چور ہو گیا بلکہ ولید نے اس کے سارے اختیارات بھی چھین لیے اور اس کی ساری املاک ضبط کر لی۔ اسپین اور افریقہ کے اس سن رسیدہ فاتح کے متعلق آخری معلومات صرف اتنی ہی ملتی ہیں کہ وہ حجاز کے ایک دور دست قریے میں بھیک مانگتا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

اب ہسپانیہ خلافت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس کا عربی نام اندلس رکھا گیا۔ اشتقاق کے اعتبار سے اس لفظ کا تعلق ونڈلوں (Vendals) کے نام سے ہے۔ جنہوں نے عربوں

سے پہلے اسپین پر قبضہ کیا تھا۔ جزیرہ نما کے شمال اور مشرق کے چند چھوٹے چھوٹے علاقوں کے سوا موسیٰ کے جانشینوں کو نہ کوئی اور علاقہ فتح کرنا تھا اور نہ کوئی شورش فرو کرنی تھی۔ اسپین کی فتح کے بعد سات سال کے مختصر سے عرصے میں قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا بہترین اور وسیع ترین صوبہ پوری طرح مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔ اب فاتحوں کو وہاں رہنا بسنا تھا ۔ کم سے کم صدیوں کے لیے!

مسلمانوں کی اس بے نظیر کامیابی اور فتح کے اسباب و علل معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بلکہ جو کچھ اوپر مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اس سے بھی یہ اسباب آسانی کے ساتھ معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ وسقوطی (مغربی گاتھ) جو ٹیوٹانی وحشیوں کی طرح پانچویں صدی کے ابتدائی حصے میں اسپین میں گھس آئے تھے۔ ان میں اور ہسپانوی رومی آبادی میں جو قومی اختلاف پایا جاتا تھا وہ ابھی تک پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ وسقوطیوں سے پہلے سوائی (Suevi) اور ونڈل (Vandals) قومیں اسپین پر قابض تھیں، اور یہ قومیں بھی چھاپے مارنے والے جرمانی غول تھے۔ انہیں اسپین سے بے دخل کرنے کے لیے وسقوطیوں کو عرصہ دراز تک سخت جد و جہد کرنی پڑی۔ وسقوطی حکمران مطلق العنان اور اکثر جابر تھے۔ وہ آریائی کنصرانیت کے پیرو تھے، یہاں تک کہ ری کرڈ (Recerde) نامی ان کے ایک بادشاہ نے ۵۸۶ء میں کیتھولک مذہب اختیار کر لیا جو دیسی باشندوں کا مذہب تھا کیتھولک مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے عوام مشرک وسقوطی حکمرانوں کی حکومت سے نفرت کرتے تھے۔ دیسی باشندوں میں ایک بڑا طبقہ زرعی غلاموں اور عام غلاموں کا بھی تھا جو فطرتاً اپنی پُر آلام زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ غلاموں کے اس طبقہ نے بھی حملہ آوروں کے ساتھ تعاونِ عمل کر کے ان کی کامیابی و کامرانی میں اپنا بھی کچھ حصہ ادا کیا ہوگا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں پھر آبادی میں یہودی عنصر بھی موجود تھا جس کو قوطی (Gothic) تاجداروں کے مظالم نے ساری قوم سے الگ کر رکھا تھا۔ ۶۱۲ء میں ایک شاہی

فرمان کے ذریعہ یہودیوں کا مذہب جبراً تبدیل کرانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اس فرمان میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اگر کوئی یہودی بپتسمہ نہ لے تو اس کی ساری جائداد ضبط کرلی جائے اور اس کو جلاوطن کر دیا جائے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب مسلمان حملہ آور اسپین کے اندرونی علاقوں میں آگے بڑھ رہے تھے تو بہت سے مفتوحہ شہروں کو کیوں ان یہودیوں کی تحویل میں دے دیا جارہا تھا۔

اس کے سوا یہ بات بھی یاد رہے کہ خود قوطی تاجداروں اور ان کے امیروں کے باہمی سیاسی جھگڑوں نے اندرونی جھگڑوں کے ساتھ مل کر مملکت کی بنیادیں کھوکھلی کردی تھیں یہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں قوطی امیر اپنے اپنے صوبوں میں خودمختار ہو گئے تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کی یورش اور ایک غاصب امیر کی تخت نشینی یہ دونوں واقعات ایک ہی وقت میں پیش آئے تھے اور معزول بادشاہ کے رشتہ داروں نے ایسے نازک موقع پر بے تامل غاصب کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیرلیں۔ غیطشہ کا اخیلا (Achila) طلیطلہ کی فتح پر بڑے بھولے پن سے یہ سمجھ رہا تھا کہ عرب صرف اس کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ جب اس کی طلیطلہ کی جائداد بحال کردی گئی تو اسی پر وہ خوش ہو گیا اور یہاں بڑی شان وشوکت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے چچا پادری آویاس (عباس) کو دارالسلطنت کا اسقف اعظم کا عہدہ عطا کیا گیا۔ جہاں تک سبتہ کے والی جولین کا تعلق ہے اس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عربی فوجوں کو اس نے کشتیاں فراہم کی تھیں۔ عربوں کی فتح کے سلسلہ میں جو خدمات اس نے انجام دی تھیں اس میں بڑے مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔

اسپین اور فرانس کے درمیان جو آخری رکاوٹیں رہ گئی تھیں ان میں سے ایک سرقسطہ کی فتح سے دور ہو گئی لیکن جبال البرانس (Pyrinees) کے پہاڑی سلسلہ کی رکاوٹ اب بھی باقی تھی۔ موسیٰ نے ان پہاڑوں کو کبھی عبور نہیں کیا۔ تاہم بعض عرب وقائع نگار موسیٰ

کو یہ اعزاز بھی عطا کرتے ہیں کہ اس نے نہ صرف اس پہاڑی سلسلہ کو عبور کیا بلکہ ارض فرنگ (فرانس) میں سے گزرتے ہوئے قسطنطنیہ کے راستے دمشق پہنچ کر امیر المومنین کی دست بوسی کا شرف حاصل کرنے کی تمنا بھی اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اگرچہ اس وقت یورپ کے متعلق عربوں کی جغرافیائی معلومات زیادہ وسیع نہ ہونگی۔ تاہم سرزمین یورپ میں لڑتے بھڑتے اپنا راستہ بنا لینے کا سودا ضرور ان کے دماغوں میں سمایا ہوگا حقیقت میں یہ موسیٰ کا تیسرا جانشین الحر ابن عبدالرحمن الثقفی ہی تھا جس نے ۷۱۷ء یا ۷۱۸ء میں سب سے پہلے اس پہاڑی سلسلہ کو عبور کیا۔

ایک طرف فرانس کی خانقاہوں اور کلیساؤں کے بیش بہا جواہرات کی طمع نے الحر کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچا تو دوسری طرف میروفینجی (Merovingian) دربار کے امیروں اور اکوتانیا (Aquitain) کے ڈیوکوں کی باہمی لڑائیوں نے اس کے حوصلے بڑھا دیے۔ چنانچہ اس نے سرزمین یورپ پر اپنے درپے حملے شروع کر دیے جو اس کے جانشین السمح بن مالک الخولانی کے زمانے میں بھی جاری رہے۔ ۷۲۰ء میں السمح پچھلی وسقوطی سلطنت کے تابع علاقے سبتمانیا (Septimania) پر قابض ہوگیا اور اربونہ کو بھی فتح کر لیا۔ اربونہ کی گڑھی کو بعد میں عربوں نے ایک بڑا قلعہ بنا دیا۔ اور اس میں اسلحہ اور اناج کے گوداموں کے ساتھ ساتھ ہتھیار بنانے کا ایک کارخانہ بھی قائم کر دیا۔ لیکن اسی سال السمح نے ڈیوک اکوتانیا کے صدر مقام تولوز کو فتح کرنے کی جو کوشش کی وہ موثر مقاومت کے باعث ناکام رہی۔ یہاں السمح نے "جام شہادت نوش کیا" یعنی وہ جنگ میں غیر مسلموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ پہلی بڑی کامیابی تھی جو ایک جرمانی تاجدار کو مسلمانوں پر حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربوں نے جبال البرانس کے اس پار جو کچھ کارروائیاں کی ہیں ان کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا۔

شمال کی جانب آخری اور سب سے بڑی مہم السمح کے جانشین عبدالرحمن بن عبداللہ

الغافقی والیٔ ہسپانیہ کی سرکردگی میں روانہ ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن نے مغربی جبال البرانس سے پیش قدمی کی اور ۷۳۲ء کے موسم بہار کی ابتدا میں اس نے پہاڑی سلسلہ کو عبور کر لیا۔ دریائے غارون کے کنارے ڈیوک ایوڈس (Eudes) کو مکمل شکست دیتا ہوا عبدالرحمٰن آگے بڑھا اور بوردو پر دھاوا بول دیا۔ اس نے وہاں کے کلیسا کو آگ لگا دی۔ شہر بواتیہ (Poitiers) کی فصیل کے باہر ایک باسلیقی کلیسا کو جلانے کے بعد وہ شمال میں تور (Tours) تک بڑھ آیا۔ چونکہ غالون کے مسیحی مبلغ سینٹ مارٹن کی آخری آرام گاہ اسی تور میں واقع ہے اس لیے غالون کے نزدیک اس مقام کی حیثیت ایک مذہبی صدر مقام کی سی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سینٹ مارٹن کے مزار کے بیش بہا نذرانوں اور چڑھاووں کا شوق ہی حملہ آوروں کو کشاں کشاں تور تک لے آیا تھا۔

یہاں تور اور بواتیہ کے درمیان دریائے کلین اور دریائے وینے کے سنگم پر عبدالرحمٰن کا چارلس مارٹل کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ چارلس مارٹل میروفینجی دربار کا میر محلات تھا۔ اس کے اثر و نفوذ اور اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایوڈس نے اس سے مدد مانگی تھی۔ چارلس نے اپنا لقب دوربین "مارٹل" اختیار کیا تھا۔ مارٹل کے معنی ہتوڑے کے ہیں اور یہ لقب چارلس کو زیب بھی دیتا تھا کیونکہ وہ شجیع اور بہادر تھا اور اپنے کئی مخالفوں کو نیچا بھی دکھا چکا تھا۔ چارلس نے ایوڈس کو جو کونٹین میں خودمختارانہ فرمانروائی کر رہا تھا اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شمالی فرانکوں کے برائے نام اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ چارلس مارٹل، ہرسٹل کے پے پن کا ناجائز بیٹا تھا۔ نام کے اعتبار سے نہ سہی لیکن کام کے اعتبار سے تو وہ ضرور بادشاہ تھا۔

ایک مغربی مورخ لکھتا ہے کہ مسلسل سات روز تک عرب فوجیں عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں اور فرنگی فوجیں — جن میں بیشتر سپاہی پیدل اور بھیڑیے کی کھالیں لپیٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے ژولیدہ بال شانوں پر لٹک رہے تھے — چارلس کی سرکردگی میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے لڑائی کلبے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں معمولی جھڑپیں بھی

ہوتی رہیں۔ آخر کار ماہ اکتوبر ۷۳۲ء میں ہفتہ کے دن سالارِ عرب نے حملہ میں پہل کی جب لڑائی اپنی انتہائی شدت کو پہنچی تو افرنگی سپاہی ایک جوفی مربع کی صورت میں جمع ہو کر شلانسی تنابلیلہ ایک مغربی مصنف کے الفاظ میں دیوار کی طرح مضبوط و مستحکم اور ایک برفانی قالب کی طرح بے لچک کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں کا سبک رسالہ افرنگیوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ افرنگیوں نے پیچھے ہٹے بغیر تمام حملہ آوروں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ مقتولوں میں خود عبدالرحمٰن بھی شامل تھا۔ آخر کار رات کی تاریکی نے حریفوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ دن نکلا تو اسلامی کیمپ میں سکوت طاری تھا۔ چارلس کو شبہ ہوا کہ دشمن نے کوئی چال چلی ہے۔ اس نے حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے جاسوس چھوڑے۔ رات کے پردے میں عرب اپنے خیموں کو چھوڑ کر چپکے سے میدان جنگ سے روانہ ہو گئے تھے۔ فتح و فیروزمندی کا سہرا چارلس کے سر رہا۔

جس دن تور کی جنگ جیتی گئی ہے اس کے بارے میں بعد میں افسانے گھڑے گئے اور اس کی تاریخی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا۔ نصرانیوں نے اس فتح کو اپنے دائمی دشمن کی فوجی بخت آوری کا ایک نقطۂ انقلاب سمجھا۔ گبن اور اس کے بعد کے مورخوں کا یہ خیال ہے کہ نصرانیوں کی بجائے اگر اس دن عرب فتح و ظفر سے ہم کنار ہوتے تو پیرس اور لندن میں جہاں کلیسا کھڑے ہیں وہاں وہ مسجدوں کو آباد دیکھتے۔ اور آکسفورڈ اور دوسری جامعات میں انجیل کی بجائے تفسیر قرآن کے درس ہوتے۔ موجودہ زمانے کے بہت سے مورخ تور کی اس لڑائی کو تاریخ کی ایک فیصلہ کن جنگ مانتے ہیں۔

لیکن سچ پوچھیے تو تور کی جنگ نے کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کیا۔ عرب بربر سیل جو اپنے مبداء جبل الطارق سے تقریباً ایک ہزار میل دور نکل آیا تھا، ایک فطری ٹھراؤ پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنا زورِ حرکت کھو چکا اور تھک چکا تھا۔ عبدالرحمٰن کی فوج دو نسلی عناصر پر مشتمل تھی۔ ان دونوں عنصروں کا باہمی رشک و حسد اور آپس کے اختلافات بھی اس فوج کی اخلاقی حالت پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ خود عربوں میں بھی عزم و احساس کی ہم آہنگی مفقود

ہو چلی تھی۔ یہ سچ ہے کہ تور میں مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ لیکن دنیا ان کے پے در پے یورشوں کے نظارے کہیں اور بھی دیکھ رہی تھی۔ مثلاً اُنھوں نے سنہ ۷۳۴ء میں افینیون (Avignon) پر قبضہ کرلیا اور نو سال بعد لیون (Lyons) کو تباہ وتاراج کردیا اور وہ اربونہ (arbonne) سے جو ان کی فوجی کارروائیوں کا مرکز تھا، سنہ ۷۵۹ء تک بھی دستکش ہونے نہیں پائے تھے۔ اگرچہ تور کی شکست کو عربی سیلاب کے تھم جانے کا اصلی سبب قرار نہیں دیا جاسکتا تاہم اس شکست نے فتح مند اسلامی فوجوں کی فتوحات کی بعید ترین حد بندی ضرور کردی تھی

سنہ ۷۳۲ء کے اختتام کے ساتھ ساتھ حضرت محمد کی وفات کے بعد کی پہلی صدی ختم ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کے پیرو یعنی مسلمان ایک ایسی سلطنت فتح کرچکے تھے جس کا دامن ایک طرف خلیج بسکے اور دریائے سندھ اور حدود چین تک اور دوسری طرف بحیرۂ خوارزم سے بالائی نیل تک پھیلے ہوئے تھے۔ شہر دمشق اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام بن گیا تھا۔ اسی شہر کے بارے میں حدیثوں میں آیا ہے کہ اپنی نوعمری میں حضرت محمد کو اس شہر میں داخل ہونے میں تامل تھا کیونکہ آپ صرف ایک ہی بار جنت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ناف شہر میں اموی خلفاء کا جگمگاتا پرشکوہ قصر شاہی کھڑا تھا۔ یہ قصر ان سرسبز وشاداب میدانوں کے نظاروں پر چھایا ہوا تھا جو جنوب میں دائمی برف پوش جبل الشیخ تک پھیلے ہوئے چلے گئے تھے۔ یہ محل خاندان بنو اُمیہ کے بانی خلیفہ معاویہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے قریب ہی جامع اموی واقع تھی جس کو ولید نے جدید طریقے سے آراستہ کرکے اسے طرز تعمیر کا ایک ایسا نگار خانہ بنا دیا کہ آج بھی حسن کے شیدائی اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ محل کے دیوان عام میں ایک مربع وضع کی نشست تھی اس پر انتہائی زرنگار منقش گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا خلیفہ کا تخت یا مسندِ خلافت تھی جس پر وہ رسمی درباروں کے موقع پر لانبی عبا پہنے زانو بچھا کر بیٹھتا تھا۔ خلیفہ کی دائیں جانب اس کے بنی اعمام اور بائیں جانب بنی اخوان بزرگی کے اعتبار سے درجہ بدرجہ ایک قطار میں کھڑے ہوتے تھے۔ ان

کے پیچھے ندیم، مصاحب، شعراء اور فریادی ہوتے تھے۔ ان رسمی درباروں سے زیادہ اہم دربار جامع اموی میں منعقد ہوا کرتے تھے جس کا شمار آج بھی دنیا کی سب سے زیادہ شاندار عبادت گاہوں میں ہوتا ہے۔ ایسے ہی دربار میں خلیفہ ولید نے فاتحان اسپین موسیٰ اور طارق کا خیر مقدم کیا ہوگا جو اپنے بے شمار قیدیوں اور بیش بہا جواہرات کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہوئے ہونگے۔ اس وقت اسلام کا عروج اپنی انتہا کو اور اسلام کا پہلا شاہی خاندان اپنے جاہ و جلال کے سب سے اونچے درجے پر پہنچ چکا تھا۔

---

# ۹۔ معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا آغاز

ہم اپنی داستان کا پہلا حصہ ختم کر چکے۔ اب اسلامی فتوحات کا دور تمام ہوا۔ اگرچہ اسلامی سلطنت کی شمع حیات کے گل ہونے تک اس کے اندر مسلسل اور لامتناہی لڑائیاں بپا ہوتی رہیں، لیکن اب ہم اپنے قلم کا رُخ جنگ و پیکار اور فتح و ظفر کی داستان کے بجائے اسلامی سلطنت کی ثقافتی ترقی، ادب، سائنس، طب، آرٹ اور فن تعمیر کی ترقی کی ایک نہایت ہی بلند پایہ اور کئی لحاظ سے ولولہ انگیز داستان کی طرف پھیرتے ہیں۔ اب ہم وہ دل لبھانے والی سرگزشت سنانا چاہتے ہیں کہ جب تلوار کی ظفر مندیاں تمام ہو جاتی ہیں تو کس طرح انسان مختلف ثقافتوں کے ایک دوسرے میں گھل مل جانے سے اپنے ذہنِ رسا کی فیروز مندیاں دکھاتا ہے۔

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں دمشق والوں کی جو عام طرز معاشرت تھی وہ موجودہ دمشق کی طرز معاشرت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ آج کل کی طرح اس وقت بھی اہل دمشق چوڑے چکلے پاجاموں، سُرخ نکیلے جوتوں، اور بڑے بڑے عماموں کے ساتھ اپنے شہر کی تنگ اور مسقف شاہراہوں پر ڈھیلے ڈھالے جبے پہنے اور سر پر عقال باندھے ہوئے دھوپ میں جھلسے ہوئے بدّیوں اور کبھی کبھار یورپی پوشاک میں ملبوس کسی افرنجی یا افرنگی (اہل یورپ کو اب بھی افرنجی کہا جاتا ہے) سے کاندھا چھوتے گزرتے دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں امرائے دمشق خوش حال دمشقی، سفید عبا زیب تن کیے، تلوار یا برچھے سے لیس، گھوڑے پر سوار نظر آجاتے ہیں۔ کچھ عورتیں منہ پر نقاب ڈالے سڑکوں اور شاہراہوں کو عبور کرتی اور بعض چوک اور بازاروں سے متصل بلند مکانوں کی جالیدار دریچوں سے جھانکتی نظر آتی ہیں۔ شربت اور مٹھائی بیچنے والے اس زور شور سے صدا لگاتے ہیں گویا راہ گیروں اور ریگستان اور کھیتوں سے لائی جانے والی طرح طرح کی پیداوار سے لدے پھندے بے شمار

گدھوں اور اونٹوں کی چاپ سے پیدا ہونے والی آواز پر بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ شہر کی فضا میں ہر طرح کی بو ملیگی۔ خوش بو اور بدبو۔ ہر قسم کی اور ہر نوع کی خوشبو اور بدبو جو زیر آسمان پائی جاتی ہے!

دنیا کے اور شہروں کی طرح عربی شہر میں قبائلی اعتبار سے مختلف محلے ہوتے تھے۔ دمشق حمص، حلب اور دوسرے شہروں میں یہ محلے اب بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر گھر کا دروازہ سڑک کی طرف سے صحن میں کھلتا تھا جس کے وسط میں عام طور پر پانی کا ایک بڑا حوض ہوتا تھا اور حوض میں ایک فوارہ لگا ہوتا تھا۔ فوارے سے پانی کی ایک ہلکی نقاب جیسی پھوار برستی رہتی تھی۔ حوض کے پاس نارنج یا لیمو کا ایک درخت بھی لگا ہوتا تھا۔ صحن کے چاروں طرف کمرے ہوتے تھے اور بڑے بڑے مکانوں کے صحنوں میں غلام گردشیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ امویوں نے دمشق میں آب رسانی کا ایک ایسا نظام قائم کیا تھا کہ اس عہد کی مشرقی دنیا میں اس سے بہتر نظام کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ آج بھی یہ نظام آب رسانی دمشق میں کام دے رہا ہے۔ اس نظام نے امویوں کو عظمتِ دوام عطا کی ہے۔

پوری سلطنت میں سماجی اعتبار سے آبادی چار طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سب سے اعلیٰ طبقہ ظاہر ہے حکمراں مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ سب سے اونچا درجہ خاندانِ خلافت اور فاتح امرائے عرب کو حاصل تھا اس طبقہ کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم حمص اور دمشق میں اس کی تعداد بیس ہزار سے پینتالیس ہزار تک تھی۔

عرب مسلمانوں کے بعد ان مسلمانوں کا درجہ تھا جو یا تو زبردستی مسلمان بنائے گئے تھے یا خود انہوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو عملاً نہ سہی نظری اعتبار سے اسلامی شہریت کے تمام حقوق حاصل تھے۔ مسلمانوں کو کوئی خراج ادا کرنا نہیں پڑتا تھا۔ یہاں عربوں کی قبیلہ واری عصبیت کچھ اس درجہ شدید تھی اور نظری مطالبات پر کچھ ایسی غالب آگئی تھی کہ ان مطالبات کا پورا ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ بنی اُمیہ کے پورے دورِ حکومت

میں زمینداروں سے چاہے وہ مسلم ہوں کہ غیر مسلم، زمین کا لگان وصول کیا جاتا رہا۔ زمینداروں کا اسلام قبول کر لینا بھی بے شبہ سلطنت کی آمدنی کی کمی کا ایک سبب تھا۔

ان نومسلموں کا درجہ "موالی" کے درجے تک گھٹا دیا گیا تھا اور اسلامی معاشرے کا سب سے ادنیٰ طبقہ ان ہی لوگوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ لوگ اپنی اس عرفی حیثیت سے سخت بیزار تھے۔ ہم جو ان لوگوں کو ایسی کئی تحریکوں میں حصہ لیتے دیکھتے ہیں جیسی کہ ایران میں خارجیوں اور عراق میں شیعیوں نے چلائی تھیں اور جن سے مسلسل ہنگامے اور کشت وخون ہوتا رہا۔ اس کا سبب یہی طبقاتی تنفر تھا۔ تاہم، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، ان میں سے بعض فرقے مذہبی حیثیت سے شاہوں سے زیادہ شاہی کے مستحق، ٹھہرے۔ نئے دین کے لیے ان کا جوش وخروش جنون کی حد تک بڑھ گیا اور وہ غیر مسلموں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ قدیم مسلمانوں میں سب سے زیادہ متعصب وہی لوگ ہوتے تھے جو نصرانیت اور یہودیت سے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔

اسلامی معاشرے میں فطری طور پر سب سے پہلے ان ہی موالی نے علوم وفنون کی تحصیل وتحقیق کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ کیونکہ یہی لوگ دوسروں کے مقابلے میں ثقافت کی دیرینہ روایات کے حامل تھے۔ جیسے جیسے یہ علمی میدان میں مسلمان عربوں سے کہیں آگے بڑھے ویسے ویسے سیاسی میدان میں بھی عربوں سے ان کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ فتح مند عربوں کے ساتھ ان لوگوں کے باہمی شادی بیاہ کی وجہ سے عربی خون کی خصوصیات اتنی کم ہوتی چلی گئیں کہ آخر کار مخلوط نسلوں میں عربی عنصر کا کوئی نمایاں جوہر باقی نہیں رہا۔

تیسرا طبقہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ اور صابئین پر مشتمل تھا جس سے مسلمانوں نے معاہدے کیے تھے۔ انھیں ذمی کہا جاتا تھا۔ اہل کتاب کو اسلحہ سے دست بردار ہونے اور اسلامی حفاظت کے بدلے میں خراج ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان مذاہب کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا حضرت محمدؐ کی ایک اہم سیاسی جدت تھی اور یہ جدت بڑی حد تک اس احترام کا نتیجہ تھی جو رسول اللہ انجیل کا کیا کرتے تھے، اور ایک حد تک ان تعلقات پر بھی مبنی تھی جو بعض نصرانی

قبائل کے اشراف کے ساتھ استوار کیے گئے تھے۔

ذمّی اپنی عرفی حیثیت کے لحاظ سے بہت بڑی حد تک محصول ذاتِ اور محصولِ اراضی کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیے جاتے تھے، حتیٰ کہ دیوانی اور فوجداری مقدمات میں بھی (بجز اس کے کہ کوئی مسلمان ان میں ایک فریق کی حیثیت رکھتا ہو) یہ لوگ عملاً اپنے روحانی پیشواؤں کے تحت ہوتے تھے۔ اسلامی قانون اتنا محترم تھا کہ وہ ان لوگوں پر ناقابل انطباق ٹھہرا۔ یہ عمل درآمد حال تک خلافت عثمانیہ میں بھی ہوتا رہا اور شام اور فلسطین کے انتدابی علاقوں میں آج بھی یہی عمل درآمد ہوتا ہے۔

مسلم معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ غلاموں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے غلامی کے قدیم سامی دستور کو جس کے قانونی جواز کو توریت نے بھی تسلیم کیا ہے، قائم و برقرار رکھا لیکن اسلام نے غلاموں کی حالت میں قابل قدر اصلاحیں کی۔ شریعت نے مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب کا غلام بنانا حرام ٹھہرایا لیکن بعد میں اسلام قبول کرنے والے غلام کی آزادی کی کوئی ضمانت نہیں دی۔ ابتدائے اسلام میں غلاموں کی بھرتی جن میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے تھے جنگی قیدیوں (بجز ان کے جنہیں تاوان لے کر چھوڑ دیا گیا ہو) اور خریداری کے ذریعہ ہوتی تھی۔ لوٹ مار کے ذریعہ بھی غلام حاصل کیے جاتے تھے۔ جلد ہی تمام اسلامی ملکوں میں غلاموں کی تجارت کا منفعت بخش بازار گرم ہو گیا۔ مشرقی یا وسطی افریقہ کے غلام سیاہ، چینی ترکستان کے زرد، اور مشرق قریب یا مشرقی اور جنوبی یورپ کے غلام سفید فام ہوتے تھے۔ اسپینی غلام تقریباً ایک ہزار دینار کو فروخت ہوتا تھا اور ترکی غلام کی قیمت صرف (۶۰۰) دینار آتی تھی۔ اسلامی قانون کی رو سے لونڈی کی اولاد جو غلام کے صلب سے ہو یا مالک کے سوا کسی اور شخص سے ہو، یا خود مالک کی ہو لیکن مالک اسے اپنی اولاد تسلیم نہ کرے، غلام ہوتی تھی لیکن ایسے غلام کی اولاد جو آزاد عورت کے بطن سے پیدا ہوئی ہو آزاد ہوتی تھی۔

مسلمانوں کی فتوحات کے نتیجے کے طور پر اسلامی سلطنت میں غلاموں کا جو سیلاب

آمنڈ آیا تھا اس کا اندازہ ان مبالغہ آمیز اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے کہ : موسیٰ نے شمالی افریقہ سے تین لاکھ قیدی بنائے جن کے منجملہ اس نے ساٹھ ہزار قیدیوں کو خلیفہ کے حضور میں پیش کیا یا اسی موسیٰ نے اسپین کے غوطی امیر خاندانوں کی تیس ہزار کنواریوں کو بھی گرفتار کیا تھا، یا ترکستان میں ایک اسلامی سپہ سالار قتیبہ بن مسلم ہی نے ایک لاکھ قیدی بنائے تھے

مالک اور لونڈی کے درمیان جنسی تعلق تو جائز تھا لیکن نکاح جائز نہ تھا اس طرح جو اولاد ہوتی تھی وہ مالک کی کہلاتی تھی۔ اس لیے وہ آزاد ہوتی تھی مگر حرم کو صرف "ام الولد" کا درجہ عطا کیا گیا تھا اس کا مالک اس کو بیچ سکتا تھا اور نہ کسی کے نام ہبہ کر سکتا تھا۔ ایسی لونڈی مالک کے مرنے کے بعد آزاد ہو جاتی تھی۔ عربوں اور غیر عربوں کے باہمی اختلاط اور انضمام کی صورت میں جو نسلی کایا پلٹ اور انقلاب نمودار ہوا، اس میں غلاموں کی تجارت نے بھی یقیناً نہایت ہی اہم حصہ لیا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریگستانی حملہ آور مفتوحہ ملکوں میں اپنے ساتھ علمی روایات لے کر آئے تھے اور نہ کوئی ثقافتی سرمایہ۔ بنی اُمیہ کی حکومت کے زمانے کے عرب کا زمانۂ جاہلیت سے قرب، پھر اس زمانے کی کئی لڑائیاں اور دنیائے اسلام کے تغیر پذیر معاشرتی اور سماجی حالات غرض یہ سب عوامل مل کر اس ابتدائی دور کی ذہنی ترقی کی راہ میں حائل رہے لیکن اس وقت وہ بیج بویا جا چکا تھا۔ اور وہ شجر علم جو بغداد میں دوسرے حکمراں خاندان بنی عباس کے زیر سایہ اپنی پوری بہار کو پہنچا تھا۔ یقیناً اس کی جڑیں یونانی، شامی اور ایرانی ثقافت کے اسی پچھلے دور سے پیوست تھیں۔ اموی دور بہ حیثیت مجموعی مبادیات کا دور تھا۔

جیسے جیسے ایرانی، شامی، قبطی، بربر اور دوسری قومیں اسلام قبول کرتی گئیں اور عرب خاندانوں میں ان کی شادیاں ہوتی گئیں۔ عربوں اور غیر عربوں کے درمیان حدِ فاصل کے طور پر جو اونچی دیوار کھڑی کی گئی تھی وہ منہدم ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کی قومیت پس پردہ چلی گئی اب حضرت محمد کا ہر ایک پیرو عرب سمجھا جانے لگا چاہے اصل میں اس کی قومیت کچھ ہی کیوں

نہ ہو۔ اس وقت سے نسلی تعلق کا لحاظ کیے بغیر ہر وہ شخص عرب مانا جانے لگا جس نے اسلام قبول کر لیا ہو اور عربی زبان لکھ پڑھ سکتا ہو۔ یہ اسلامی تمدن کی ایک نہایت اہم اور نمایاں حقیقت ہے۔ اس لیے جب کبھی ہم 'عربی طب' 'عربی فلسفہ' یا 'عربی ریاضی' کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مُراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ یہ علوم طب، فلسفہ یا ریاضی لازماً عربی دماغ کی پیداوار ہیں، یا ان علوم کو فروغ دینے والے وہی لوگ تھے جو جزیرہ نمائے عرب میں رہتے بستے تھے۔ بلکہ ہماری مراد اس ہیئتِ علمی سے ہوتی ہے جو عربی کتابوں میں جلوہ فرما ہے۔ یہ کتابیں اُن لوگوں نے لکھی ہیں جن کی بیشتر تعداد زمانۂ خلافت میں اوجِ کمال کو پہنچی تھی۔ یہ لوگ ایرانی، شامی، مصری یا عرب نصرانی، یہودی اور مسلمان سب ہی تھے۔ اور انہوں نے یونانی، آرامی، ہند و ایرانی یا دوسرے ماخذوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔

ایران کے سرحدی علاقوں میں عربی زبان اور اس کی صرف و نحو کا فنی طریقہ پر مطالعہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ مطالعہ بڑی حد تک غیر عرب نو مسلم اور ایک حد تک عرب کر رہے تھے۔ اس مطالعہ کا پہلا محرک ان نومسلموں کی لسانیاتی ضرورت کو پورا کرنے کی خواہش تھی جو قرآن پڑھنے، سرکاری عہدے حاصل کرنے اور فاتحوں سے میل جول بڑھانے کے آرزومند تھے۔ ایک روایت کی رو سے صرف و نحو کے موضوع پر سب سے پہلا رسالہ ایک خلیفہ کے اس قول کی اساس پر مدون کیا گیا تھا "کلام کے تین اجزا ہوتے ہیں: اسم، فعل اور حرف" اس کے باوجود عربی صرف و نحو کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی اور اس کا ارتقائی زمانہ بڑا طولانی رہا۔ عربوں کے اس علم پر یونانی منطق کے بہت سے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں۔

قرآن کے مطالعے اور اس کی تفسیر کی ضرورت نے علم حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ اللغۃ اور فرہنگ نویسی کے توام اور لاینفک علوم کو فروغ دیا۔ علم حدیث اسلامی ادب کا اہم ترین کارنامہ ہے اور یہ صرف مسلمانوں ہی کا خاص کارنامہ ہے۔ فنی حیثیت سے حدیث خود رسول اللہ کا قول یا فعل یا کسی صحابی کے قول یا فعل پر آپ کا سکوت۔ تقریر۔۔۔ ہے۔ قرآن اور حدیث

ہی کی بنیادوں پر فقہ اور شریعت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ عصر حاضر کے قانون دانوں کا خیال ہے کہ قانون کا فلسفۂ قانون سے گہرا ربط ہونا چاہیے لیکن اسلام میں قانون کا قریب ترین تعلق دین سے ہے۔ بے شبہ بنی اُمیہ کی قانون سازی رومی قانون سے براہ راست یا تالمود اور دوسرے ذریعوں سے متاثر ہوئی ہے لیکن یہ اثرات کس حد تک مرتب ہوئے ہیں اس کا تعین پوری طرح نہیں کیا جا سکا۔

عربی سائنس کی ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ علم طب پر سب سے پہلا رسالہ ایک یہودی نے ایک یونانی رسالے کے ترجمے کی مدد سے سپرد قلم کیا۔ اصل رسالہ اسکندریہ کے ایک نصرانی پادری نے ترتیب دیا تھا۔ طب کی طرح کیمیا کو بھی اسلام کے قرون اولیٰ ہی میں فروغ حاصل ہوا۔ یہ ان مخصوص علوم میں سے ایک علم ہے جن کی ترقی میں عربوں نے بعد کے آنے والے زمانوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

شاعری اور موسیقی کو بھی دمشق کے دربار میں خوب فروغ حاصل ہوا، اگرچہ قدامت پسند راگ راگنی اور موسیقی کو مے نوشی اور قمار بازی جیسے لہو و لعب کے مماثل گردانتے تھے جنہیں رسول اللہ نے حرام قرار دیا تھا۔ بنی اُمیہ کی سرپرستی میں مسلمانوں نے جس میدان میں سب سے زیادہ ذہنی ترقی حاصل کی وہ شاعری کا میدان تھا۔ فتوحات کے پچھلے سنجیدہ دور نے شاعروں کی قوم میں ایک بھی شاعر پیدا نہیں کیا۔ لیکن دنیا دار بنی اُمیہ کے برسر اقتدار آتے ہی نغمہ، شراب اور شعر کی دیوی کے ساتھ قدیم تعلقات پھر سے استوار کیے گئے۔ اسی زمانے میں شاعر عشق عربی ادب میں پہلی بار پوری طرح نمودار ہوتا ہے۔

مسلم عربوں کے آرٹ کو مذہبی فن تعمیر میں سب سے زیادہ شاندار طریقہ پر ظہور کا موقع ملا ہے۔ مسلم تعمیر کاروں نے یا اُن لوگوں نے جو اسلامی عمارتوں کی تعمیر پر لگائے گئے تھے، عمارتوں کا ایک سادہ اور پُرجلال منصوبہ تیار کیا جس کی بنیاد تو پچھلی عمارتوں کے نقشے پر رکھی گئی تھی، لیکن ان سے ایک انوکھے انداز میں اس نئے دین کی روح کا اندازہ ہوتا تھا۔

بین نسلی اور بین قومی تعلقات کے اعتبار سے اسلام کی تہذیب اور اس کے تمدن کی نشو و نما کی تاریخ کا لب لباب ہمیں مسجد (مسجد کے لغوی معنی سجدہ گاہ کے ہیں) ہی میں ملتا ہے۔ اسلام اور اس کے ہمسایوں کے باہمی ثقافتی تعلق اور ربط ضبط کی تشریح کے لیے شاید مسجد سے بڑھ کر کوئی دوسری واضح مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

پہلی صدی ہجری میں مدینہ کی سیدھی سادی مسجد نبوی نے اسلامی مساجد کے لیے ایک نمونۂ عام کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ مسجد ایک صحن پر مشتمل تھی جو بالکل کھلا تھا، اور اس کے گرد کچی اینٹوں کی دیوار اُٹھا دی گئی تھی۔ بعد کو دھوپ سے بچاؤ کے لیے حضرت محمدؐ نے پورے صحن پر متصلہ عمارتوں سے ایک سپاٹ چھت ڈلوا دی تھی۔ یہ سائبان مٹی اور کھجور کے پتوں کا بنایا گیا تھا اور اس کو کھجور کے تنوں پر سہارا گیا تھا۔ منبر کے لیے کھجور کا ایک تنہ زمین میں نصب کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو مخاطب کرتے وقت حضرت محمدؐ اس پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بعد میں اس منبر کی جگہ ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا گیا۔ اس چبوترے میں تین سیڑھیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ یہ چبوترہ ویسا ہی تھا جیسا کہ شام کی نصرانی عبادت گاہوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح یہاں ہمیں مسجد کی تقریباً تمام ضروریات ان کی سادہ ترین شکلوں میں دکھائی دیتی ہیں — ایک صحن، ایک منبر، اور نمازیوں کی حفاظت کے لیے ایک سائبان۔

مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں بعد کی پیش قدمی کی بدولت ثابت و سالم اور ویران دونوں قسم کی ایسی بے شمار عمارتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں جو فنی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ تھیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا کہ ان عمارتوں نے مسلمانوں کو ان تمام ترقی پذیر معلومات اور صلاحیتوں کا مالک بنا دیا جو مفتوحہ قومیں صدیوں سے ورثتاً حاصل کرتی چلی آ رہی تھیں۔ جب یہ فنی معلومات اور اصول مسلمانوں کی مذہبی ضروریات پر منطبق کیے گئے تو رفتہ رفتہ ایک ایسے فن تعمیر کو فروغ حاصل ہوتا گیا جسے سراسینی، عربی، مسلم،

اور محمدی کے مختلف نام دیے گئے۔ مسلمان محمڈن یا محمدی کی اصطلاح پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ یہ اصطلاح "عیسائی" یا "مسیحی" کی اصطلاح کے مماثل ہے جس کا اطلاق حضرت عیسیٰ کی پرستش کرنے والوں پر ہوتا ہے اور مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت محمدؐ کی پرستش نہیں کرتے۔

انجیل سے وابستہ ہونے کے سوا بیت المقدس کو معراج کی رات حضرت محمدؐ کے تھوڑی سی دیر کے قیام کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس لیے تمام مسلمانوں کی نظروں میں اس شہر کو بہت جلد خصوصی تقدس اور احترام حاصل ہو گیا۔ ۶۹۱ء میں قبۃ الصخرا تعمیر کیا گیا اور یہ مقام یہودیوں، محمدیوں اور نصرانیوں کی روایتوں میں یکساں محترم ہے۔ جس مقام پر یہ عمارت کھڑی ہے اس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسحٰقؑ (نصرانی روایت کی رو سے اسحٰقؑ اور اسلامی روایت کی رو سے دوسرے فرزند اسمٰعیلؑ۔ مترجم) کو راہ خدا میں قربان کرنے کا قصد کیا تھا۔ اس عمارت سے قدیم طرز تعمیر میں ایک ایسی تبدیلی کا انکشاف ہوتا ہے جس کی وساطت سے پچی کاری اور دوسری تزئینی خصوصیات منظر عام پر آئیں اور ایسا گنبد تعمیر ہوا جس نے حضرت عیسیٰؑ کے ضریح کے حسین و جمیل گنبد کو بھی مات کر دیا۔ قبۃ الصخرا حسن و جمال کی ایک ایسی تعمیری یادگار ہے کہ شاید ہی کہیں کی کوئی عمارت اس پر سبقت لے جا سکے۔

دمشق کی جامع مسجد اس سے بھی زیادہ واضح طور پر عرب تمدن کی ارتقاء کی داستان سناتی ہے۔ ۷۰۵ء میں خلیفہ ولید نے دمشق کے نصرانی باسلیقی کلیسا کو جو یوحنا ولی (john) کے نام معنون کیا گیا تھا، اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اصل میں یہ رومیوں کے سب سے بڑے دیوتا جوپیٹر (مشتری) کا معبد تھا اور نصرانیوں نے اسے کلیسا بنا لیا تھا۔ ولید نے یہاں وہ عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو جامع اموی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ نصرانی تعمیر کا کتنا حصہ اس مسجد میں جوں کا توں قائم رکھا گیا ہے۔ جنوبی سمت کے دو مینار جو قدیم کلیسا کے میناروں پر ایستادہ ہیں، باسلیقی کلیسا کے ہیں لیکن شمالی مینار بے شبہ خلیفہ ولید ہی

نے تعمیر کرایا تھا۔ بلاد شام، اسپین، اور شمالی افریقہ کی مساجد کے میناروں کی تعمیر کے لیے اس مینار نے ایک مستند نمونے کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یہ سب سے قدیم اور خالص اسلامی مینار ہے۔ خلیفہ ولید نے اپنی مسجد کی تعمیر میں ان یونانی فن کاروں کے سوا جو شہنشاہ قسطنطینہ نے بھیجے تھے، ایرانی، یونانی اور ہندوستانی صناعوں سے بھی کام لیا تھا۔ مصر قدیم کے کاغذ پیپری (Papery) کی جو قلمی کتابیں جو حال میں دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جامع اموی کی تعمیر کا مال مسالہ اور ماہرین مصر سے درآمد کیے گئے تھے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا، اور جو کچھ آگے بیان ہوگا، اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ عرب جنہوں نے دنیا کو فنِ حرب کا ایک نیا درس دیا، وہی عرب اب امن کے زمانے کے فن بھی سیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اس میدان میں بھی ویسی ہی فتحمندیاں اور ویسی ہی فیروزمندیاں ان کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

# ۱۰۔ شوکتِ بغداد

زمانے کی متمدن زندگی کی رنگینیوں کی طرف مسلمان عرب اسی اشتیاق کے ساتھ لپکے جس اشتیاق کے ساتھ وہ اس زندگی کے علوم اور فنونِ لطیفہ کے مطالعہ کی طرف لپکے تھے۔ یہ بڑی عجیب حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط کے قریب ایک ایسا شخص خلیفہ بنایا گیا (یزید بن ولید بن عبدالملک) جو ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے دو جانشین بھی جو بنی اُمیہ کے آخری خلیفہ تھے لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ خواجہ سرائی نظام کے ذریعہ بڑے بڑے حرموں کا رکھنا ممکن ہو گیا تھا۔ اور اب یہ نظام پوری طرح فروغ پا چکا تھا۔ دولت کی فراوانی اور غلاموں کی بہتات کی وجہ سے عیش پرستی عام ہو گئی تھی حکمران خاندان اپنے خالص عربی النسل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ پورے معاشرے کا اخلاقی معیار گرتا جا رہا تھا۔

اس نسلی اختلاط کی وجہ سے بنی اُمیہ کا موقف کمزور ہو گیا تھا اور شمالی عرب اور جنوبی عرب کے قبیلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو شدید عصبیت پیدا ہو گئی تھی اس نے اس موقف کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ تفریق و انتشار کا یہ نسلی میلان جو عربوں میں اسلام سے پہلے کے دنوں میں بھی نمایاں تھا اب اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا، اور بے شمار جھگڑوں کا باعث بنا ہوا تھا۔ دریائے سندھ کے کناروں، جزیرہ صقلیہ کے ساحلوں اور صحرائے اعظم افریقہ کی سرحدوں پر غرض ہر جگہ یہ آبائی منافشہ جو دو سیاسی جماعتوں کی صف آرائی میں مبدل ہو گیا تھا، اب اپنا رنگ دکھانے لگا۔ یہ سیاسی جماعتیں قیس اور یمن کہلاتی تھیں۔ لبنان اور فلسطین میں یہ جھگڑا موجودہ زمانے تک چلا آتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اٹھارویں صدی تک بھی ان دونوں جماعتوں کے درمیان بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں۔

خلافت کی جانشینی کا کوئی واضح اور مقررہ اصول نہ ہونے نے بھی بنی اُمیہ کو اور کمزور کر دیا۔ ہر حکمراں باپ کی یہی تمنا ہوتی کہ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا اس کی سلطنت کا وارث ہو اور یہ ایک فطری تمنا تھی۔ امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کر کے ایک دانشمندانہ اور دور اندیشانہ پالیسی کی بنیاد رکھی تھی لیکن جانشینی کے معاملہ میں عربوں کا قدیم اصول کلدنیت اصول وراثت سے برسرِ پیکار رہا۔

اس زمانے کی تاریخوں میں عوام کا کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ تاہم صحیح یا غلط کسی طریقے سے بھی عوام کا کسی کے لیے حلف وفاداری اُٹھانا ہی اس کے مستحق خلافت ہونے کی کھلی دلیل تھی یہ پیمان وفاداری — بیعت — رہنماؤں اور سرداروں کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔ اقتدار اعلیٰ کے مظہرِ کامل کسی بھی مملکت کے عوام اپنی خواہشوں کو اپنے پرشور اجتماعی عمل کے ذریعہ منواتے، اس کے دن ابھی نہیں آئے تھے۔

۷۴۳ء میں بنی اُمیہ کی خلافت کے خلاف بنی اُمیہ کے بنی اعمام عباسیوں نے کھلی بغاوت بپا کر دی۔ بنی عباس رسول اللہ کے چچا حضرت عباس کے اخلاف تھے۔ یہ بغاوت کامیاب رہی۔ بنی امیہ کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایک عباسی سپہ سالار (عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن عباس) نے معزول امویوں کے اسّی سربرآوردہ افراد کو اپنے پاس ایک ضیافت میں مدعو کیا۔ دوران ضیافت میں اس نے سب مہمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور ان میں سے بعض ابھی دم توڑ ہی رہے تھے کہ ان کے تڑپتے ہوئے جسموں پر چمڑے کے دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ پہلے عباسی خلیفہ نے ایک بار اپنے آپ کو "سفاح" کہا تھا جس کے معنی "خوں ریز" کے ہیں۔ یہی اس کا لقب بن گیا۔ یہ واقعہ بڑا ہی منحوس تھا، کیونکہ برسرِ اقتدار آنے والا خاندان قوت و استبداد کے سہارے اپنی پالیسی چلا رہا تھا۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلی مرتبہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلیفہ کی نشست کے پہلو میں ایک کھال — نطع — بچھائی جاتی ہے جس پر جلاد بیٹھتا ہے۔ یہ کھال مسند خلافت کا جزو لاینفک بن گئی۔ اگرچہ

عباسی خلفا شمالی افریقہ یا اندلس کو اپنے زیر اقتدار کبھی نہ لا سکے لیکن وہ دنیائے اسلام کے مشرقی حصہ پر مسلسل پانچ سو سال تک فرماں روائی کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۵۸ء میں اس خاندان کے سینتیسویں خلیفہ کو مغلوں کے ہاتھوں نے برباد کر دیا۔ خلفائے عباسیہ کے دور حکومت ہی میں دنیائے اسلامی تمدن کے عہد زریں کا نظارہ کیا تھا

بغداد کی تخلیق عباسیوں نے کی تھی۔ اس شہر کو عباسی خاندان کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور نے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر اسی وادی میں تعمیر کرایا تھا جس میں دنیائے قدیم کے بعض زبردست اور عظیم الشان دار السلطنت تعمیر کیے گئے تھے۔ "یہ ایک بڑی اچھی چھاونی ہے۔" خلیفہ منصور نے محل وقوع کا معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا" اس کے سوا یہ دجلہ ہے جس کے ذریعہ ہم ملک چین تک اپنے تعلقات وسیع کر سکینگے۔ عراق، آرمینیہ اور ان کے نواح کی غذائی پیداوار کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی بحری پیداوار بھی ہم لا سکینگے۔ یہ فرات ہے جس کے ذریعہ شام، رقہ، اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی پیداوار بھی یہاں آسکیگی" یہ ایک نہایت ہی دانشمندانہ انتخاب تھا۔ شہر کی تعمیر شروع کی گئی۔۔ چار سال تک دس لاکھ مزدور اور معمار کام کرتے رہے اور آن کی آن میں تہذیب وتمدن کا ایک حسین گلدستہ تیار ہو گیا۔

شکل کے اعتبار سے بغداد ایک مدوّر شہر تھا۔ اس لیے اس کا نام المدوّرہ رکھا گیا اس شہر کے اطراف تین فصیلیں اور ایک گہری خندق تھی۔ اندر کی آخری فصیل ۹۰ نوّے فیٹ اونچی اور شہر کے وسطی حصہ کو گھیرے ہوئے تھی۔ ان فصیلوں میں چار دروازے تھے ہر دروازے سے ایک ایک شاہراہ پہیے کی تیلیوں کی طرح اسلامی سلطنت کے چاروں گوشوں کی طرف جاتی تھی اور ہر شاہراہ دائرۂ شہر کے مرکز سے شروع ہوتی تھی۔ ایوانِ خلافت جو باب الذہب یا قبہ الخضراء کہلاتا تھا، ان تمام دائروں کا مشترک مرکز تھا۔ ایوان خلافت کے پہلو میں جامع مسجد کھڑی تھی۔ بارگاہِ خلافت کا مینار سطح زمین سے ایک سو تیس ۱۳۰ فیٹ بلند تھا۔ بعد کی روایتوں میں آیا ہے کہ اس مینار پر ایک آدمی کا مجسمہ قائم کیا گیا تھا جو

ہاتھ میں برچھی لیے گھوڑے پر سوار تھا خطرے کے وقت اس کی برچھی وہی سمت دکھائی تھی جدھر سے دشمن آتا تھا لیکن ایک عرب جغرافیہ نویس کا بیان ہے کہ یہ مجسمہ ہمیشہ ایک ہی سمت دکھاتا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سمت میں ایک دائمی دشمن موجود ہو جس سے اس شہر کو خطرہ لگا ہوا ہے۔ یہ جغرافیہ نویس یقین دلاتا ہے کہ "مسلمان اتنے نادان نہیں کہ وہ خواہ مخواہ ایسی ہوائی باتوں پر یقین کرنے لگیں"۔

اس نئے مقام نے مشرق سے آنے والے خیالات کے راستے کھول دیے۔ یہیں عربی اسلام ایرانی اثرات کا شکار ہوا اور یہیں عربی خلافت شخصیت سے زیادہ ایرانی استبدادیت کے احیاء کا مظہر بنی۔ ایرانی تخیلات اور ایرانی تصورات کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا پر رفتہ رفتہ ایرانی القاب و آداب، ایرانی ازدواج، ایرانی شراب، ایرانی دوشیزہ اور ایرانی شاعری کا غلبہ ہوتا گیا۔ ان کے اثرات نے قدیم عربی زندگی کے ناہموار کناروں کو ہموار بنا دیا۔ اور اس نے ایک ایسے نئے عہد کے لیے راستہ صاف کر دیا جس نے سائنس کی ترقی اور عالمانہ تحقیقات کے لحاظ سے بڑا نام کمایا۔ صرف دو میدان ہی ایسے رہ گئے تھے جن پر عرب اب بھی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ اسلام کو مملکت کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی اور سرکاری دفتروں کی زبان اب بھی عربی زبان ہی تھی۔

نویں صدی عیسوی دو ایسی شاہانہ ہستیوں کے ساتھ نمودار ہوئی جو عالمی معاملات میں بلند ترین مقام پر متمکن تھیں۔ مغرب میں شارلیمین اور مشرق میں ہارون الرشید۔ ان دونوں میں بے شبہ ہارون زیادہ طاقتور اور برتر ثقافت کا نمائندہ تھا۔ ان دونوں ہم عصروں نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ معاہدے کیے جو آپس کے مفاد پر مبنی تھے۔ شارلیمین ہارون کی رفاقت کا جویا ہوا کہ ہارون اس کی دشمن بازنطینی حکومت کے خلاف اس کی مدد کرے۔ اور ہارون نے شارلیمین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا کہ وہ اپنے ہمسایہ اور ہارون کے جانی دشمن یعنی اندلس کے بنی اُمیہ کے خلاف صف آرا رہے،

جس نے اندلس میں ایک زبردست اور خوشحال سلطنت قائم کرلی تھی۔ مغربی مورخ کہتے ہیں کہ یہ باہمی تحائف سفراء کی آمد و رفت اور تحفے تحائف کے باہمی تبادلے کی صورت میں عمل میں آیا۔ ایک فرنگی اہل قلم جو بعض جگہ شارلیمین کے معتمد کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ مغرب کے حکمران اعظم کے سفیر "تاجدار ایران ہارون" کے دربار سے بیش بہا تحفے لے کر وطن لوٹے۔ ان تحفوں میں کپڑے، قسم قسم کے عطر، مسالے اور ایک ہاتھی بھی شامل تھا نیز بغداد کے ان تحفوں میں ایک عجیب و غریب گھڑی کا بھی ذکر آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہارون نے شارلیمین کو ایک ارغن بھی بھیجا تھا لیکن تاریخ کے اور بے سروپا دل فریب قصوں کی طرح یہ بھی ایک من گھڑت قصہ ہے۔ بظاہر یہ قصہ پن گھڑی کے غلط ترجمے پر مبنی ہے اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ ضریح مسیح کی کنجیاں بھی خود ہارون نے شارلیمین کے پاس بھیجی تھیں لیکن اس میں بھی کوئی اصلیت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سفیروں اور تحفوں کا یہ تبادلہ ۷۹۷ء اور ۸۰۶ء کے درمیان عمل میں آیا لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ ان کے متعلق تمام مسلمان مورخ بالکل خاموش ہیں۔ اگرچہ دوسرے کئی بین الاقوامی تعلقات اور مراعات کے تذکرے جابجا ملتے ہیں لیکن مذکورۂ بالا تعلقات اور مراعات کا کسی نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

اگرچہ ہارون (۷۸۶ء۔۸۰۹ء) کے زمانے میں بغداد کو تعمیر ہوئے پچاس سال بھی نہیں ہوئے تھے لیکن عدم سے نکلتے ہی اس تھوڑی سی مدت میں وہ بے شمار دولت کا عالمی مرکز، بین الاقوامی اہمیت کا حامل اور بازنطینیہ کا اکیلا حریف بن بیٹھا۔ اس کا شکوہ اس سلطنت کی اقبال مندی کے شانہ بشانہ چل رہا تھا جس کا یہ دارالسلطنت تھا۔ اور یہ شہر اس درجۂ کمال کو پہنچ گیا تھا کہ "پوری دنیا میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

اس مدوّر شہر کا ایک تہائی حصہ ایوانِ خلافت، اس کے حرم، خواجہ سراؤں کے ایوانوں اور عمائدین خاص کی حویلیوں پر مشتمل تھا۔ خاص طور پر بارگاہ خلافت بڑا پرشکوہ تھا۔ اس بارگاہ میں جو مسندیں، قالین اور سراپردے تھے، مشرق نے اپنی پوری صناعی اور مہارت ان کے

بنانے میں ختم کر دی تھی۔ خلیفہ کی شریک زندگی کا نام زبیدہ تھا۔ یہ رشتہ میں اس کی چچا زاد بہن بھی ہوتی تھی۔ بعد کی نسلوں نے اس ملکہ کو عظمت و اقبال مندی میں اس کے نامور شوہر ہارون الرشید کے ساتھ شریک کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ملکہ دسترخوان پر جواہرات جڑے سونے چاندی کے برتنوں کے سوا کوئی دوسرا برتن استعمال نہ کرتی تھی۔ یہ پہلی ملکہ ہے جس نے اپنی جوتیوں پر جواہرات لگائے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک حج پر اس نے تیس (۳۰) لاکھ دینار صرف کیے تھے۔ ان میں اس پچیس میل لمبی نہر کے اخراجات بھی شامل ہیں جو مکہ میں پانی لانے کی غرض سے اس کے حکم سے کھودی گئی تھی۔

حسن و جمال کے لحاظ سے زبیدہ کی ایک ہی حریف عُلَیّہ تھی۔ یہ خلیفہ ہارون کی سوتیلی بہن تھی۔ علیہ کے ماتھے پر ایک داغ تھا۔ اس داغ کو چھپانے کے لیے اس نے ماتھے کا ایک ٹیکہ ایجاد کیا تھا۔ اس ٹیکے میں ہیرے جواہرات جڑے گئے تھے۔ اس ٹیکہ کا نام "اعلیٰ علیہ" مشہور ہوا، اور فیشن کی دنیا نے بہت جلد اُسے رواجِ عام کی سند عطا کر دی۔

خلیفہ کی مسند نشینی، شادی، حج اور ممالک غیر کے سفیروں کی باریابی پر خاص طور پر دربار کی دولت، شان و شوکت، اور جاہ و جلال کا پورا پورا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ خلیفہ مامون نے اپنے وزیر کی اٹھارہ سالہ لڑکی بوران سے شادی کی تھی اور اس شادی کا جشن ۸۲۵ء میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا تھا۔ اس جشن کی تفصیل عربی ادب میں اس زمانے کی ایک ناقابل فراموش یادگار بن گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس شادی کے موقع پر دولہا دلہن کو ایک طلائی فرش پر جو موتیوں اور یاقوت سے مزین تھا، بٹھایا گیا اور ایک طلائی کشتی میں ایک ہزار بے مثال بڑے بڑے موتی رکھ کر ان پر نچھاور کیے گئے۔ دو سو بتیوں کے ایک عنبریں فانوس نے اپنی ضیا پاشیوں سے شب تار کو روز روشن میں بدل دیا تھا۔ شہزادوں اور عمائدین سلطنت پر مشک خام کی گولیاں نچھاور کی گئیں اور ہر گولی میں ایک شاہی پروانہ تھا جس میں کوئی جاگیر، غلام یا اسی طرح کے کسی انعام کا وثیقہ رکھا تھا۔ ۹۱۷ء میں خلیفہ المقتدر نے نو عمر قسطنطین ہفتم

کے سفیروں کو اپنے قصر میں بڑی شان شوکت کے ساتھ باریاب کیا تھا۔ ان سفیروں کا کام بظاہر قیدیوں کا تبادلہ اور تاوان کے ذریعہ ان کی رہائی تھا۔ خلیفہ کا لشکر ایک لاکھ ساٹھ ہزار سواروں اور پیادوں، سات سو سیاہ فام و سفید فام خواجہ سراؤں اور سات سو حاجبوں پر مشتمل تھا۔ اس پریڈ میں ایک سو شیر ببر بھی لائے گئے تھے۔ ایوان خلافت میں اڑتیس ہزار پردے آویزاں تھے جن میں سے ساڑھے بارہ ہزار پردوں پر سونے چاندی کا کام کیا ہوا تھا اور بائیس ہزار قالین تھے۔ بازنطینی سفیر اس پورے منظر سے ایسے مسحور و متاثر ہوئے کہ پہلے حاجب اور پھر وزیر کے دفتر پر انہیں بارگاہ خلافت کا دھوکا ہوا۔ خاص کر وہ دار الشجرہ کو دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اس کے اندر پانچ لاکھ مثقال وزنی سونے چاندی کا ایک مصنوعی درخت رکھا گیا تھا۔ اس کی شاخوں پر آپ ہی آپ گانے والی سونے چاندی کی چڑیاں بٹھائی گئی تھیں۔ باغ میں وہ ایک کھجور کا درخت دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گئے۔ یہ درخت مصنوعی طریقے سے بونا کر دیا گیا تھا اور اس کی داشت و پرداخت کچھ ایسے ماہرانہ طریقے سے کی گئی کہ اس سے جو کھجور پیدا ہوتی تھی وہ اپنی نوع کے اعتبار سے لاثانی سمجھی جاتی تھی۔

خلیفہ ہارون الرشید اسلامی بادشاہت کا معیاری نمونہ تھا۔ اس کی اور اس کے جانشینوں کی شاہانہ جود و سخا مقناطیس کی طرح شاعروں، عالموں، گانے والوں، ناچنے والوں، کتوں اور مرغوں کو سدھا کر لڑانے والوں اور ان سب لوگوں کو جو تفریح کا باعث بن سکتے یا تماشہ دکھا سکتے تھے، شہر بغداد میں کھینچ لاتی تھی۔ آزاد منش شاعر ابو نواس ہارون کا شریک عیش اور اس کی شبانہ گردشوں کا ہمدم و ہمراز تھا۔ اس شاعر نے اس عہد شوکت کے رنگین دربار کی تصویر نہایت ہی موثر اور ناقابل فراموش انداز میں کھینچی ہے۔ اصفہانی کی تصنیف الاغانی کے اوراق تمثیلی محاضرات سے بھرے پڑے ہیں جن کی حقیقت کا پتہ لگانا کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ ایک قصہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہارون کے بیٹے مامون نے

اپنے چچا ابراہیم کو جو ایک ماہر مغنی تھا، ایک رات ابو نواس کے چند شعر گانے کے صلے میں تیس ۳۰ ہزار دینار انعام دیے۔ ابراہیم کو خلیفہ کی بارگاہ سے اس طرح جو انعام واکرام ملے ان کی مجموعی مقدار دو کروڑ درم بتائی جاتی ہے جو چند ضلعوں کے خراج سے زیادہ نہ تھی۔ امین نے اپنے عیش وطرب کے جلسوں کے لیے دریائے دجلہ کے کنارے خاص قسم کے بجرے بنوائے تھے، ان کی شکل وصورت جنگلی جانوروں سے ملتی جلتی تھی۔ ان میں کوئی بجرہ مچھلی کی شکل کا تھا تو کوئی شیر کی شکل کا، اور کوئی شاہین کی شکل کا۔ ایک بجرے کی تیاری کا صرفہ تیس ہزار درم تھا۔ اغانی میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ ایک بار خلیفہ کے محل میں تمام رات بڑا دلکش سنگیت ناچ ہوا۔ اس میں خلافت پناہ بنفس نفیس ہدایت کاری کا فرض انجام دے رہے تھے۔ بہت سی مہوش دوشیزائیں نغمہ وسرود کی نرم ونازک ہم آہنگی کے ساتھ رقص کرتی جاتی تھیں اور حضارِ محفل ان کی فردوس گوش تانوں کے ساتھ ہم آواز ہوکر گاتے جاتے تھے۔ ایک دوسرا مصنف لکھتا ہے کہ ابراہیم نے ایک بار اپنے بھائی خلیفہ ہارون کی دعوت کی۔ خلیفہ کے حضور میں ایک رکابی پیش کی گئی جس میں مچھلی کے نہایت ہی ننھے ننھے قتلے رکھے تھے۔ میزبان نے عرض کی کہ یہ مچھلیوں کی زبان کے قتلے ہیں۔ اور خدام نے عرض کی کہ ان زبانوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہے اور ان پر ایک ہزار دینار سے بھی زیادہ صرف ہوئے ہیں۔ مشرقی افسانوں سے ان کی مبالغہ آمیزیوں اور لاف زنیوں کا جزو نکال دیا جائے تب بھی بغداد کی درباری زندگی کی شان وشوکت اس قدر ضرور باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ہمیں محوِ حیرت بنادینے کے لیے کافی ہے۔

بغداد کی گودی میلوں لمبی تھی۔ اس میں سیکڑوں جہاز اور سیر وتفریح کے بجرے کھڑے رہتے تھے۔ ان جہازوں میں چینی جہازوں سے لے کر مشکیزوں کی دیسی کشتیاں تک تھیں جن میں ہوا بھر دی جاتی تھی۔ ایسی کشتیاں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ موصل تک ان کا سلسلہ بندھا ہوتا تھا۔ بازاروں میں چین سے چینی مٹی کا سامان، ریشم اور مشک، ہندوستان اور جزائر

شرق الہند سے گرم مصالحہ، معدنی اشیا اور رنگ، ترکوں کے ملک وسط ایشیا سے لعل، یاقوت نیلم، کپڑے اور غلام، اسکنڈی نیویا اور روس سے شہد، موم، قاقم، سنجاب اور سفید فام غلام اور مشرقی افریقہ سے ہاتھی دانت، سونے کی خاک، اور حبشی غلام آیا کرتے تھے۔ چینی مٹی کے ظروف کی خرید وفروخت کا ایک خاص بازار بالکل الگ ہی تھا۔ مملکت کے صوبوں سے مقامی پیداوار میں مثلاً مصر سے چاول، غلہ اور کتان، شام سے شیشہ، دھات کا سامان اور میوہ، عرب سے کمخواب، موتی اور ہتھیار، اور ایران سے عطریات اور ترکاریوں سے لدے ہوئے کارواں اور جہازی قافلے دارالخلافہ بغداد پہنچتے تھے۔

بغداد اور دوسرے برآمد کے مرکزوں سے عرب تاجر مشرق بعید، یورپ اور افریقہ کے کپڑے جواہرات، فلزی آئینے، شیشے کا سامان اور گرم مسالہ جہازوں کے ذریعے بھیجا کرتے تھے۔ حال ہی میں عربی سکوں کے دفینے شمالی روس، فن لینڈ، سویڈن اور جرمنی جیسے دور دراز علاقوں میں برآمد ہوئے ہیں۔ یہ دفینے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانے میں اور اس کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی تجارت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ سندبادجہازی کی داستان جو الف لیلہ کی بہترین داستانوں میں شمار کی جاتی ہے محض من گھڑت افسانہ نہیں، بلکہ اس کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اصل میں یہ قصہ مسلمان تاجروں کے بحری سفروں کی روداد وں پر مبنی ہے۔

بغداد کے معاشرے میں تاجروں نے بڑا اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ ایک ہی قسم کی تجارت وحرفت والے لوگوں کی دکانیں آج کل کی طرح ایک ہی بازار میں ہوتی تھیں۔ بازاری دنیا کی بے رنگی شادی یا ختنہ کی براتوں کے گزرنے سے بار بار درہم برہم ہو جایا کرتی تھی پیشہ ور لوگ جیسے طبیب، وکیل معلم اور ادیب وغیرہ پبلک زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرنے لگے تھے۔ مشہور سوانح نگار ابن خلکان نے اس زمانے کے ایک ادیب (حنین ابن اسحٰق) کے روزمرہ معمولات کی تصویر بڑے اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے

کہ اس زمانے میں علم وفضل کی بازار میں مانگ پیدا ہو چلی تھی۔ اس تصویر میں سب سے پہلے ہمیں یہ ادیب جس کے سوانح حیات لکھے گئے، معمول کے مطابق گھوڑے کی سواری کے بعد پبلک حمام میں داخل ہوتا دکھایا گیا ہے۔ جہاں خادموں نے اسے نہلایا۔ حمام سے نکل کر اس نے نیچی عبا پہنی، کچھ پیا، اور کعکہ ــ بسکٹ ــ کھا کر پڑ رہا اور کبھی کبھار قیلولہ کرنے کے بعد بدن میں خوشبو پیدا کرنے کے لیے اُس نے خوشبو جلا کر ان کی دھونی لی، پھر کھانا طلب کیا جو عام طور پر شوربے، روٹی اور مرغ کے فربہ کیے ہوئے چوزوں پر مشتمل تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر سو گیا۔ بیدار ہوا تو بھی اور شامی سیب کے ساتھ پرانی شراب کے دو چار جام چڑھائے۔

بغداد کے اس پُر تکلف اور اعلیٰ معیار زندگی نے تاریخوں اور افسانوں میں اس زمانے کو ہر دل عزیز بنا دیا ہے۔ خاص کر وقائع عالم میں یہ حقیقت نہایت تابناک ہے کہ اسی دور نے تاریخ اسلام کی یادگار ترین اور عقل وخرد اور تہذیب وتمدن کی پوری تاریخ کے ایک نمایاں ترین ذہنی بیداری کے مظاہرے کا مشاہدہ کیا۔ یہ بیداری بڑی حد تک بیرونی اثرات کا نتیجہ تھی۔ اس میں کچھ ہندی وایرانی اور شامی اثر تھا اور بڑا حصہ یونانی اثر کا تھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے زیر اثر پہلوی، سنسکرت اور سریانی زبانوں سے عربی زبان میں ترجمے ہوئے۔ مسلمان عربوں کے پاس سائنس، فلسفہ، اور ادب کا جو کچھ ذاتی سرمایہ تھا، وہ بہت ہی حقیر تھا۔ لیکن ریگ زار عرب سے وہ اپنے ساتھ علمی تحقیق وتجسس کا ایک صحیح شعور واحساس اور ذہین دماغ کی بہت سی مخفی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ لوگ بہت جلد ان تمام قدیم اور نسبتاً اعلیٰ تہذیب کی حامل قوموں کے ثقافتی خزانوں کے مالک ووارث بن بیٹھے جن کو انہوں نے یا تو بالکل مغلوب کر لیا تھا یا جن سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ جیسے شام میں ان مسلمان عربوں نے آرامی تمدن اور عراق میں عراقی تمدن اختیار کر لیا تھا اور خود آرامی تمدن پر یونانی اور ادھر عراقی تمدن پر ایرانی

تمدن کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ شہر بغداد کی تعمیر کے (۷۵) سال کے اندر ہی عربی خواں دنیا ایران اور ہندوستان کی سائنٹفک تصانیف کے ساتھ ساتھ ارسطو اور بڑے نو افلاطونی شارحوں کی اہم کتابوں اور جالینوس کی بیشتر طبی تحریروں کی مالک بن گئی تھی۔ یونان نے جس چیز کو فروغ دینے میں صدیاں گذار دی تھیں، اسی چیز کو عربوں نے چند سالوں میں بڑی خوبی کے ساتھ اپنا لیا۔ یونان اور ایران دونوں ملکوں کی ثقافت کی اہم ترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لینے میں اسلام کو خود اپنی اکثر ایسی خصوصیات سے ہاتھ دھونا پڑا جو ریگستانی روح اور عربی قومیت کی امانت دار تھیں لیکن ان اختیار کردہ خصوصیات کی بدولت اسلام نے قرون وسطیٰ کی اس ثقافتی وحدت کی تخلیق میں نہایت ہی اہم حصہ لیا جس نے جنوبی یورپ کے ساتھ مشرق قریب کا رشتہ جوڑ دیا۔ یہ یاد رہے کہ اس ثقافت کی آبیاری اسی ایک چشمے سے کی گئی تھی جس کی نہریں مصر قدیم، بابل، فینیقیہ اور یہود کے سرچشموں سے نکل نکل کر یونان کی طرف بہی تھیں۔ اور اب یہ سب نہریں یونانیت کی شکل میں پھر مشرق کی طرف رواں دواں تھیں۔ ہم آگے چل کر یہ بتائیں گے کہ اس سرچشمہ کے بہاؤ کو اندلس اور صقلیہ کے عربوں نے کس طرح یورپ کی سمت پھیر دیا اور اس نے یورپ کے نشأۃ ثانیہ کو کس طرح پروان چڑھایا۔

ہندوستان بھی اس جذبۂ علم کا ایک ابتدائی منبع تحریک رہا ہے خاص کر فلسفہ، ادب اور ریاضیات میں۔ ۷۷۳ء میں ایک ہندی سیاح نے بغداد میں فلکیات پر ایک مقالہ پیش کیا اور خلیفہ کے حکم سے الفزاری نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ عربوں کو ستاروں سے اپنے ایام صحرا ہی سے بڑی دلچسپی رہی ہے لیکن اس وقت تک ستاروں کے بارے میں کوئی سائنٹفک تحقیق ان کی طرف سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ اسلام نے ہیئت کے مطالعہ کے شوق کو اور بڑھایا۔ کیونکہ نماز ادا کرنے کے لیے قبلہ کی سمت متعین کرنا ضروری تھا۔ نامور الخوارزمی متوفی ۸۵۰ء نے اپنے مشہور فلکیاتی جدول کی بنیاد الفزاری کے اسی

ترجمہ پر رکھی ہے۔ اس کے سوا خوارزمی نے اپنی ذاتی تحقیق اور اپنی معلومات کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ہندی اور یونانی فلکیاتی نظاموں کو باہم متحد بھی کیا تھا۔ وہی ہندی سیاح جس کا ذکر اوپر ہوا، ریاضی کی ایک کتاب بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے ذریعہ دنیائے اسلام میں وہ ہندسے رائج ہوئے جنہیں یورپ عربی ہندسوں کے نام سے موسوم کرتا ہے اور اہل عرب ان کو ہندی ہندسے کہتے ہیں۔ اس کے بعد نویں صدی میں ہندوستان نے اعشاری نظام کے ذریعہ عربی علوم ریاضی کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

جس زمانے میں عربوں نے ہلال نما شاداب سرزمین کو فتح کیا ہے اس وقت بے شبہ یونان کا ذہنی ورثہ ہی ایک قابل حصول خزانہ تھا۔ اسی لیے عربوں کی زندگی پر تمام بیرونی اثرات کے مقابلہ میں یونانیت کا اثر ہی سب سے گہرا ہے۔

خلیفہ مامون کی سرپرستی میں یونانی اثرات حد کمال کو پہنچ گئے تھے۔ اس خلیفہ کے معقولیت کے رجحان نے یونانیوں کی فلسفیانہ تصانیف کی طرف رہنمائی کی۔ خلیفہ مامون کے اس تصور کی معقولیت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس کا خیال تھا کہ دینی کتابوں کو عقل و شعور کے مطابق ہونا چاہیے۔ ۸۳۰ء میں اس نے بغداد میں اپنے مشہور و معروف "دارالحکمت" کی بنیاد رکھی جو بیک وقت کتب خانہ، علم و ادب کی مجلس، اور دارالترجمہ بھی تھا۔ مامون کا یہ دارالحکمت ہر لحاظ سے اسکندریہ کے عجائب خانہ کی تاسیس (جو تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں عمل میں آئی تھی) کے بعد سے ایک اہم ترین تعلیمی ادارہ ثابت ہوا۔ یونانی دارالحکمت کی تاسیس تک نصرانی، یہودی اور بعد کے نومسلم اپنے طور پر ترجمہ کا کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے تھے لیکن مامون کے عہد سے ترجمہ کا باضابطہ کام شروع ہوا۔ یہ کام اس خلیفہ کے کئی جانشینوں کے عہد تک جاری رہا۔ اور اکثر ترجمے مامون کے دارالحکمت ہی میں ہوتے رہے۔ عباسی عہد میں ترجمہ کا دور ۷۵۰ء کے بعد ایک سو سال تک جاری رہا۔ چونکہ اکثر ترجمہ کرنے والوں کی زبان آرامی (سریانی) تھی،

اس لیے بیشتر یونانی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہونے سے پہلے آرامی زبان میں منتقل کی گئیں، جو زبان حضرت عیسیٰؑ بولتے تھے، وہ بھی آرامی زبان تھی۔

عربی مترجموں کو یونان کی ادبی چیزوں سے دلچسپی نہ تھی۔ یونانی ڈرامے، یونانی شاعری اور یونانی تاریخ اور عربی ذہن کے درمیان کوئی قریبی ربط قائم نہ ہو سکا۔ اس میدان پر ایرانی اثر غالب رہا۔ افلاطون اور ارسطو نے جس فلسفہ کی بنیاد رکھی اور بعد میں نوافلاطونیوں نے جس کی شرح کی، اصل میں اسی فلسفہ کی بندرگاہ سے ذہنی تخلیق کے اس بیڑے نے نقل و حرکت شروع کی تھی۔

مورخ حنین ابن اسحٰق (اہل یورپ اسے Joannitus کے نام سے یاد کرتے ہیں) کو عربوں نے شیخ المترجمین کا لقب دے رکھا ہے۔ حنین (۸۰۹ء تا ۸۷۳ء) اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا عالم اور ایک شریف ترین آدمی تھا۔ اس کا تعلق حیرہ کے نسطوری نصرانی فرقے سے تھا۔ جوانی میں وہ ایک طبیب کے پاس دواساز کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے مالک نے اس پر طعنہ زنی کی تھی کہ حیرہ کے لوگوں کو طب سے ذرا بھی نسبت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم دواسازی کی بجائے بازار میں خردہ فروشی کرو۔ نوجوان حنین اس طعن سے اس قدر متاثر ہوا کہ آبدیدہ ہو کر اس کی ملازمت چھوڑ دی اور یونانی کتابوں کا بڑی سرگرمی کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا۔ کہتے ہیں حنین نے عربی میں اور کئی کتابوں کے سوا افلاطون کی کتاب 'ریاست' اور ارسطو کے "مقالات" اس کی 'طبعیات' اور 'خلقیات' اور جالینوس، بقراط اور دیقوریدس کی کتابوں کے ترجمے بھی تیار کیے تھے۔ ان سب میں اس کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جالینوس کی تقریباً تمام سائنٹفک تصانیف کو سریانی اور عربی زبانوں میں منتقل کر دیا۔ علمی دنیا کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ جالینوس نے علم تشریح پر جو سات کتابیں لکھی تھیں وہ عربی ترجموں کی صورت میں آج تک محفوظ ہیں، حالانکہ اصل یونانی نسخے ناپید ہو چکے ہیں۔ حنین نے توریت کا جو ترجمہ یونانی ہفتادی زبان

سے عربی میں کیا تھا وہ اب معدوم ہے۔

مترجم کی حیثیت سے حنین کی قابلیت کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ اس کو اور اس کے ساتھ دوسرے مترجموں کو ماہانہ تقریباً پانچ سو دینار (گویا امریکہ کے بارہ ہزار ڈالر کے برابر) معاوضے کے طور پر دیلے جاتے تھے۔ اس کے سوا خلیفہ مامون اس کی ہر ترجمہ کی ہوئی کتاب کے وزن کے مساوی سونا اسے بطور انعام دیا کرتے تھے لیکن حنین ابن اسحاق کو عزت و شہرت کی معراج مترجم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک طبیب کی حیثیت سے حاصل ہوئی تھی جب کہ خلیفہ متوکل نے اس کو اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا تھا۔ ایک بار حنین کے مربی متوکل نے اپنے ایک دشمن کے لیے اسے زہر تیار کرنے کا حکم دیا، اور وعدہ کیا کہ اس کے صلہ میں حنین کو بیش قرار انعام دیا جائیگا۔ لیکن حنین نے خلیفہ کا یہ حکم نہیں مانا، اور انعام کی پیش کش کو بھی رد کر دیا۔ اس انکار کی پاداش میں خلیفہ نے حنین کو ایک سال تک قید رکھا۔ جب دوبارہ خلیفہ کے حضور میں پیش کیا گیا اور قتل کی دھمکی دی گئی تو اس نے جواب دیا "مجھے مہارت صرف اسی چیز میں حاصل ہے جو مفید اور فائدہ مند ہے، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا" تب خلیفہ نے اس سے کہا کہ وہ اس کی طبیبانہ دیانت داری کا امتحان لے رہا تھا، اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس کو سمِ قاتل کی تیاری سے باز رکھا؟ حنین نے جواب دیا "دو چیزوں نے" میرے مذہب اور میرے پیشے نے۔ میرا مذہب یہ حکم دیتا ہے کہ ہمیں اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ اور پھر دوستوں کیلئے تو اس کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ میرا پیشہ مفادِ عامہ کے لیے ہے۔ وہ صرف انسانوں کے علاج و معالجہ اور رفع تکلیف کی حد تک محدود ہے۔ اس کے سوا ہر طبیب اس بات کا حلف اٹھاتا ہے کہ وہ کسی کو کوئی مہلک دوا نہیں دیگا۔

عصرِ حاضر کا ایک فرانسیسی مورخ طب حنین کو نویں صدی کی سب سے بڑی شخصیت

مانتا ہے۔

ترجمہ کا دور ختم ہونے سے پہلے ارسطو کی تمام تصانیف جن میں اکثر جعلی تھیں، عملاً ہر عربی پڑھنے والے کے لیے سہل الحصول ہو گئی تھیں۔ یہ کام اس وقت ہوا ہے جب کہ یورپ یونانی فلسفہ اور سائنس سے بالکل ہی نا آشنا تھا۔ جس زمانہ میں ہارون الرشید اور مامون ایران اور یونان کے فلسفیوں کی تحقیق اور چھان بین میں مصروف تھے، اس وقت یورپ میں ان کے ہمعصر یعنی شارلیمین اور اس کے امرا ابھی اپنے نام کے حروف تہجی سیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ارسطو کے منطقی مقالات نے (جن کے عربی ترجموں میں ارسطو کے رسائل علم البیان اور علم الشعر کے سوا برفیروس کا رسالہ ایساغوجی بھی شامل کر لیے گئے ہیں) جلد ہی اسلام میں انسان دوستی کی اساس پر عربی صرف و نحو کے برابر جگہ لے لی۔ اور آج تک اس کا یہی مرتبہ باقی ہے۔ مسلمانوں نے نو افلاطونی شارحوں کے اس تصور کو قبول کر لیا کہ ارسطو اور افلاطون دونوں کی تعلیمات اصل میں ایک ہی ہیں۔ خصوصاً اسلامی تصوف پر نو افلاطونی فلسفہ نے اپنا خاصا رنگ جما لیا جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ عرب علماء ابن سینا اور ابن رشد ہی کے ذریعہ افلاطونیت اور ارسطاطالیت لاطینی میں منتقل ہوئی اور اس سے قرون وسطیٰ کے یورپی اصولِ کلام پر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ابتدائی عباسیوں کی سرپرستی میں ترجمہ کے اس طویل اور بار آور عہد کے بعد بھی ایک اچھوتی اور کارآمد تحریک شروع ہوئی جس پر ہم آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ عربی زبان اسلام سے پہلے محض شاعری کی زبان تھی اور حضرت محمدؐ کے بعد بڑی حد تک وحی اور مذہب کی زبان بنی رہی۔ لیکن دسویں صدی میں اس کی حیثیت بالکل بدل گئی اور جس اندازِ خاص سے وہ سائنٹفک خیالات اور ہر طرح کے فلسفیانہ تصورات کے اظہار کا ایک لچکدار ذریعہ بن گئی تھی اس کی نظیر کہیں ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ اس کے سوا عربی نے وسطی ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ اور اسپین تک سیاسی معاہدات وغیرہ

کی زبان کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اس زمانہ سے لے کر آج تک مصر، تونس، الجیریا اور مراکش کی طرح عراق، شام اور فلسطین کے باشندے بھی اپنے بہترین جذبات، احساسات اور تخیلات کی ترجمانی عربوں ہی کی زبان میں کرتے چلے آ رہے ہیں۔

# ۱۱۔ عوام کی زندگی

عرب مورخوں نے اپنی تمام توجہ خلفاء کے معاملات کی تفصیلات، خانوادوں اور جھوٹے مدعیوں کے عروج و زوال کے خونچکاں اور ہولناک واقعات، وزیروں، لشکر کے امیروں اور سیاسی اعتبار سے زمانے کی مقتدر و ذی شان شخصیتوں کی کامرانیوں اور تلخ کامیوں کی روداد بیان کرنے پر کچھ اس درجہ مرکوز رکھی ہے کہ ہمیں اس زمانے کے عوام کی معاشرتی اور معاشی زندگی کی کوئی واضح تصویر نہیں ملتی۔ تاہم اس تصویر کا خاکہ مورخوں کی کتابوں کی اکا دکا ضمنی عبارتوں، ادبی ماخذوں اور بیشتر آج کل کے کم تغیر پذیر اسلامی مشرق کی روزمرہ زندگی کے حقائق سے آسانی کے ساتھ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

نویں صدی کی عورت کو اتنی ہی آزادی حاصل تھی جتنی کہ اگلے زمانے کی اس کی بہنیں اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں لیکن دسویں صدی کے آخر میں عورتوں کی سختی کے ساتھ پردہ نشینی اور مردوں کی صف سے ان کی کامل علیحدگی کا رواج عام ہو چکا تھا۔ عباسیوں کے ابتدائی دور کے اونچے طبقوں کی عورتوں کے متعلق تاریخوں میں ہم نہ صرف یہ پڑھتے ہیں کہ اُنھوں نے امتیاز حاصل کیے ہیں اور مملکت کے کاموں پر اثر انداز ہوئی ہیں، بلکہ یہ بھی ہمارے دیکھنے میں آتا ہے کہ عرب دوشیزائیں میدانِ جنگ میں جاتی ہیں، فوجوں کی کمان کرتی ہیں، شعر کہتی ہیں، ادبی میدان میں مردوں کے ساتھ

مقابلہ کرتی ہیں، یا اپنی ذکاوت و خوش طبعی، موسیقی میں مہارت اور خوش گلوئی سے معاشرے کی رونق بڑھاتی ہیں۔

دورِ زوال کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں لونڈیاں رکھنے کا رواج بہت عام ہو گیا تھا، اور جنسی اخلاق بری طرح بگڑ گئے تھے۔ عیش پرستی اور ہوس رانی کی وبا ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اور جیسا کہ ہم الف لیلہ کی داستانوں میں دیکھتے ہیں اس زمانے کی عورتوں کا درجہ بہت گھٹ گیا تھا۔ ان داستانوں میں عورت کو سازش اور مکر و فریب کا مجسمہ دکھایا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ گویا عورت کا وجود ہر قسم کے ذلیل احساسات اور فاسد تخیلات کا سرچشمہ ہے۔

تقریباً سارے عالمِ اسلام میں نکاح کو ایک ایجابی فرض گردانا جاتا رہا ہے اور تارکِ نکاح کو بہت بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اولاد اور خاص کر نرینہ اولاد خدا کی نعمت سمجھی جاتی ہے۔ اس زمانے میں بیوی کا سب سے پہلا فرض شوہر کی خدمت گزاری، بچوں کی نگہداشت اور امورِ خانہ داری کی دیکھ بھال گردانا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ فرصت کا وقت مل جائے سینے پرونے میں صرف ہونا چاہیے تھا۔

اس زمانے کے شاعروں کی عشقیہ شاعری کی روشنی میں اگر عورت کے حسن و جمال کے معیار کا جائزہ لیا جائے، تو ظاہر ہو گا کہ نسوانی حسن کے متعلق جو تصورات شعرائے قبل اسلام نے پیش کیے تھے ان میں کچھ ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے کے نسوانی حسن کا معیار یہ تھا کہ عورت بلند قامت ایسی ہو جیسے درختوں میں خیزران کا درخت (ایک قسم کا بانس)، اس کا چہرہ ایسا گول ہو جیسے چودھویں کا چاند، اس کے گیسو اندھیری رات سے زیادہ کالے، رخسار صبیح اور گلاب جیسے نرم و نازک۔ ان پر ایک خال ایسا جیسے مرمریں طشت پر عنبر خام کی بوند۔ آنکھیں گہری سیاہ اور چشم آہو کی طرح بڑی بڑی، لمبی لمبی پلکیں گویا تیر و کمان، دہن تنگ اور دانت جیسے مرجان میں جڑے ہوئے موتی،

پستان جیسے انار، سرین بھاری، انگلیاں مخروطی ان کے سرے حنا[1] سے سرخ سے رنگین!

اس عہد کی عورتیں زیبائش و آرائش کے لیے ایک قسم کی قبہ نما ٹوپی پہنا کرتی تھیں۔ اس کے نچلے سرے کے اطراف ایک پٹی لگی ہوتی تھی۔ اور اس پٹی کو جواہرات سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ نسوانی حسن و جمال کی آرائش کے اور لوازمات میں پازیب اور کنگن بھی استعمال ہوتے تھے۔ مردوں کے لباس کی وضع قطع بدلتی رہی، لیکن اس وقت سے آج تک اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ شام و لبنان کے بڑے بوڑھے اب بھی وہی قدیم وضع کا لباس پہنتے ہیں۔ عام طور پر مرد نمدے یا اون کی نکیلی سیاہ ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ان کی پوشاک ایرانی اصل کے پاجامے، قمیص، عبا، صدری اور جبہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ جُبّہ کا لفظ عربی زبان سے اسپینی زبان میں منتقل ہوا ہے۔ چنانچہ دسویں صدی کی اسپینی لغت میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ اسپینی زبان کے ذریعہ سے یہ لفظ تمام رومانی زبانوں میں منتقل ہوا اور سلافی زبان کے سوا انگریزی اور دوسری جرمانی زبانوں میں بھی داخل ہو گیا۔ انگریزی زبان میں اس لفظ نے گبٹ ( Gibbet ) کے لفظ کی صورت میں اپنی دلچسپ یادگار چھوڑی ہے۔ انگریزی میں اس لفظ کے معنی "دار" کے ہیں۔

گھر کا سب سے نمایاں فرنیچر ایک صوفہ ہوتا تھا جو کمرے کے تین پہلوؤں پر محیط ہوتا تھا۔ اس کو دیوان کہتے تھے۔ پہلے حکمراں خاندان کے دور میں کرسیوں کی شکل کی اونچی نشستوں کا رواج ہو چلا تھا۔ لیکن گدی دار مربع وضع کی چھوٹی چٹائیاں (انگریزی میں Mattress کا لفظ عربی لفظ مترہ سے آیا ہے جس کے معنی چٹائی کے ہیں) ہی عام طور پر استعمال ہوتی تھیں اور ان کا فرش کر کے لوگ ان پر آرام سے زانو بچھا کر بیٹھتے تھے۔ زمین پر ہاتھ کے بنے ہوئے قالین کا فرش ہوتا تھا۔ کھانا پیتل کی چوڑی گول کشتیوں میں

---

[1] مہندی کے لیے انگریزی لفظ (Henna) عربی لفظ 'حنا' ہی سے لیا گیا ہے۔

چناجاتا تھا۔ اور یہ کشتیاں دیوان یا فرشی گدیوں کے مقابل ایک نیچی میز پر رکھی جاتی تھیں خوش حال گھرانوں میں یہ کشتیاں چاندی کی اور میز لکڑی کی ہوتی تھی میز پر آبنوس، سیپ یا کچھوے کے خول کی پچی کاری ہوتی تھی۔ یہ میز بالکل ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ آج بھی دمشق میں بنائی جاتی ہے۔ جو لوگ کبھی کبھوتیں، ٹڈیوں اور سوسماروں کو شوق سے نوش جان کیا کرتے تھے، چاول کو ایک زہریلی چیز سمجھتے اور آٹے کی چپٹی ٹکیوں پر لکھتے تھے، وہ لوگ اب متمدن دنیا کی نفیس اور خوش ذائقہ غذاؤں کی لذتوں سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔ ایران کے دم پخت کھانے، نفیس حلوے، اور مٹھائیاں انہیں بڑا مزہ دینے لگی تھیں۔ اب یہ اپنے چوزوں کو دودھ، بادام اور اخروٹ کھلا کھلا کر تر و تازہ کرنے لگے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں ان کے مکان برف سے ٹھنڈے کیے جاتے تھے بے نشہ مشروبات شربت کی صورت میں استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ مشروبات پانی کے ہوتے تھے انہیں شکر ملا کر شیریں اور بنفشہ، کیلے، گلاب یا شہتوت کا عرق ڈال کر معطر اور لذیذ بنا لیا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی تک کافی پینے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور نئی دنیا کی دریافت تک تمباکو سے تو کوئی واقف ہی نہ تھا۔ نویں اور دسویں صدی کے درمیانی زمانے کے ایک مصنف نے اپنی کتاب میں اس زمانے کے ایک مہذب اور شائستہ آدمی کے جذبات اور اس کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ شخص خوش اخلاق ہے، مردانہ صفات رکھتا ہے مہذب اور شائستہ ہے۔ ٹھٹول اور مذاق سے پرہیز کرتا ہے۔ اپنے ہم رتبہ لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کے معیارِ شرافت بہت اونچے ہیں۔ وعدے پورے کرنے میں پکا ہے۔ راز فاش نہیں کرتا، صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے، دسترخوان پر چھوٹے نوالے اٹھاتا ہے۔ باتیں کم کرتا ہے اور ہنستا بھی کم ہے۔ غذا کو آہستہ آہستہ چباتا ہے، اپنی انگلیاں نہیں چاٹتا، لہسن اور پیاز کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ نگار خانوں، حماموں، عام مجلسوں اور بازاروں میں دانتوں میں خلال کرنا اسے گوارا نہیں۔

نشہ لانے والی مشروبات سے بھی لوگ اکثر اوقات خلوت و جلوت میں لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ اصفہانی کی کتاب اغانی اور الف لیلہ کی بے شمار داستانوں، شراب کی تعریف میں بے حساب اشعار اور قصیدوں کو سامنے رکھ کر دین اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت حرمتِ شراب کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امتناعی حکم سے بادہ نوشی کی عادت اس سے زیادہ نہیں چھوٹی جتنی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دستور کی اٹھارویں دفعہ نے چھڑائی ہے۔ خلیفہ، وزیر، شہزادے اور قاضی تک اس شرعی حکم کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اور کھجور سے بنی ہوئی شراب ۔ خمر ۔ لوگوں کا دل پسند مشروب بنا ہوا تھا

"دخت رز" ۔ بنت الحان ۔ اور راگ رنگ کی بزم آرائیوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ پینے پلانے کی ان بزموں میں مہمان اور میزبان دونوں اپنی داڑھیوں کو مشک یا عرق گلاب سے معطر کر کے خاص قسم کی بھڑکیلی پوشاکیں پہن لیا کرتے تھے۔ عوددان ۔ مجمر ۔ میں عنبر یا الوے کی لکڑی جلا کر اس کے بخور سے کمرہ کو مہکایا جاتا تھا۔ گانے والی عورتیں بھی ان محفلوں میں شریک ہوا کرتی تھیں اور جیسا کہ اکثر قصوں سے ظاہر ہے ایسی عورتیں اس زمانے کے نوجوانوں کے اخلاق کے لیے ایک مہلک خطرہ بن گئی تھیں۔ نصرانی خانقاہوں میں دنیاداری نے شراب کی حد تک رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اور ملک کے خاص مے خانوں کا انتظام بڑی حد تک یہودیوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہودی اور نصرانی دونوں اس زمانے میں "پیر مغاں" بنے ہوئے تھے۔

النظافۃ من الایمان "صفائی ایمان کا جزو ہے" یہ رسول اللہ کی ایک حدیث ہے اور آج بھی تمام اسلامی ملکوں کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے حضرت محمد سے پہلے عرب میں حماموں کا وجود ہی نہ تھا کہتے ہیں کہ حماموں کو آپ پسند نہ کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو حماموں میں صرف طہارت کے لیے جانے اور کپڑا باندھ کر نہانے کی اجازت دی

تھی۔ جس زمانہ کے واقعات ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس وقت تک حماموں کا رواج نہ صرف یہی غسل اور اس کے صحت بخش اثرات کے تحت عام ہو چکا تھا، بلکہ محض تفریح اور عیش گاہوں کی حیثیت سے بھی یہ حمام بہت مقبول ہو گئے تھے۔ عورتوں کو بھی ان کے لیے خاص طور پر مخصوص کیے ہوئے دنوں میں حماموں میں جانے کی اجازت تھی۔ دسویں صدی کی ابتدا میں شہر بغداد میں کم و بیش ستائیس ہزار حمام موجود تھے۔ اس کے بعد کے زمانوں میں یہ تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی لیکن عربی ماخذوں کے اکثر اعداد کی طرح یہ اعداد بھی مبالغہ سے خالی نہیں۔ ایک مسلمان اندلسی سیاح ابن جبیر نے ۱۳۲۷ء میں شہر بغداد کی سیر کی تھی۔ اس وقت اس شہر کا مغربی حصہ تیرہ محلوں پر مشتمل تھا۔ اس سیاح نے ہر محلہ میں کم و بیش دو تین اعلیٰ قسم کے ایسے حمام دیکھے جن میں بہتا ہوا ٹھنڈا اور گرم پانی مہیا کیا جاتا تھا۔

آج کل کی طرح اس وقت کے حمام میں کئی کمرے ہوتے تھے، ان کے فرش پر پچی کاری کی جاتی تھی۔ اندرونی دیواروں پر سنگ مرمر لگا ہوتا تھا۔ اور تمام کمرے ایک کشادہ وسطی کمرے کے گرد بنائے جاتے تھے۔ کمرے کے اندر پانی کا ایک حوض ہوتا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ گرم پانی کا ایک فوارہ رہتا تھا اور اس کے بخار سے پورا کمرہ گرم کیا جاتا تھا بیرونی کمرے آرام کرنے اور نقل و مشروبات سے لطف اندوز ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

تمام تاریخوں میں آپ کو یہی ملیگا کہ فنونِ لطیفہ کی طرح کھیل اور تفریحی اسپورٹس بھی سامی تمدن سے زیادہ ہند و یورپی تمدن کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ کھیل کود سے جسمانی تکان ہوتی ہے اور جسمانی تکان سے محظوظ ہونے کو عرب کا شاعرانہ مزاج ایک مہمل سی بات سمجھتا ہے۔ وہ دن کی روشنی کی گرمی میں سنجیدہ کاموں کو ترجیح دیتا ہے۔

تاہم میدانی کھیلوں کی فہرست میں تیر اندازی، چوگان، گیند اندازی، صولجان (ایک طرح کی ہاکی یا کروکیٹ کے قسم کا کھیل)، شمشیر زنی، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ، اور سب سے بڑھ کر

شکار کے نام ملتے ہیں۔ اس زمانے کے لکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس عہد میں کسی شخص کو ہر دل عزیز بننے یا کسی امیر یا خلیفہ کی ہم جلیسی کا شرف حاصل کرنے کے لیے اور اوصاف کے سوا تیر اندازی، شکار، گیند اندازی اور شطرنج میں بھی دستگاہ پیدا کرنا ضروری تھا۔ ان تمام کھیلوں میں ایسا شخص حاکم وقت کے ساتھ بھی اس کی توہین کا اندیشہ کیے بغیر برابری کر سکتا تھا۔ خلفا میں خاص طور پر خلیفہ معتصم چوگان کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کے ترکی سپہ سالار افشین نے ایک بار اس کے مقابلہ میں چوگان کھیلنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں کھیل میں بھی امیر المومنین کے خلاف رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایک قسم کی گیند بازی کے متعلق تاریخوں میں دلچسپ تذکرے ملتے ہیں۔ اس کھیل میں لکڑی کا ایک چوڑا تختہ ــ طبطاب ــ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ٹینس کی ابتدائی شکل تو نہیں؟ عام طور پر ٹینس کے لفظ کا مشتق فرانسیسی زبان کا لفظ (Tenez) سمجھا جاتا ہے۔ اس کے معنی "متوجہ ہونے" کے ہیں۔ اور فرانسیسی زبان کا یہ لفظ غالباً ایک مصری شہر کے عربی نام "تنیس" سے لیا گیا ہے۔ یہ شہر دریائے نیل کے دو آبے میں واقع تھا، اور قرون وسطیٰ میں کتان کے کپڑے کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ یہ کپڑا غالباً ٹینس کے گولوں کی صنعت میں استعمال کیا جاتا تھا۔

شکار، جال اندازی اور شاہین بازی پر عربی زبان میں ابتداءً جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے مشغلوں سے گہری دلچسپی تھی۔ ان مشغلوں کے متعلق جو الفاظ ہمیں عربی زبان میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے شاہین بازی اور بازنوازی ایران سے سیکھی تھی۔ یہ مشغلے خاص طور پر خلافت کے ختم ہونے کے بعد جو دور آئے ہیں ان میں اور صلیبی جنگوں میں بہت مقبول ہو گئے تھے۔ ایران، عراق اور شام میں اب بھی شاہین اور باز کے ذریعہ شکار کھیلا جاتا ہے۔ اس شکار کا طریقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ الف لیلہ میں بیان کیا گیا ہے۔ شکار کو پکڑ

لینے کے بعد مسلمان شکاری کا پہلا کام شکار کو ذبح کرنا ہوتا ہے۔ ذبح کرنے سے پہلے شکار مر جائے تو ایسے شکار کا گوشت حرام ہو جاتا ہے۔

معاشرے میں خلیفہ، خلیفہ کا خاندان، سرکاری عہدے دار، اور ان سب کے حاشیہ نشینوں کا مرتبہ سب سے اونچا تھا۔ حاشیہ نشینوں میں ہم سپاہیوں، محافظ دستوں ان کے منظورِ نظر دستوں، ہم جلیسوں اور مصاحبوں کے ساتھ ساتھ موالی اور خادموں کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

تقریباً سب کے سب خدام غلام ہوا کرتے تھے۔ یہ خدام غیر مسلم قوموں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ یہ جبراً پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ جنگ میں اسیر ہو کر آتے تھے یا امن کے زمانے میں خریدے جاتے تھے۔ ان میں بعض غلام حبشی ہوتے تھے، کچھ ترک اور کچھ سفید فام ہوتے تھے۔ سفید فام غلام زیادہ تر یونانی، سلافی، آرمینی اور بربر نسل کے ہوتے تھے۔ ان غلاموں میں بعض خصی کیے ہوئے ہوتے تھے۔ حرم کی خدمت ایسے ہی غلاموں کے سپرد کی جاتی تھی۔ بعض غلاموں کو "غلمان" کہا جاتا تھا۔ غلمان بھی خصی کیے ہوئے ہوتے تھے۔ ان غلاموں پر ان کے مالکوں کی خاص نظر عنایت رہتی تھی۔ یہ بیش بہا اور پُر تکلف کپڑے، پہنے عورتوں کی طرح بناؤ سنگار کر کے بیٹھتے تھے۔ غلمان کا تذکرہ ہمیں ہارون الرشید کے عہد میں ملتا ہے لیکن یہ خلیفہ امین کا کارنامہ ہے کہ اس نے ایران کی تقلید میں دنیائے عرب میں غیر فطری جنسی تعلقات کے لیے غلمان کا طریقہ رائج کیا تھا۔

وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ امین کا ایک قاضی ایسے چار سو نوجوانوں سے لطف اندوز ہوا تھا۔ اس زمانے کے شاعر اپنی غزلوں اور اپنے قصیدوں میں "بے ریش و بروت نوخیز لڑکوں" کو مخاطب کرنے اور ان کی نسبت کھلے بندوں اپنے مبتذل اور رکیک جذبات کا اظہار کرنے سے نہیں جھجکتے تھے۔

دوشیزہ لونڈیوں سے مغنیوں، رقاصاؤں اور داشتاؤں کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

بعض لونڈیاں اپنے مالک خلفاء پر بہت زبردست اثر رکھتی تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید کی لونڈی ذات الخال کا بھی یہی حال تھا۔ اس کو ہارون نے ستر ہزار درہم میں خریدا اور پھر ایک دن جوشِ رقابت میں اسے ایک غلام کو بخش دیا۔ ہارون رشید ایک وقت کسی مغنیہ کا شیدا ہو گیا تھا۔ ہارون کی ملکہ زبیدہ نے ہارون کے حضور میں دس دوشیزہ لونڈیاں پیش کیں تاکہ ہارون ان کی صحبت میں اپنی محبوبہ کو بھلا کر صرف زبیدہ کا ہو رہے۔ چنانچہ ان دس لونڈیوں میں سے دو کی اولاد کو عباسی خلفاء کی فہرست میں داخل ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ یعنی ایک سے مامون اور دوسری سے معتصم پیدا ہوا۔ الف لیلہ میں ایک ماہ طلعت فرزانہ لونڈی تودد کی یہ مشہور حکایت درج ہے کہ دربارِ خلافت کے علماء اور فضلاء کی مجلس میں طب، فقہ، نجوم، فلسفہ، موسیقی اور ریاضی۔۔۔ خطابت، صرف ونحو، شاعری، تاریخ، اور قرآن سے قطع نظر۔۔۔ میں اس لونڈی کا امتحان لیا گیا۔ یہ لونڈی ان تمام فنون میں کامیاب نکلی۔ اس پر خلیفہ ہارون نے اس لونڈی کو ایک لاکھ درہم میں خریدنا چاہا۔ اس حکایت سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی بعض لونڈیوں کی تعلیم و تربیت کتنے اعلیٰ پیمانہ پر کی جاتی تھی۔ خلیفہ امین کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لڑکیوں کی ایک زنانہ جمعیت قائم کی تھی۔ یہ لڑکیاں اپنی زلفیں کٹائے، لڑکوں جیسا لباس پہنے ریشمی عمامے باندھے رہتی تھیں۔ یہ بدعت بہت جلد معاشرے کے اونچے اور نیچے طبقوں میں مقبول ہو گئی۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ مجھے ایک دن خلیفہ مامون کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں نے خلیفہ کے حضور میں بیس یونانی دوشیزاؤں کو دیکھا جو بیش قیمتی اور زیور سے آراستہ تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی صلیبیں لٹک رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں کھجور اور زیتون کی ٹہنیاں لیے رقص کر رہی تھیں۔ خلیفہ نے انہیں تین ہزار دینار انعام دیے تب کہیں یہ شاندار ڈرامہ ختم ہوا۔

ایک روایت ہے کہ خلیفہ المتوکل کے محل میں چار ہزار خواصیں تھیں اور کہا جاتا ہے

کہ ان خواصوں کو (چاہے آپ مانیں نہ مانیں) خلیفہ کا بسترِ عیش نصیب ہو چکا تھا۔ صوبوں کے والیوں اور لشکر کے امیروں کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ خلیفہ یا وزیر کے حضور میں نذرانے گزرانتے تھے۔ ان نذرانوں میں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان کی متعلقہ رعایا کی طرف سے نذر گزراننے والوں کو اسی غرض کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ یا پھر انہیں رعایا سے جبراً حاصل کیا جاتا تھا۔ جو عامل یا امیرِ لشکر ایسا نہ کرتا اُسے باغی سمجھا جاتا تھا۔

عوام کی جماعت میں دو طبقے تھے۔ اس کا اونچا طبقہ امراء کے طبقے کی حد سے جا ملتا تھا۔ اس طبقہ میں اہلِ علم، عالم، فن کار، صناع اور اہلِ حرفہ داخل تھے۔ یہ لوگ دیسی آبادی کی نمائندگی کرتے تھے اور اس زمانے میں انہیں "ذمیوں" کا مرتبہ حاصل تھا۔

مملکت کی غیر معمولی وسعت اور تمدن کی بلندی نے بین قومی تجارت کا راستہ سجھایا۔ پہلے پہل تجارت کے میدان پر نصرانی یہودی اور زردشتی چھائے ہوئے تھے لیکن آگے چل کر مسلمانوں اور عربوں نے ان کی جگہ لینی شروع کر دی۔ زراعت کی طرح عرب اور مسلمان تجارت کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اب بغداد، بصرہ، سیراف، قاہرہ اور اسکندریہ کو تجارتی حیثیت سے فروغ حاصل ہونے لگا اور بہت جلد یہ شہر بری اور بحری تجارت کے زبردست مرکز بن گئے۔

مشرق کی طرف مسلمان تاجروں کے قافلے چین تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں ان کی تجارت ریشم پر مبنی تھی۔ چین نے مغرب کو جو اولین نفیس تحفے دیے ہیں ان میں سے ایک ریشم بھی ہے، چنانچہ اسی بنا پر وہ تجارتی راستہ جو سمرقند اور چینی ترکستان سے گزرتا ہوا چین کو جاتا ہے "طریق الحریر" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا لیکن آج اس راستہ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ معمورۂ دنیا کے تقریباً تمام راستوں کے مقابلے میں اس راستہ پر مہذب انسان کا بہت ہی کم گذر ہوتا ہے۔ تجارتی اسباب عام طور پر ڈاک کی چوکیوں کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا اور شاذ ہی کوئی کارواں اس راستے کو پورا طے کرتا تھا۔

مغرب کی طرف مسلمان تاجر مراکش اور ہسپانیہ تک پہنچ چکے تھے۔ موجودہ نہر سویز کے بانی ڈی لسیپس (de Lesseps) سے ایک ہزار سال پہلے ہی ایک عرب خلیفہ ۔ ہارون الرشید ۔ کے ذہن میں خاکنائے سوئز میں ایک نہر کھدانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ تاہم بحر روم میں عرب جو تجارت کرتے تھے وہ کبھی ترقی نہ کر سکی۔ دسویں صدی عیسوی میں والگا کے شمالی منطقوں کے ساتھ سرگرم تجارت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بحیرۂ اسود بھی عربوں کی ساحلی تجارت میں ممد و معاون ثابت نہ ہو سکا۔ البتہ بحیرۂ خزر چونکہ ایران کے تجارتی اور سمرقند و بخارا جیسے آباد شہروں اور ان کے نواحی علاقوں سے بہت زیادہ قریب واقع تھا، اس لیے یہ زبردست تجارتی تعلقات کا مرکز بن گیا۔ مسلمان تاجر اپنے ساتھ کھجور، شکر، روئی، اونی کپڑے، لوہے اور شیشے کا سامان دساور لے جایا کرتے تھے۔ اور دوسری تجارتی چیزوں کے سوا وہ اپنے ملک میں گرم مسالہ، کافور اور ریشم ایشیائے بعید سے اور ہاتھی دانت اور حبشی غلام افریقہ سے درآمد کیا کرتے تھے۔

بغداد کے صرف ایک جوہری ابن الجصاص ہی کے قصہ سے اس زمانے کے ارب پتی روتھ شیلڈ ون اور کھرب پتی راک فلروں (Rockefeller اور Rothschild) امریکہ کے بہت بڑے کارخانہ دار اور بے حساب دولت کے مالک ہوئے ہیں) کی جمع کی ہوئی بے شمار دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جوہری کے پاس اتنی دولت تھی کہ خلیفۂ وقت نے ایک بار اس کی جائداد میں سے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ دینار ضبط کر لیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس شخص کی دولتمندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور وہ جوہریوں کے ایک خاندان کا گل سرسبد بنا رہا۔ بصرہ کے بعض تاجروں میں سے ہر ایک کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ درم سے بھی زیادہ تھی۔ ان تاجروں کے تجارتی جہاز دنیا کے دور دراز مقاموں تک جایا کرتے تھے۔ بصرہ اور بغداد کے ان پڑھ پن چکّی والے بھی غریبوں اور محتاجوں کو روزانہ ایک سو دینار بطور خیرات تقسیم کر سکتے تھے۔ سیراف کے ایک متوسط

درجے کے تاجر کا خانگی خرچ دس ہزار دینار اور بعض کا تیس ہزار دینار تھا۔ بہت سے بحری تاجروں کی فی کس سالانہ آمدنی چار لاکھ دینار سے بھی زیادہ تھی (ایک دینار موجودہ امریکی سکے ڈالر کے تقریباً ۴،۴ کے برابر ہوتا تھا)۔

اگر گھریلو صنعتوں اور زراعت کو بڑے پیمانوں پر فروغ حاصل نہ ہوتا تو کوئی بھی تجارت اس درجۂ کمال کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ مملکت کے مختلف حصوں میں دیسی صنعت کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ مغربی ایشیا میں جن صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا ان میں زیادہ تر کمبل سازی، قالین بافی، سوتی اور اونی کپڑے بننے، اطلس، دیبا اور زربفت صوفوں ۔ عربی صفہ ۔ مسندوں اور تکیوں کے غلاف بنانے کی صنعتیں شامل ہیں۔ اس کے سوا ان ملکوں میں فرنیچر اور برتن بھی بنائے جاتے تھے۔ ایران اور عراق کے اکثر علاقوں میں اعلیٰ درجہ کے قالین اور کپڑے تیار ہوتے تھے۔ ان صنعتوں کی خاص خاص امتیازی علامتیں قائم کی گئی تھیں۔ ایک خلیفہ کی ماں نے اپنے لیے ایک خاص شال تیار کرائی تھی۔ اس شال پر تیرہ کروڑ درم لاگت آئی تھی۔ اس پر ہر قسم کے پرندوں کے زریں نقش کاڑھے گئے تھے، اور پرندوں کی آنکھوں میں لعل و یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھر ٹانکے گئے تھے۔ بغداد کے ایک محلہ کا نام "عتاب" تھا۔ یہ نام ایک اموی شہزادے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس محلہ کے رہنے والوں میں وہ سب سے زیادہ صاحب اثر آدمی تھا۔ اس محلہ میں ایک خاص قسم کا دھاری دار کپڑا بُنا جاتا تھا۔ اس کپڑے کا نام بھی محلہ کی نسبت سے "عتبی" پڑ گیا تھا۔ یہ کپڑا سب سے پہلے اسی محلہ میں بارہویں صدی میں تیار کیا گیا تھا۔ اسپین کے عرب بھی اسی نمونے کا کپڑا تیار کرنے لگے تھے۔ اور فرانس، اطالیہ، اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں یہ کپڑا "تابی" (Tabi) کے تجارتی نام سے مشہور ہو گیا تھا اور آج تک یہ اصطلاح لفظ (Tabby) کی صورت میں موجود ہے اس لفظ سے ایسی بلی مراد لی جاتی ہے جس کی پیٹھ پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ کوفہ

میں ریشم پیدا ہوتا تھا، یہاں سر کے ریشمی رومال بھی بنے جاتے تھے۔ یہ رومال اب بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور ان رومالوں کو "کوفیہ" کہا جاتا ہے۔

خوزستان کے شہر تُستَر اور سوس (اس کا قدیم نام سوسیانا Susiana تھا) میں کئی کارخانے ایسے تھے جو دمشق — کپڑے کی ایک قسم، جو ابتدا میں دمشق میں تیار ہوتا تھا — کی زردوزی اور نقلی ریشم کے پردوں کے لیے مشہور تھے۔ یہاں کے نقلی ریشم کی عباؤں کی طرح اونٹ اور بھیڑ کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے بھی دور دور مشہور تھے۔ شیراز میں ان کی دھاری دار عباؤں کے سوا جالیاں، کمخواب اور زربفت کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے۔ قرون وسطیٰ کی یورپی خواتین، اپنے شہروں کی دکانوں سے ایرانی ریشمی کپڑا "تافتہ" — یہ ایک فارسی لفظ ہے — خریدا کرتی تھیں۔ ان ملکوں میں یہ کپڑا Tafeta کے نام سے مشہور تھا۔

صور، صیدا اور دوسرے شامی شہروں کے شیشے صفائی اور نزاکت کے لحاظ سے ضرب المثل بن گئے تھے۔ یہ صنعت شیشہ سازی کی قدیم فنیقی صنعت کی باقیات تھی اور قدامت کے اعتبار سے تاریخ میں مصر کی شیشہ سازی کی صنعت کے بعد اسی کا نمبر تھا۔ صلیبی لڑائیوں کے نتیجے کے طور پر شامی شیشہ یورپ کے بڑے بڑے کلیساؤں کے رنگین شیشوں کا پیش رو بن گیا۔ شام میں شیشے اور دھات کے جو ظروف بنائے جاتے تھے ان کی مانگ برتنے اور تزئین و آرائش کے لیے بہت زیادہ تھی۔

لکھنے کے کاغذ کی صنعت بھی خاص طور پر بڑی اہم چیز ہے۔ یہ صنعت آٹھویں صدی کے وسط میں چین کے واسطے سے سمرقند میں رائج ہوئی۔ سنہ ۷۰۳ء میں سمرقند مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس شہر کا کاغذ نفاست کے اعتبار سے بے نظیر سمجھا جاتا تھا۔ آٹھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی بغداد میں کاغذ بنانے کا اولین کارخانہ قائم ہو چکا تھا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ مملکت کے دوسرے حصوں میں بھی کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوتے گئے۔ مصر میں یہ کارخانہ سنہ ۹۰۰ء کے قریب قائم ہوا۔ مراکش میں سنہ ۱۱۰۰ء میں اور اسپین میں

۱۱۵۰ء کے قریب ان کارخانوں میں مختلف قسم کے سفید اور رنگین کاغذ تیار کیے جاتے تھے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا، اسلامی اندلس اور اطالیہ سے بارہویں صدی میں کاغذ سازی کی صنعت نصرانی یورپ میں منتقل ہوئی اور یہاں متحرک ٹائپ کے ذریعہ طباعت کی دریافت کی بدولت اس صنعت نے اس تعلیم عام کی اشاعت کے امکان پیدا کیے جس سے آج یورپ اور امریکہ دونوں بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

پہلے عباسی خلفاء کی سرپرستی میں زراعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس سرپرستی کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ان خلفاء کا دارالخلافہ خود ایک ایسے سیلابی میدان میں واقع تھا جو زراعت کے لیے بہت موزوں تھا۔ زراعت کی ترقی کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ خلفاء اس کو مملکت کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ سمجھتے تھے اور کاشتکاری تمام کی تمام دیسی باشندوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان دیسی باشندوں کی حالت اس نئے نظام حکومت کے تحت ایک حد تک سدھر گئی تھی۔ مملکت کے مختلف حصوں میں جو زرعی آبادیاں اور دیہات ویران اور غیر آباد پڑے تھے۔ انہیں رفتہ رفتہ نئے سرے سے بسایا گیا۔ مصر کو چھوڑ کر دجلہ اور فرات کی وادی کا نشیبی حصہ پوری مملکت میں سب سے زیادہ زرخیز حصہ تھا۔ بلاغ عدن کے اس روایتی محل وقوع پر مرکزی حکومت خاص توجہ کرتی تھی۔ دریائے دجلہ سے جو نہریں نکالی گئی تھیں ان کا پیچ پیچ ایک جال سا بچھ گیا تھا۔ عرب جغرافیہ داں ان خلفاء کے نہریں کھدوانے یا نکلوانے کا جو ذکر کرتے ہیں اس کے متعلق یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہریں اکثر و بیشتر وہی ہوتی تھیں جو سلطنت بابل کے زمانہ میں کھدائی گئی تھیں لیکن امتداد زمانہ سے وہ پٹ کر نظروں سے غائب ہوگئی تھیں۔ اب انہیں تحقیقات کے بعد نئے سرے سے کھودا یا نکالا جا رہا تھا۔ مصر کی طرح عراق میں بھی نہروں کی کھدائی میں زیادہ قدیم نہروں ہی کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے بھی جب دولت عثمانیہ نے سر ولیم ول کاکس (Sir Willim Willcocks) کو عراق کی

آبپاشی کے مسئلہ کی تحقیقات پر مامور کیا تو ولکاکس نے اپنی رپورٹ میں نئی نہریں کھدوانے کی بجائے پانی کی ان ہی قدیم گزرگاہوں کو صاف کرانے پر زور دیا تھا۔ تاہم یہ بات قابل لحاظ ہے کہ عباسی عہد کے بعد سے اس سیلابی میدان کی سطح میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ اور دجلہ و فرات نے اپنے راستے بھی بہت بڑی حد تک بدل دیے ہیں۔

جتنی ترکاریاں اور میوے آج کل مغربی ایشیا میں پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ترکاریوں اور میووں سے اس زمانے کے لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ البتہ آم، آلو، ٹماٹر اور اس قسم کی دوسری ترکاریاں اور میوے جو حالیہ زمانوں میں نئی دنیا سے پرانی دنیا میں لائے گئے ہیں ان سے یہ لوگ واقف نہ تھے۔ نارنج کا درخت حوض اور لیمو کے درخت کے ساتھ تقریباً ہر بڑے گھر میں پایا جاتا تھا۔ یہ درخت شمالی ہند یا ملایا کی پیداوار ہے یہاں سے یہ درخت مغربی ایشیا اور بحیرۂ روم سے متصل علاقوں میں پھیلا اور آخرکار ہسپینی عربوں کے ذریعہ یورپ پہنچا۔ جنوب مغربی ایران کے گنے کے کھیت اور شکرسازی کے کارخانے دور دور تک مشہور تھے۔ اس زمانے میں شامی ساحل پر ایسے ہی کھیت لگائے جانے لگے تھے اور شکر بنانے کے کارخانے بھی قائم ہوچکے تھے۔ یہیں سے بعد میں صلیبی سورماؤں نے یورپ کو گنے اور شکر سے روشناس کرایا۔ اس طرح یہ جنسِ شیریں جسے غالباً پہلے پہل بنگال نے جنم دیا تھا، اور جو اس وقت سے متمدن انسان کی روزمرہ کی غذا کا لازمی جزو بنی ہوئی ہے، مشرق سے نکل کر مغرب میں پھیلی۔

مملکت کی آبادی کا بڑا حصہ زرعی طبقہ پر مشتمل تھا۔ یہی طبقہ محصول وصول کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ یہ کسان ملک کے اصلی باشندے تھے۔ لیکن اب ان کا درجہ گھٹا کر ذمیوں کے برابر کر دیا گیا تھا۔ ذمی وہ لوگ ہوتے تھے جن کے ساتھ مذہبی روا داری کا معاہدہ طے کیا جاتا تھا۔ زرعی کاروبار کو عرب اپنے شایان شان نہیں سمجھتے تھے۔ ابتداً میں ذمیوں کا طبقہ اہل کتاب یعنی نصرانیوں، یہودیوں اور صابیوں پر مشتمل تھا لیکن

اس کے بعد اس طبقہ میں بعض دوسرے فرقے بھی شریک کیے جانے لگے۔ دیہاتوں اور زرعی آبادیوں کے ذمی اپنی پرانی تہذیب سے چمٹے اور اپنی مقامی بولیوں کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ ان سے کیے ہوئے معاہدے پر مجموعی حیثیت سے سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی لیکن کبھی کبھار مذہبی تعذیب بھی اپنا رنگ دکھا جاتی تھی۔

شہروں میں نصرانی اور یہودی اہم مالی، دفتری اور پیشہ ورانہ خدمتوں پر فائز تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں ان کے خلاف رشک و حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ رشک و حسد سرکاری احکام میں بھی راہ پانے لگا تھا لیکن ان امتیازی احکام میں سے اکثر تو کاغذی زینت ہی بنے رہے اور انہیں ہمیشہ نافذ رہنے کا موقع نہیں ملا۔

متقی اموی خلیفہ عمر ثانی نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ نصرانی اور یہودی خاص قسم کا لباس پہنا کریں۔ آپ نے ان لوگوں کو سرکاری دفتروں سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔ عباسی خلفاء میں ہارون پہلا خلیفہ ہے جس نے بعض قدیم قوانین کو پھر سے نافذ کیا تھا۔ خلیفہ متوکل نے ۸۵۰ء اور ۸۵۴ء میں یہ فرمان صادر کیا تھا کہ نصرانی اور یہودی اپنے گھروں پر بھوتوں کی چوبی شکلیں آویزاں رکھیں، اپنی قبروں کو زمین کے برابر بنائیں، اوپر کا لباس شہد جیسا یعنی زرد رنگ کا پہنیں اور اپنے غلاموں کے کپڑے میں زرد رنگ کے دو پیوند آگے پیچھے لگائیں۔ صرف خچروں اور گدھوں پر بیٹھیں اور ان پر چوبی زینوں کے سوا اور کچھ نہ ہو، اور ان زینوں کے پچھلے سروں پر انار جیسے دو گولے اُبھرے ہوئے ہوں۔ اس مخصوص لباس کی وجہ سے ذمی "ارقط" ـ پٹے دار ـ کہلانے لگے تھے۔ ذمیوں کی ایک اور بڑی دشواری جو بڑی کٹھن تھی، اس زمانے کے قاضیوں کا یہ فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کے خلاف کسی نصرانی یا یہودی کی شہادت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ان لوگوں نے توریت اور انجیل جیسی کتابوں تک میں تحریف کی ہے جس کا شاہد قرآن ہے۔ اس لیے ان پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن ان پابندیوں

کے باوجود خلفاء کی سرپرستی میں نصرانیوں کے ساتھ بہت زیادہ رواداری برتی جاتی تھی۔ حدیہ کہ نویں صدی کے نصف آخر میں بعض نصرانی وزارت جیسے بڑے منصب پر فائز کیے گئے تھے۔ ایسے نصرانی اعلیٰ عہدہ داروں کا ویسا ہی ادب کیا جاتا جیسا کہ عام قاعدہ تھا۔ کیونکہ ہمیں تاریخوں میں یہ بیان بھی ملتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو ان عہدہ داروں کے ہاتھوں پر بوسہ دینے میں تامل تھا۔ خلفاء کے تحت نصرانیت کی ایک اہم ترین اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنے اندر مدافعت کی کافی قوت پیدا کرلی تھی اور اس کے مبلغ ہندوستان اور چین جیسے دور دراز ملکوں تک جایا کرتے تھے۔

"ذمی" یعنی جن کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے، ایسی قوموں کے لحاظ سے یہودیوں کی زندگی مجموعی طور پر نصرانیوں سے بھی زیادہ خوش گوار انداز میں گزر رہی تھی۔ حالانکہ قرآن میں ان کے خلاف بہت سی آیتیں ملتی ہیں۔ تاریخوں میں ہمارے پڑھنے میں آتا ہے کہ متعدد خلفاء کے عہد میں ایک سے زیادہ یہودی ذمہ دار سرکاری عہدوں پر فائز کیے گئے تھے۔ خود بغداد میں یہودیوں کی اپنی ایک کافی بڑی نوآبادی تھی۔ یہ نوآبادی زوالِ بغداد تک قائم رہی۔ ۱۱۶۹ء میں ایک ربی بنجامن التطیلی (Benjamin of Tudela) اس نوآبادی کو دیکھنے آیا تھا۔ اس وقت یہاں دس ربانی مدرسے اور تینتیس ۳۳ صلواتیں قائم تھیں سب سے بڑی صلوات پنج رنگی سنگ مرمر سے آراستہ اور سونے چاندی کے سامان سے مزین تھی۔ یہاں کے سب سے بڑے ربی کا جیسا اعزاز و احترام کیا جاتا تھا اس کو بنجامن بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ سب سے بڑے ربی کو حضرت داؤد کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ یہ یہودیوں کے تمام فرقوں کا صدر اور خلافت بغداد کا مطیع و فرمانبردار تھا۔ خلیفۂ وقت کے دربار میں وہ اس شان سے جاتا تھا کہ بدن پر زردوزی ریشم کا لباس، ہر پر جواہرات سے جگمگ کرتا ایک عمامہ اور جلو میں کئی سوار ہوتے تھے اور آگے آگے ایک نقیب یہ صدا لگاتا جاتا تھا "افسحوا لسیدنا ابن داؤد"۔ ہمارے آقا ابن داؤد کے لیے راستہ

چھوڑ دو!"

یہ تھی عہدِ خلافت کے عوام کی زندگی اور ان کے آپسی تعلقات کی تصویر۔ اب ہم عربوں کی فتوحات کے تیسرے دور کی سیر ختم کر چکے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ پہلا دور عسکری اور سیاسی دور تھا — عربی فوجوں کی یلغار کا دور! دوسرا دور مذہبی دور تھا۔ اس کی ابتدا عباسی خلافت کی پہلی صدی سے ہوتی ہے۔ اس زمانے میں خلافت کی آبادی کی اکثریت اسلام میں داخل کر لی گئی تھی۔ تیسرا دور لسانی دور تھا۔ مفتوحہ قوموں کی مقامی بولیوں پر عربی زبان کی فتح کا دور۔ اس فتح کی رفتار سب سے زیادہ سست رہی اور مفتوحہ قوموں نے اس میدان میں زیادہ پامردی دکھائی۔ انسان اپنے سیاسی حتیٰ کہ مذہبی حقوق سے ایک بار دست بردار ہو سکتا ہے، لیکن زبان میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ اس کی بقا اور حفاظت میں وہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرتا۔

عربی کو ملکی زبان بننے سے پہلے علم و ادب کی زبان بننے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پچھلے بابوں میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آٹھویں صدی کے بعد آدمیں ایرانی، یونانی اور ہندوستانی ثقافتوں کے سرچشموں سے فکر و خیال کے نئے سوتے پھوٹ کر نکلے، اور ان سب نے مل کر ایک نئی ثقافت کا دریا بہا دیا۔ اب عربی زبان عربی ثقافت کے آلۂ کار کی حیثیت سے پوری طرح فتح پا چکی تھی اور فکر و نظر کے لحاظ سے اسلام کے زریں عہد میں بھی زبان اس کے نقیب کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ آنے والے باب میں ہم اسی پُرشکوہ جلوس کی شان و شوکت کا نظارہ کرنے والے ہیں۔

---

# ۱۲۔ ادب اور سائنس

اب ہم تاریخِ اسلام کے ایک ایسے دور میں داخل ہوگئے ہیں جس میں عربی زبان سائنس اور خاص کر طب، فلکیات، الکیمیا (یہ علم کیمیا کی ابتدائی شکل تھی)، جغرافیہ، ریاضیات، فلسفہ تاریخ، اخلاقیات اور ادب کی بالکل نئی اور اچھوتی تصانیف کی زبان بن گئی تھی۔ یہ دور نویں صدی کے نصف آخر میں ترجمہ کے دور کے بعد ہی شروع ہوتا ہے جو ۸۷۵ء سے ۹۸۵ء تک لگ بھگ ایک سو سال تک جاری رہا۔ تاریخ میں اس دور نے بعض زندہ جاوید ناموں کی کہکشاں چنی ہے۔ مغرب کے عوام بھی ان میں سے بعض کے ناموں سے واقف نکلیں گے۔ مگر آرٹ اور سائنس کے ہمارے زمانے کے طالب علم ان میں سے بہتوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہیں، بلکہ ان کا بڑا ادب و احترام بھی کرتے ہیں۔

اس وقت تک عرب نہ صرف ایران کے قدیم علم و فضل اور یونان کے کلاسیکی ورثہ پر پوری طرح عبور حاصل کر چکے تھے، بلکہ انہوں نے ان دونوں کو اپنی مخصوص ضرورتوں اور مخصوص طرزِ فکر کے سانچوں میں بڑی خوبی کے ساتھ ڈھال بھی لیا تھا۔ ان کے ترجمے جن میں عرب فکر صدیوں تک ضروری کمی بیشی کرتی رہی، نئے عطیوں کے ساتھ شام، اسپین اور صقلیہ کے ذریعہ یورپ منتقل ہوتے رہے۔ ان ترجموں پر ہی اس قانونِ علم کی بنیاد رکھی گئی جو قرون وسطی کے یورپ کی فکر پر چھایا رہا۔ تہذیبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے کسی قوم کی ذہنی ترقی کے لیے تالیف و ترجمہ طبع زاد تصنیف سے کچھ کم لازمی نہیں۔ ارسطو، جالینوس اور بطلیموس نے جو تحقیقاتیں کی تھیں وہ اگر ناپید ہوگئی ہوتیں تو دنیا کا دامنِ علم ان کے کارناموں سے ایسا ہی خالی رہتا جیسے وہ کبھی وجود ہی میں نہیں آئی تھیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ترجمے اور تصنیف کے درمیان ہمیشہ کوئی واضح حدِ فاصل قائم نہیں کی گئی

عرب مترجموں میں بہت سے مترجم ایسے بھی ہیں جنھوں نے ترجموں کے روپ میں دنیا کو طبع زاد تصانیف سے مالا مال کیا ہے۔

علمِ شغلسے عربوں کو جو دلچسپی تھی اس کی بڑی وجہ رسول اللہ کی وہ حدیث ہے جس نے علم کی دو شاخیں کردی ہیں: دین اور طب[1]۔ طبیب اپنے فن میں ماہر ہونے کے سوا مابعد الطبعیات کا جاننے والا، فلسفی اور حکیم بھی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں امراض میں ادویہ کے استعمال کے سلسلہ میں عربوں نے بعض اہم انکشافات کیے۔ یہ عرب ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے دوا فروشی ــ عطاری ــ کی دکانیں کھولیں، دوا سازی ــ صیدلہ ــ کا سب سے پہلا مکتب قائم کیا اور دواؤں کے خواص کے فن ــ قرابادین ــ پر اولین کتاب پیش کی۔ خلیفہ مامون ہی کے عہد سے دوا سازی پر ایک خاص امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ دوا فروشوں کی طرح طبیبوں پر بھی ایک آزمائش میں کامیابی لازم کی گئی تھی۔ غلط علاج کے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں خلیفہ المقتدر کے حکم سے ۹۳۱ء میں طبیبوں کا امتحان لینے کی غرض سے شہر بغداد میں ایک ممتاز طبیب سنان بن ثابت بن قرہ کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ اس طبیب کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صرف ایسے ہی طبیبوں کو علاج معالجہ کا اجازت نامہ عطا کرے جو مقررہ شرطوں پر پورے اتریں۔ شہر بغداد کے ایسے آٹھ سو ساٹھ سے بھی زیادہ طبیبوں نے اس علمی امتحان میں کامیابی حاصل کی اور سارا دار الخلافہ غیر مستند اور اناڑی طبیبوں سے پاک ہوگیا۔ اس زمانہ میں دیہی صحت عامہ جیسی ایک تنظیم بھی قائم کی گئی تھی۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ خلیفہ مقتدر کے وزیر علی ابن عیسیٰ کے حکم سے طبیبوں کی ایک جماعت دوائیں لیے جگہ جگہ مریضوں کے علاج معالجہ کا انتظام کرتی پھرتی تھی۔ کچھ طبیب روزانہ قید خانوں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ان حقائق سے صحتِ عامہ میں عربوں کی دانشمندانہ دلچسپی کی شہادت ایک ایسے زمانہ میں

[1] حدیث نبوی کے الفاظ ہیں: العلم علمان علم الادیان و علم الابدان۔ (مترجم)

ملتی ہے جب کہ باقی ساری دنیا ابھی اس کوچے سے ناآشنا ہی تھی۔ اسلامی عہد میں سب سے پہلا اقامتی شفاخانہ ۔ مستشفی ۔ نویں صدی کی ابتدا میں خلیفہ ہارون الرشید نے ایرانی بیمارستانوں کے نمونے پر قایم کیا تھا۔ اس کے بعد بہت جلد اسلامی دنیا میں تقریباً چونتیس شفاخانے قائم ہو گئے۔ قاہرہ میں سب سے پہلا شفاخانہ ابن طولون کے دور حکومت میں ۸۷۲ء کے قریب قائم ہوا اور پندرہویں صدی تک چلتا رہا۔ گیارہویں صدی میں سفری دواخانے بھی قائم ہو گئے۔ اسلامی شفاخانوں میں عورتوں کے لیے خصوصی وارڈ ہوا کرتے تھے۔ شفاخانے کا اپنا ایک الگ دواخانہ ہوتا تھا۔ بعض شفاخانے طبی کتب خانوں سے آراستہ تھے اور یہ فن طب کے لیے نصاب بھی مقرر کرتے تھے۔

علم طب کے ممتاز مصنف، جو اکابر مترجموں کے بعد ہی پیدا ہوئے، قومیت کے اعتبار سے ایرانی لیکن لسانی اعتبار سے عرب تھے۔ ان میں سے آج بھی دو مصنفوں ۔ رازی اور ابن سینا ۔ کی تصویریں جامعہ پیرس کے شعبۂ طب کے عظیم الشان ہال کی زینت بڑھا رہی ہیں۔

رازی، جس کو یورپ میں Rhezes کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ۸۶۵ء میں پیدا ہوا اور ۹۲۵ء میں انتقال کر گیا۔ رازی نہ صرف پوری دنیائے اسلام میں بلکہ تمام قرون وسطیٰ کے بدیع مفکروں اور طبیبوں میں سب سے زیادہ ذہین اور طباع مفکر اور طبیب ہوا ہے۔ وہ بغداد کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ کہتے ہیں کہ بغداد کے ایک نئے بڑے شفاخانے کا محل وقوع انتخاب کرنے کے لیے اس نے مختلف مقاموں پر گوشت کے ٹکڑے لٹکا دیے تھے۔ اور اس مقصد کے لیے اس نے اسی مقام کو منتخب کیا تھا جہاں گوشت کے سڑنے کی علامتیں سب سے کم پائی گئی تھیں۔ جراحی کی وہ سوئی جس سے زخم کھولا جاتا ہے اور جس کو انگریزی میں Seton کہتے ہیں، اسی کی ایجاد سمجھی جاتی ہے۔ الکیمیا پر اس نے عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک کتاب "کتاب الاسرار" بھی ہے۔ یہ

کتاب مختلف شارحوں اور مرتبوں کے ہاتھ سے گزرتی ہوئی بارہویں صدی کے آخر میں سری مونیا
کے نامور مترجم جیرارڈ (Gerard of Cremona) کے ہاتھوں لاطینی زبان میں منتقل
ہوئی۔ یہی کتاب الاسرار چودہویں صدی تک کیمیائی معلومات کا ایک زبردست سرچشمہ
بنی رہی۔ انگریز مفکر راجر بیکن (Roger Bacon) نے اپنی تصانیف میں
De Spiritliuo Corporibus کے نام سے اس کتاب کے اقتباسات دیے ہیں۔
رازی کے تمام طبی رسالوں میں اس کا وہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس نے چیچک
اور کھسرہ ــ الجُدری والحصبہ ــ پر لکھا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا رسالہ ہے اور
افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو بجا طور پر عربوں کے طبی ادب کا شہ کار سمجھا جاتا
ہے۔ لیکن رازی کا اہم ترین کارنامہ اس کی جامع کتاب "الحاوی" ہے۔ اس کتاب کا پہلا
لاطینی ترجمہ صقلیہ کے ایک یہودی فرج بن سالم نے انژو کے چارلس اول (Charles
of Anjou) کی سرپرستی میں ۱۲۷۹ء کے قریب کیا تھا۔ ۱۴۸۶ء کے بعد یہ کتاب یورپ
میں Continens کے نام سے کئی بار شائع ہوئی اور ۱۵۴۲ء میں بہ مقام وینس یہ
کتاب پانچویں بار چھپی۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب طبی معلومات کی قاموس
کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس میں ان تمام معلومات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ جو اس زمانے تک یونانی،
ایرانی اور ہندوستانی طبی ادب سے عربوں نے حاصل کی تھیں۔ اس کے سوا اس کتاب میں مصنف
نے اپنی تازہ تحقیقات بھی شامل کی ہیں۔ رازی کی طبی تصانیف ایک ایسے زمانے میں چھپیں جب
کہ چھپائی ابھی تک اپنا دورِ طفولیت ختم کر نہیں پائی تھی۔ اور چھپ کر لاطینی مغرب کے دماغوں پر
صدیوں تک نمایاں طور پر اثر انداز رہیں۔

عربی طب کی تاریخ میں رازی کے بعد دوسرا ممتاز نام ابن سینا ــ اسے یورپ والے
Avicenna کہتے ہیں ــ کا ہے۔ اس کی سب سے بلند پایہ قاموسی کتاب "القانون فی الطب"
ہے جس کا ترجمہ یورپ میں Canon کے نام سے کیا گیا تھا۔ اس زمانے کے طبی ادب میں اس کتاب

نے بتدریج وہ قدر و منزلت حاصل کر لی تھی کہ یورپ کی تمام طبی درس گاہوں میں اس کو درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی کے آخری تیس سالوں میں اس رسالہ کا ایک عبرانی اڈیشن اور پندرہ لاطینی اڈیشن شائع ہوئے۔ حال ہی میں انگریزی زبان میں اس کا جزوی ترجمہ ہوا ہے۔ ابن سینا نے اپنی اس کتاب کے باب "من العقاقیر والادویہ" میں کم و بیش سات سو ساٹھ دواؤں کے نام گنائے ہیں۔ بارہویں صدی سے لے کر سترہویں صدی تک مغربی دنیا میں اس کتاب کو ایک زبردست طبی رہبر کی حیثیت حاصل رہی ہے اور آج بھی اسلامی مشرق میں اس سے استفادہ جاری ہے۔ ڈاکٹر ولیم آسلر (Dr. W. Oslar) کے الفاظ میں یہ کتاب "تمام دوسری طبی کتابوں کے مقابلہ میں طویل ترین مدت تک طب کی انجیل بنی رہی ہے"۔

فلسفہ کے میدان میں عربوں کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے یونانی فکر کو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ کیا اور بے شبہ ایک نہایت شاندار کارنامہ تھا۔ عربوں کے نزدیک فلسفہ ایک ایسا علم تھا جس کے ذریعہ وہ جہاں تک قوائے انسانی کے امکان میں ہے، اشیاء کے حقیقی اسباب و علل کا جیسے کہ وہ ہیں پتہ چلایا جا سکتا تھا۔ اصل میں یونانیوں کے اس نقطۂ نظر کو عربوں نے اپنایا اور اسلام کے ذہنی میلانات سے مطابقت کے لیے ان کی مفتوحہ قوموں اور دوسرے اثرات کے تحت اس میں رد و بدل ہوا اور آخر کار عربی زبان کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا۔ یونانی علوم کے طالب علموں کی حیثیت سے عرب ارسطو کی تصانیف کو علم کا مکمل قانون اور جالینوس کی کتابوں کو علم طب کی میزان سمجھتے تھے۔ یونانی فلسفہ اور یونانی طب سے مراد وہ سب کچھ تھا جو اس وقت مغرب کے پاس تھا مسلمان ہونے کی حیثیت سے عربوں کا ایمان تھا کہ قرآن اور اسلامی دینیات مذہبی قانون اور عمل کی جامع ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے جو بھی اچھوتی تصنیفیں اور تحقیقاتیں عمل میں آئیں وہ ایک طرف فلسفہ و مذہب کے اور دوسری طرف فلسفہ و طب کے بین بین ہوتی تھیں۔ توحید یعنی خدا کے ایک ہونے کا تصور قدیم سامی دنیا کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ . . . . . . . . . اور یونانی

فلسفہ ہند الیوروپی دنیا کا سب سے بڑا تحفہ۔ اور قرون وسطیٰ کا لازوال کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے انسانی فکر کی تاریخ میں پہلی باران دونوں میں ہم آہنگی اور توافق پیدا کر دیا۔ اس طرح اسلام ہی نے نصرانی یورپ کو جدید فکر و نظر کی راہ سجھائی ہے۔

دنیائے قدیم اور قرون وسطیٰ میں — خاص کر دنیائے اسلام میں — علم کی تقسیم اور شعبہ واری تفریق اس سے کہیں کم تھی جتنی کہ آج کل ہم ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک فلسفی ماہر ریاضیات، استاذ موسیقی اور ایک ماہر فلکیات شاعر بھی ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر قارئین کو اسلام کے ممتاز ہیئت دانوں کی فہرست میں عمر خیام کا شہرۂ آفاق نام دیکھ کر یقیناً حیرت ہوتی ہو گی۔ اس ہیئت داں نے جو رباعیاں لکھی ہیں وہ اس کے نام سے بھی زیادہ مشہور ہیں۔ عمر خیّام اصل میں ایک ایرانی شاعر اور ایک آزاد خیال مفکر تھا۔ اس کے سوا وہ اعلیٰ درجہ کا ریاضی داں اور ہیئت داں بھی تھا۔ الکندی کا کارنامہ بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسفی کی حیثیت سے اُس نے افلاطون اور ارسطو کے نظریوں کو نوافلاطونیوں کے انداز میں باہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی اور نوفیثا غورثی ریاضیات کو وہ پورے سائنس کی اصل سمجھتا تھا لیکن اس کا مرتبہ ایک فلسفی سے بھی زیادہ بلند ہے۔ وہ ہیئت داں بھی تھا، کیمیا داں اور ماہر بصریات بھی۔ اس کے سوا اس نے علم موسیقی کے بہت سے نظریے بھی پیش کیے ہیں۔ اس کی ذات سے جو تصانیف منسوب کی جاتی ہیں ان کی تعداد دو سو ساٹھ سے کم نہیں لیکن بدقسمتی سے ان میں سے اکثر تصنیفیں ناپید ہو چکی ہیں۔ بصریات پر اس کی ایک اہم کتاب جو اقلیدس کی کتاب بصریات — Optics — پر مبنی ہے۔ ایک عرصہ تک مشرق اور مغرب میں کثرت سے مستعمل رہی۔ راجر بیکن بھی اس کتاب سے متاثر ہوا تھا۔ الکندی نے جو کتابیں موسیقی کے علم پر لکھی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متوازن راگ یا تال والی موسیقی کے نصرانی یورپ میں مروج ہونے سے صدیوں پہلے مسلمان اس سے واقف تھے۔

اسلام میں فلکیات کا سائنٹفک مطالعہ ایک ہندوستانی تصنیف "سدھانتا" کے زیر اثر شروع کیا گیا۔ یہ کتاب ۷۷۱ء میں بغداد لائی گئی تھی۔ صحیح آلات کی مدد سے باقاعدہ مشاہدات سب سے پہلے نویں صدی کی ابتدا میں جنوب مغربی ایران کے ایک مقام جندیسا پور میں کیے گئے تھے۔ اسی صدی کے وسط میں خلیفہ مامون نے بغداد کے اندر اور دمشق کے باہر فلکیاتی رصدگاہیں قائم کرائیں۔ اس زمانے کی رصدگاہوں کا سازوسامان مزولہ (دھوپ گھڑی)، اصطرلاب، مقیاس الارتفاع، اور کرے پر مشتمل ہوتا تھا۔ خلیفہ کے ہیئت دانوں نے زمین کی مساحت کا ایک نازک ترین عمل یعنی ارضی زاویہ کے ایک درجہ کا طول معلوم کیا۔ یہ ہیئت داں زمین کی گولائی کے مفروضے پر زمین کی جسامت اور اس کا محیط متعین کرنا چاہتے تھے۔ یہ پیمائش دجلہ کے شمالی میدان اور تدمر (Palmyra) کے قریب عمل میں لائی گئی تھی۔ یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نصف النہار کے ایک درجہ کا طول ۵۶ ⅔ عربی میل ہے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ نتیجہ تقریباً صحیح نکلا۔ کیونکہ اس مقام پر نصف النہار کے ایک درجہ کا جو حقیقی طول ہے اس سے ان ہیئت دانوں کا دریافت کیا ہوا طول صرف (۲۸۷۷) فیٹ زیادہ ہے۔

جن ہیئت دانوں نے یہ مہم سر کی ہے ان میں الخوارزمی بھی شریک تھا۔ خوارزمی کا شمار اسلام کے عظیم ترین سائنس دانوں میں ہوتا ہے اور قرون وسطیٰ کے تمام دوسرے مصنفوں کے مقابلے میں ریاضیاتی تفکر سب سے زیادہ اسی الخوارزمی سے متاثر ہوا ہے۔ الخوارزمی نے قدیم ترین فلکیاتی جدولیں ۔۔ زیچ ۔۔ ترتیب دینے کے سوا ریاضی اور الجبرا کی قدیم ترین کتابیں ۔۔ حساب الجبر والمقابلہ ۔۔ بھی لکھیں۔ اس کے الجبرا کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب یورپ کی جامعات میں سولہویں صدی تک ریاضیات کی اہم ترین درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔ اسی ترجمہ کی بدولت یورپ الجبرا کے نام اور اس کے علم سے روشناس ہوا۔ خوارزمی کی کتابوں ہی کے ذریعے مغرب میں عربی ہندسوں کا رواج ہوا اور یہ ہندسے اسی کے نام پر Algarism کہلائے۔

مخزن الادویہ اور ریاضیات کے بعد عربوں نے کیمیا پر سب سے زیادہ عظیم الشان سائنٹفک

تحقیقاتیں کی ہیں۔کیمیا اور دوسرے طبعی علوم کے مطالعہ اور تحقیق کے دوران میں اُنھوں نے دنیا کو مفروضی تجربے سے روشناس کرایا جس نے یونانیوں کے موہوم قیاسات کی بڑی اصلاح کی۔اگرچہ عربوں نے مظاہرِ فطرت کے مشاہدے نہایت صحیح طریقے پر کیے ہیں۔اور حقائق کو بھی اُنھوں نے بڑی مشقت اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا ہے لیکن اس کے باوجود اپنی تحقیقات سے صحیح مفروضے قائم کرنے اور صحیح سائنٹفک نتائج اخذ کرنے میں انہیں بڑی دشواری پیش آئی ہے۔چنانچہ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ کسی نظام کی تفصیلات کو اتمام تک پہنچانے سے قاصر رہے۔

جابر ابن حیان کو جسے یورپ والے Geber کہتے ہیں، عربی الکیمیا (الکیمیا کا مشتق ایک قدیم مصری لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ "سیاہ" کے ہیں۔یہ لفظ یونانی زبان کے ذریعہ عربی زبان میں داخل ہوا ہے) کا موجد سمجھا جاتا ہے۔یہ ۷۲۰ء کے قریب کوفہ میں پیدا ہوا اپنے مصری اور یونانی پیش رووں کی طرح جابر اسی مفروضے کو مان کر آگے بڑھا کہ قلوی دھاتیں جیسے ٹن سیسے لوہے اور تانبے کو ایک پراسرار مادہ کے ذریعہ سونے یا چاندی میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔اس مادہ کی تحقیق اور جستجو میں اس نے اپنی پوری توانائیوں کی بازی لگادی تھی۔اگلے کیمیا دانوں کے مقابلے میں اسی نے سب سے زیادہ واضح طور پر تجربہ کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرکے اس کو بیان کیا۔اس کے سوا کیمیائی نظریوں اور تجربوں میں جابر نے قابل قدر اضافے بھی کیے ہیں۔اگرچہ مغربی روایتیں جابر کو مختلف قسم کے کیمیائی مرکبات کے انکشاف کا اعزاز عطا کرتی ہیں، لیکن جو بائیس عربی کتابیں اس کے نام سے منسوب ہیں ان میں ایسے انکشافات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ عربی اور لاطینی زبان میں اس وقت الکیمیا پر جو سو کتابیں ملتی ہیں اور جابر کے نام سے منسوب ہیں، ان میں سے اکثر کتابیں بالکل جعلی ہیں۔تاہم جن تصنیفوں کو اس کے نام سے نسبت دی گئی ہے وہ چودھویں صدی کے بعد کے زمانہ میں یورپ اور ایشیا دونوں جگہ کیمیائی معلومات کے سرچشموں کا درجہ رکھتی تھیں لیکن سچ پوچھیے تو صرف چند

ہی ایک کتابوں کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جابر کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ جابر نے تحویل اور تجزیہ جیسے دو اہم کیمیائی تعاملات کی سائنٹفک طریقہ پر تشریح کی ہے اس نے تبخیر، اماعت اور قلمانے کے طریقوں کی بھی اصلاح کی وہ خام سلفیورک اور نائٹرک ترشوں (گندھک اور شورے کے تیزاب) کی تیاری سے بھی واقف تھا۔ ان دونوں ترشوں کو ملا کر ماء الملوک تیار کرنا بھی اُسے آتا تھا۔ جس میں سونے اور چاندی کو حل کیا جا سکتا تھا مجموعی حیثیت سے جابر نے ارسطو کے نظریۂ اجزاء دھات میں کچھ اس طرح ترمیم کی کہ یہ نظریہ معمولی سے رد و بدل کے ساتھ جدید کیمیا کی ابتدا یعنی اٹھارویں صدی تک مروج و مقبول رہا۔

فریضۂ حج کی ادائی، مکہ کی جانب مسجدوں کے محل وقوع کے انتخاب اور نماز کے لیے کعبہ کی سمت کے تعین کی ضرورت نے مسلمانوں میں علم جغرافیہ کی تحصیل و تحقیق کی دینی تشویق پیدا کی۔ علم ہیئت کے زیر اثر تمام اقطاعِ عالم کے طول بلد اور عرض بلد متعین کرنے کی ضرورت محسوس کی جا چکی تھی۔ اور اب اس علم نے اس ضرورت کی سائنٹفک اہمیت کو واضح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیان مسلمان تاجر مشرق میں بری اور بحری دونوں راستوں سے چین تک پہنچ چکے تھے اور ادھر انھوں نے جزیرۂ زنجبار اور افریقہ کے جنوبی ساحلوں کے آخری سرے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ شمال میں وہ روس میں در آئے تھے لیکن مغرب میں ان کی حیرت انگیز پیش قدمی صرف ہولناک "بحر ظلمات" ۔ بحر اوقیانوس، Atlantic کی وجہ سے رک گئیں۔ یہ تاجر جب وطن لوٹے تو ابنائے وطن سے اپنے سفر کے تاثرات بیان کرنے لگے۔ اس طرح دنیا کے دور دراز علاقوں اور اجنبی قوموں کے متعلق فطری طور پر ایک عام دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بطلیموس کی کتاب "جغرافیہ" کا عربی میں کئی بار ترجمہ براہ راست یونانی یا سریانی زبان سے کیا گیا اور اسی سے نامور الخوارزمی نے "زمین کا نمونہ" تیار کیا۔ اصل میں یہ دنیا کا ایک نقشہ تھا۔ اسے خوارزمی اور دوسرے ساٹھ عالموں نے مل کر تیار کیا تھا، اور یہ اسلام میں کرۂ ارض اور اجرام فلکی کا سب سے پہلا نقشہ تھا پچھلے عرب جغرافیہ دانوں نے

ہندوستان سے یہ خیال لیا تھا کہ عالم کا ایک مرکز ہے اور اسے انہوں نے آرین (Arin) کا نام دیا تھا۔ اصل میں یہ بطلیموس کی جغرافیہ میں ہندوستانی شہر اجین کے نام کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ جہاں ایک فلکیاتی رصدگاہ تھی اور اس کے نصف النہار پہ قبۂ ارض، یا دنیا کی چوٹی کا واقع ہونا مانا گیا تھا۔ اس مقام کا محل وقوع مغرب اور مشرق کی آخری حدود کے درمیان خطِ استوا پر بتاتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ اس فرضی مقام سے مغربی نصف النہار (۹۰) درجہ پر واقع ہے۔ مسلمان جغرافیہ داں طول بلد کا حساب عام طور پر اسی مقام کے نصف النہار سے لگایا کرتے تھے جہاں سے بطلیموس لگایا کرتا تھا اور یہ مقام وہی ہے جسے اب جزائر کناری (Canaries) کہا جاتا ہے۔

جیسے فلسفہ اور طب میں یونانی اثر غالب رہا ویسے ہی تاریخی اور ادبی تصانیف میں ایرانی نمونے کو پیش نظر رکھا گیا۔ تاہم طرز بیان وہی رہا جو قدیم اسلامی حدیثوں کا پایا جاتا ہے۔ ہر واقعہ عینی شاہد یا معاصروں کے اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے اور مصنف تک کئی درمیانی راویوں کے واسطے سے منتقل کیا جاتا ہے۔ مصنف کی حیثیت آخری راوی کی ہوتی ہے۔ اس تکنیک کی وجہ سے صحتِ روایت کا معیار بہت بلند ہو گیا اور واقعات دن اور تاریخ کی صراحت و صحت کے ساتھ بیان ہونے لگے لیکن منقول حقائق کی صداقت ان کی صحیح جانچ پڑتال اور تنقید کی بجائے اس پر مبنی ہوا کرتی تھی کہ راویوں کے سلسلہ کی کڑیاں کہاں تک ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور راوی کی دیانت و صداقت کس حد تک اعتماد کے قابل ہے۔ مورخ اسناد کے متواتر سلسلے کے انتخاب اور واقعات کی حد تک ہی اپنی ذاتی رائے کو استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کے بعد ان کی نسبت اپنی قوتِ تحلیل و تجزیہ، موازنہ اور تنقید سے وہ بہت کم کام لیتا تھا

اگرچہ عرب مورخوں نے زمانے کے واقعات کو بڑی جامعیت کے ساتھ قلمبند کیا ہے لیکن تاریخ کے نگار خانے میں ان کا مخصوص ذاتی سرمایہ علمِ حدیث ہے۔ اسے دینی روایت کا

علم کہا جا سکتا ہے۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد پہلی ڈھائی صدیوں میں آپ کے اقوال اور افعال روایت وکتابت دونوں طرح کثیر تعداد میں جمع کر لیے گئے تھے۔ اسلام میں جب کبھی کوئی دینی یا سیاسی یا سماجی مسئلہ پیدا ہوا ہر فریق اور ہر جماعت نے رسول اللہؐ ہی کے کسی نہ کسی قول یا عمل سے اس مسئلہ کی سند پیش کرنے کی کوشش کی ہے چاہے یہ حدیث صحیح ہو کہ من گھڑت۔

ہر مکمل حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں: (۱) سلسلہ اسناد (۲) متن۔ اسناد کے بعد متن شروع ہوتا ہے اور لازمی طور پر راست تخاطب کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً "حدثنی فلان قال حدثنا فلان عن فلان عن فلان الخ قال ....." یعنی مجھ سے فلاں نے کہا کہ فلاں سے فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے یہ کہا کہ ..... یہی اصول تاریخ نگاری اور "حکمیاتی ادب" میں استعمال کیا گیا۔ ان تمام میدانوں میں عام طور پر تنقید خارجی ہوتی تھی۔ اور اس تنقید کا دائرہ اسی حد تک محدود تھا کہ راوی جو حدیث کے سچے ہونے کے ضامن بھی ہوتے تھے، ان کی اوروں کی نظر میں کیا حیثیت ہے اور حدیث کے متعلق جو اسناد پیش کر رہے ہیں ان کا سلسلہ کسی وقفہ کے بغیر رسول اللہؐ تک پہنچنا چاہیے۔

رومیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں صرف عرب قوم ہی ایسی تھی جس نے علمِ قانون کو ترقی دی اور دنیا کے سامنے قانون کا ایک جداگانہ نظام پیش کیا۔ یہ نظام بنیادی طور پر قرآن اور سنت (یعنی حدیث) پر مبنی اور یونانی رومی قانون سے متاثر تھا۔ اور تمام احکامِ الٰہی جو قرآن میں پیش کیے گئے ہیں اور احادیثِ نبوی میں ان کی تعبیر وتشریح کی گئی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے ذریعہ ان کو بعد کی نسلوں تک پہنچایا گیا۔

شریعت کے فرائض مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو منظم کرتے ہیں۔ چاہے یہ شعبے دینی ہوں کہ سیاسی یا سماجی۔ یہ احکام مسلمانوں کے ازدواجی اور مدنی تعلقات پر

حاوی ہونے کے سوا ان کے غیر مسلموں سے تعلقات پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے تمام اوامر و نواہی اسی مقدس قانون سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ قانونی اعتبار سے انسان کے تمام اعمال کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) فرض: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور جس کا ترک کرنا قانوناً مستوجبِ عذاب ہے۔ (۲) مُستحب: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب تو ملتا ہے لیکن نہ کرنے سے کوئی عذاب نہیں ہوتا۔ (۳) جائز و مباح: وہ اعمال جن کے کرنے کی اجازت ہے اور قانون ان میں حائل نہیں ہوتا (۴) مکروہ: ایسا عمل جو ناپسندیدہ تو ہے لیکن اس کے کرنے سے عذاب نہیں ہوتا۔ (۵) حرام: ایسے اعمال جن کے کرنے سے عذاب ہوتا ہے۔ اور ان کا کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

اخلاقیات کی جو کتابیں قرآن اور حدیث کی اساس پر لکھی گئی ہیں وہ شمار میں تو بہت ہیں لیکن عربی ادب کے اس پورے حصہ پر حاوی نہیں ہیں جس کا موضوع اخلاق ہے۔ ان تمام اسلامی فلسفوں میں تسلیم و رضا، صبر و توکل اور قناعت کی خوبیوں کو سراہا گیا ہے۔ گناہ روح کی بیماریاں مانی گئی ہیں اور معلم اخلاق حکیم کو ان کا طبیب تسلیم کیا گیا ہے اس تقسیم کی بنیاد روح کے شعبوں کے تجزیہ پر رکھی گئی ہے۔ روح کے ہر شعبہ سے اس کی اپنی اچھائی یا بُرائی کا ظہور ہوتا ہے۔

عربی ادب (ادب کے مخصوص مفہوم میں) جو سنہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ اپنے اوجِ کمال پر پہنچ گیا تھا، اس میں ایرانی اثر کے تحت آورد اور تکلف پیدا ہو چلا تھا۔ ابتدائی دنوں کا مختصر، جامع، پُرجوش اور سیدھا سادا اسلوب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا اس کی جگہ ایک پُرتکلف، پُرتصنع، مرصع، اور بناوٹی اسلوب نے لے لی۔ اس اسلوب میں پُرپیچ تشبیہوں، استعاروں اور قافیوں کی بھرمار تھی۔ اس زمانے کے ادب سے مغرب والے اپنے لیے صرف ایک ہی کتاب چنی اور اس پر اپنی پوری توجہ صرف

کی۔ یہ کتاب "الف لیلۃ ولیلہ" تھی جو یورپ میں (Arabian Nights) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو سب سے پہلے الجہشیاری (متوفی ۹۴۲ء) نے ایک قدیم فارسی داستان کی بنیاد پر لکھا تھا۔ اس کتاب کی دوسری کہانیاں اور اس کی ہیروئن شہرزاد مقامی داستان گوؤں نے بڑھایا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس داستان کی تشکیل میں ہندوستانی، یونانی، عبرانی، مصری اور ہر قسم کی مشرقی داستانوں جیسے بے شمار ماخذوں سے خوشہ چینی کی گئی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے افسانوی دربار نے بھی اس کتاب کے لیے کئی مزاحیہ اور حسن و عاشقی کی داستانیں فراہم کیں۔ الف لیلہ کی تالیف چودہویں صدی تک مکمل نہیں ہوئی اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ کتاب مشرق کے مقابلہ میں مغرب میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔

جس زمانہ میں عربی زبان میں الف لیلہ کی تالیف و ترتیب نے آخری صورت اختیار کی، اسلامی سائنس اور ادب کا زریں عہد بھی ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ عباسیوں کے بعد خالص یا طبعی علوم کے کسی شعبہ میں بھی کوئی قابل تعریف قدم نہ اٹھا۔ اگر آج کل کے مسلمان صرف اپنی ہی کتابوں پر تکیہ کیے بیٹھے رہتے تو ان کا علمی اثاثہ یقیناً اس اثاثہ سے کہیں کم ہوتا جو گیارہویں صدی میں ان کے آباء و اجداد کے قبضہ میں تھا۔ طب، فلسفہ، ریاضیات، نباتیات اور دوسرے علوم و فنون میں اس زمانے کے مسلمان ایک خاص حد پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذہن پر جمود و تعطل طاری ہو گیا۔ ماضی اور اس کی دینی اور علمی روایتوں کے ادب و احترام نے عرب جودتِ فکر کے پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال دیں، اور خوشی کی بات ہے کہ یہ بیڑیاں ابھی ابھی ٹوٹنی شروع ہو گئی ہیں۔

---

# ۱۳۔ فنونِ لطیفہ

جیسی کہ سامی نسلوں کی خصوصیت ہے، عربوں نے بھی شاعری کی طرح اپنے آرٹ میں بھی اس کے کسی ایک پہلو سے دلچسپی لی ہے اور موضوعی ذوق کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جزئی تزئین و آرائش کا ایک لطیف ذوق رکھتے تھے لیکن مختلف جزئیات کو ایک عظیم اور متحد کل میں، ہم آہنگ کرنے کی کوئی خاص صلاحیت ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لیے انہیں فن تعمیر اور خاص کر فن مصوری میں سائنسی علوم کی سی شاندار ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس میدان میں اپنے مقام سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔

وہ تمام تعمیری کارنامے جن سے کسی زمانے میں شہر بغداد کے حسن و جمال میں چار چاند لگے ہوئے تھے، زمانے نے انہیں کچھ ایسا مٹایا کہ آج صفحۂ ہستی پر ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اسلام کے قرونِ اولیٰ (عہد بنی اُمیہ) کی تعمیری یادگاروں میں سے بیت المقدس کا قبۃ الصخرہ اور دمشق کی مسجد اُمیہ جو نہایت پُرشکوہ عمارتیں ہیں، اب باقی رہ گئی ہیں عہد عباسی میں جو شاندار عمارتیں بنیں ان میں سے مسجد مستنصریہ کے سوا اور کوئی عمارت آج باقی نہیں۔ اس عمارت کو خلیفہ مستنصر نے ۱۲۳۴ء میں بنوایا تھا۔ اس عمارت میں آج کل "گمرک" (کسٹم کچہری) کا کام لیا جا رہا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کسی زمانے میں شہر بغداد کو بڑی شان و شوکت حاصل تھی لیکن امین و مامون کی خانہ جنگی کی تباہی اور آخر ۱۲۵۸ء میں وحشی مغلوں کی ہلاکت آفرینی اور خود قدرتی اسباب و حوادث کے ہاتھوں یہ دار الخلافہ ایسا برباد ہوا کہ یہاں کی اکثر عظیم الشان عمارتوں کے بارے میں آج یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ حقیقت میں یہ عمارتیں کہاں کہاں واقع تھیں۔

دار الخلافہ بغداد کے باہر عباسی عہد کے جتنے بھی تاریخی آثار پائے جاتے ہیں ان میں

ایک بھی عمارت ایسی نہیں ملیگی جو خلیفہ متوکل کے دورِ خلافت (۸۴۷ء۔ ۸۶۵ء) سے پہلے کی ہو۔ سامرہ کی جامع مسجد اسی خلیفہ نے بنوائی تھی مستطیل وضع کی اس جامع مسجد کی تعمیر پر سات لاکھ دینار صرف ہوئے تھے۔ اس کے دریچوں کی کثیر برگی کمانوں پر ہندی فن تعمیر کے اثر کا گمان ہوتا ہے۔ عہدِ اُمیہ کی عمارتوں پر بازنطینی شامی فن تعمیر کا واضح اثر پایا جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف رقّہ (شمالی شام) میں عباسیوں نے آٹھویں صدی کے لگ بھگ جو عمارتیں بنوائی تھیں ان کی باقیات ایشیائی اور خاص کر ایرانی فن تعمیر کی روایات کی حامل نظر آتی ہیں۔

قرآن نے ذی حیات مخلوق کی تصویر کشی ممنوع قرار دی ہے۔ اس لیے اس زمانے کے مسلمان فقیہ ہر قسم کے تمثیلی آرٹ کے مخالف تھے لیکن اس کے باوجود یہ فن ترقی کرتا گیا۔ اور جیسے قرآن کے قطعی احکام کے باوجود اسلامی معاشرے سے شراب خوری نہ گئی، ویسے ہی اس فن کا فروغ نہ رُک سکا۔ چنانچہ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ منصور نے اپنے محل کے گنبد پر ایک گھڑ سوار کا مجسمہ نصب کرایا تھا جو غالباً بادنما کا کام دیتا تھا۔ خلیفہ مامون نے اپنے لیے دریائے دجلہ میں شیروں، عقابوں، اور خمار مچھلیوں کی شکل کے تفریحی بجرے چھوڑ رکھے تھے۔ خلیفہ مقتدر نے سونے چاندی کا ایک درخت تیار کرایا تھا جس کی اٹھارہ شاخیں تھیں۔ یہ درخت شاہی محل کے اندر ایک بڑے حوض میں کھڑا کیا گیا تھا اور حوض کے دونوں کناروں پر سواروں کے پندرہ پندرہ مجسمے نصب کیے گئے تھے جو زربفت و دیبا کی پوشاکوں میں ملبوس تھے۔ اور سواروں کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ یہ برچھیاں یوں مسلسل حرکت کرتی تھیں جیسے مقابلہ کی لڑائی ہو رہی ہو۔

شہر سامرہ کے بانی خلیفہ معتصم نے اپنے محل کی دیواروں کو عریاں عورتوں کی تصویروں اور شکار کے مناظر سے آراستہ کیا تھا۔ اس کام کو غالباً نصرانی مصوروں نے انجام دیا تھا۔ اس خلیفہ کے دوسرے جانشین متوکل کے دورِ حکومت میں سامرہ کا عارضی دارالخلافہ اپنے

اوجِ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ متوکل نے اپنے محل کی دیواروں پر نقش و نگار کرنے کے لیے بازنطینی نقاش مقرر کیے تھے۔ اور بہت سی تصویروں میں سے ایک جگہ کلیسا اور راہبوں کی تصویریں اُتارنے میں انہیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔

اسلام میں نقاشی کو مذہبی اغراض کے لیے ایک زمانہ دراز کے بعد استعمال کیا گیا۔ نقاشی بدھ مت اور نصرانیت کی گویا کنیز تھی۔ لیکن یہ صورت اسلام میں کبھی پیش نہیں آئی رسول اللہ کی سب سے قدیم شبیہ ایک عرب سیاح نے نویں صدی میں دربار چین میں دیکھی تھی۔ غالباً یہ شبیہ نسطوری نصرانیوں نے تیار کی ہوگی۔ چودھویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کی مذہبی نقاشی پوری طرح منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ نقاشی کی یہ نوع بظاہر مشرقی کلیساؤں اور خاص کر یعقوبی اور نسطوری کلیساؤں کی مصوری سے اخذ کی گئی تھی۔ اس کی ابتدا کتابوں کی تزئین و آرائش سے ہوئی اور رفتہ رفتہ ترقی کرتی چلی گئی۔

قدیم زمانوں ہی میں اہل ایران جن کی ثقافت کو عربوں نے اپنا لیا تھا، آرائشی نقش و نگار اور رنگ کاری کے فن میں اپنے آپ کو ماہر ثابت کر چکے تھے، ان کی کوششوں کی بدولت اسلام کے صنعتی آرٹ کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ خاص کر قالین بافی کی صنعت کو جو اتنی ہی پرانی صنعت ہے جتنا پرانا فراعنہ کے زمانے کا مصر ہے، مسلمانوں کی سرپرستی میں خوب ہی فروغ حاصل ہوا۔ عام طور پر قالین پر شکار اور باغوں کے مناظر اتارے جاتے تھے۔ رنگ کاری میں مختلف قسم کے رنگوں کو پکا کرنے کی غرض سے پھٹکری استعمال کی جاتی تھی۔ نقش دار ریشمی کپڑے مصر و شام کی خاص اسلامی صنعتیں تھیں۔ یہ کپڑے ہاتھ سے بنے جاتے تھے۔ یورپ کے ملکوں میں ان کپڑوں کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ نصرانی مجاہد اور دوسرے مغربی باشندے اپنے ولیوں کی باقیات کو لپیٹنے کے لیے ان ہی کپڑوں کو پسند کرتے تھے۔

کوزہ گری کا فن اتنا ہی قدیم تھا جتنا کہ مصر اور سوسہ کے شہر قدیم تھے۔ اس میں حروف اور ہندسی شکلوں کے سوا انسانی، حیوانی اور نباتی شکلیں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اس فن نے

آرائشی تزئین کا وہ درجۂ کمال حاصل کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی دوسرا آرٹ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ٹائیلوں پر پھول پتیوں کے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ یہ فن دمشق میں ایران سے منتقل ہوا تھا اور یہاں اسے پچی کاری کے فن کے ساتھ بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اسے عمارتوں کے اندرونی اور بیرونی تزئین میں استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی حروف تہجی جو کئی طرح لکھے جاتے تھے، آرائشی نقش و نگار کے سانچوں میں ڈھل کر اسلامی آرٹ کی ایک زبردست بنیادی خصوصیت بن گئے تھے۔ خاص کر انطاکیہ، حلب، دمشق اور دوسرے فینقی شہر جیسے صور میں میناکاری اور آبگینوں کو سنہرا رنگ دینے کا فن حدِ کمال تک پہنچ گیا تھا۔ لاوئرے (Louvre) برٹش میوزیم اور قاہرہ کے عربی عجائب خانے کے گراں بہا خزانوں میں سامرہ کے اور فسطاط کی صناعیوں کے جو بے بہا جواہر پارے محفوظ کیے گئے ہیں ان میں نفیس بلوریں رکابیاں، پیالے، گلدان، قرابے اور گھروں اور مسجدوں کے فانوس بھی نظر آتے ہیں۔ یہ فانوس اپنی رنگا رنگ درخشانیوں سے اس قدر مجلا ہیں یا ان میں دھاتی صیقل کا ایسا کمال دکھایا گیا ہے کہ جیسے قوس قزح اپنی رنگینیوں کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

فن خطاطی کی ہمیشہ اس لیے قدر کی گئی کہ اس کے پیشِ نظر کلامِ الٰہی کو دائمی بنانا تھا۔ قرآن نے اس آرٹ کی اجازت دی ہے۔ یہ فن دوسری یا تیسری صدی ہجری میں ایجاد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ اس کی بڑی آؤ بھگت ہونے لگی۔ یہ ایک خالص اسلامی فن ہے اور اس نے فن مصوری پر جو اثرات مرتب کیے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ اسلام نے جاندار مخلوق کی تصویر کشی ممنوع قرار دی تھی۔ اس لیے تصویر کشی کے ذریعہ اپنے حسن کارانہ ذوق کے اظہار کی صورت فن خطاطی کے ذریعہ نکالی۔ اسلامی معاشرے میں خطاطوں کو مصوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عزت اور مرتبہ حاصل تھا۔ حکمراں تک ثواب حاصل کرنے کی غرض سے کلام اللہ کی کتابت کیا کرتے تھے۔ عربی کی تاریخی اور ادبی کتابوں میں متعدد خطاطوں کا تذکرہ بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے نام ہم تک محفوظ

پہنچے ہیں۔ لیکن یہی کتابیں مصوروں، تعمیر کاروں اور دھات کے صنعت کاروں کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ غالباً صرف خطاطی ہی ایک ایسا عربی آرٹ ہے جس کے مسلمان اور نصرانی دونوں نمائندے آج بھی قسطنطینہ، قاہرہ، بیروت اور دمشق میں موجود ہیں۔ اور ان کا کام حسن و نفاست کے لحاظ سے اگلوں کے شہ کاروں سے بڑھا چڑھا ہے۔

صرف فن خطاطی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کے دوسرے فنون جیسے رنگ کاری، نقاشی اور جلد سازی کی پوری صنعت کی ابتدا اور ارتقا دونوں کتاب مقدس قرآن ہی کے رہین منت ہیں۔ کتابی تزئین اور قرآن کی نقاشی کا فن آخری عباسی خلفار کے دور حکومت میں ایجاد ہوا۔ اور پندرہویں صدی میں یہ اپنے پورے کمال پر پہنچ گیا۔

جیسے دربار دمشق پر موسیقی کے بارے میں فقیہوں کی ناپسندیدگی کا کوئی خاص اثر نہ ہوا وہی حال بغداد کا رہا۔ ہارون رشید کے شستہ اور شاندار دربار نے سائنس اور آرٹ کی جیسی سرپرستی کی ویسی ہی سرپرستی نغمہ اور موسیقی کی کی۔ اور سرپرستی بھی ایسی کی کہ آسمان موسیقی کے نہایت تابناک ستارے اسی افق پر جگمگانے لگے۔ اس دربار کے سایۂ عاطفت میں بہت سے تنخواہ یاب مغنی اور گانے والے لونڈی غلام پروان چڑھ رہے تھے۔ ان ہی لوگوں نے دنیا کو ان بے شمار عجیب و غریب افسانوں کے موضوعات فراہم کیے ہیں جنہیں الف لیلہ نے اپنے صفحات میں حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ خلیفہ ہارون کی سرپرستی میں گانے بجانے کے ایک جلسہ میں ایسے دو ہزار مغنیوں اور مطربوں نے حصہ لیا تھا۔ اسی خلیفہ کے بیٹے امین نے بھی ایک رات اپنے محل میں ایسا ہی ایک جلسہ ترتیب دیا تھا اس جلسہ میں قصرِ شاہی میں رہنے والے تمام مرد اور عورتیں صبح ہونے تک رقص کناں رہے۔

ہارون رشید کا ایک خواجہ سرا مُخارِق اس زمانہ کا ممتاز ترین مغنی گزرا ہے۔ اس کا باپ قصاب تھا۔ لڑکپن میں یہ ایک دن اپنے باپ کی دکان پر بیٹھا صدا لگا کر

گوشت بیچ رہا تھا۔ اس کی آواز نہایت ہی دلکش اور سحر آفریں تھیں۔ اتفاق سے ایک مغنیہ نے اس کی آواز سُن لی اور کسی طرح اُسے خرید لیا۔ بعد میں مخارق کو ہارون نے خرید لیا۔ ہارون نے اُسے آزاد کرکے اسے ایک لاکھ دینار انعام دیئے اور اس کا مرتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو اپنے پہلو میں جگہ دینے لگا۔ کہتے ہیں ایک رات مخارق دریائے دجلہ کے کنارے گانے لگا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بغداد کی شاہراہوں پر جلتی ہوئی شمعیں ادھر سے اُدھر حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔ یہ شہر بغداد کے رہنے والے تھے جو استادِ فن کے سحر آفریں نغمے کی طرف بے اختیار کھنچے جا رہے تھے۔

یہ زمانہ بڑی عافیت اور چین سکھ کا زمانہ تھا۔ مخارق اور دوسرے ماہر فن جنہیں خلفائے وقت کے خاص مصاحب ہونے کی حیثیت سے لازوال شہرت حاصل ہوگئی ہے، نہ صرف بڑے زبردست مغنی تھے بلکہ قدرت سے انہیں اعلیٰ درجہ کی طباعی اور زبردست حافظہ بھی عطا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو بے شمار منتخب اشعار اور بے حساب لطائف و ظرائف یاد تھے اور انہیں برجستہ اور برملا استعمال کرنے کا سلیقہ بھی انہیں خوب تھا۔ یہ لوگ مغنی تھے، راگوں کے موجد تھے، شاعر تھے، عالم تھے اور اس زمانے کے علم و فضل میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اہمیت کے لحاظ سے ان کے بعد ہی ساز بجانے والے تھے۔ ان ساز بجانے والوں کو عام طور پر رباب بہت پسند تھا۔ ساز بجانے والے سارنگی بھی بجایا کرتے تھے۔ ان کے بعد گانے والی عورتوں کا درجہ تھا۔ گانے والیاں عام رواج کے مطابق پردے کے پیچھے بیٹھ کر گایا کرتی تھیں۔ یہ گانے والیاں حرم کی زینت کا ضروری جزو بن گئی تھیں۔ اور ان کی تعلیم و تربیت نے بھی ایک اہم پیشہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اعلیٰ تربیت یافتہ گانے والیاں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک بار مصر کے عامل کے کسی کارندے نے ایک مغنیہ کے لیے تیس ہزار دینار قیمت لگادی تھی اور اتنی ہی رقم بازنطینی شہنشاہ کے سفیر نے بھی پیش کی تھی۔ آخر کار والیِ خراسان کے کارندے نے اور دس ہزار دینار بڑھا کر چالیس ہزار دینار میں اس مغنیہ کو خرید

لیا۔ معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا، بلکہ مغنیہ کے نئے مالک نے اُسے آزاد کر کے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

عباسیوں کے زریں عہد میں جتنی یونانی کتابوں کے ترجمے ہوئے، ان میں سے کچھ کتابیں موسیقی کے قیاسی نظریوں پر بھی تھیں۔ عرب مصنفوں نے موسیقی سے متعلق اپنے ابتدائی سائنٹفک تصورات ان ہی کتابوں سے اخذ کیے تھے۔ آواز کے نظریہ کے طبعی اور فعلیاتی پہلوؤں کی انھوں نے تقلید بھی کرنی شروع کر دی تھی لیکن عملی اعتبار سے خود ان کے پاس موسیقی کے خالص عربی نمونے موجود تھے۔ قریب قریب اسی زمانے میں موسیقی کا لفظ جو بعد میں "موسیقا" ہو گیا تھا یونانی زبان کے لفظ Music سے مستعار لیا گیا اور عربی کی قدیم اصطلاح "غنا" جو اس وقت تک موسیقی اور نغمہ دونوں کے لیے استعمال ہوتی چلی آرہی تھی اب گانے کے عملی فن کے لیے مختص کر دی گئی۔ غنا کا لفظ نظری مباحث کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے سوا "قیثار" (Quitar) اور "ارغن" (Organ) جیسے باجوں کے یونانی نام اور اصطلاحیں بھی عربی زبان میں نظر آنے لگیں۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے ارغن باجہ بازنطینیوں سے حاصل کیا تھا۔

بد قسمتی سے موسیقی کے اکثر فنی رسالوں کے اصلی نسخے تلف ہو گئے ہیں۔ عربی موسیقی جو ترنم اور نغم (نغماتی سر) کے ترکیبی عناصر اور اقعا (ترنمی سر) کے ذریعہ صرف زبانی منتقل کی جا سکتی تھی، اب ناپید ہو چکی ہے۔ آج کل کے عربی نغمے اگرچہ لے سے خالی ہیں لیکن ان میں ترنم بہت ہوتا ہے۔ عربی زبان میں کلاسیکی موسیقی پر جو چند کتابیں باقی رہ گئی ہیں، عصرِ حاضر کے پڑھنے والے کے لیے ان کی تعبیر کرنا، یا ان کی قدیم ایقاعی علامتوں اور ان کی فنی اصطلاحوں کا پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں۔ ایسی کتابوں میں ترکی نژاد ابونصر فارابی (متوفی ۹۵۰ء) کی کتاب "کتاب الموسیقی الکبیر" سب سے پہلی کتاب ہے۔

# ۱۴۔ قرطبہ — نگینۂ عالم

جس زمانے میں اسلامی مملکت کی مشرقی شاخ اپنے عہدِ زریں میں داخل ہو رہی تھی، اِدھر اسی زمانے میں، اس مملکت کی مغربی شاخ (دراسپین) میں ایسے ہی پُر شکوہ عہد سے گزر رہی تھی۔ یہ زمانہ ہمارے لیے اور بھی اہم ہے کہ عربی ثقافت بڑی حد تک اسلامی اسپین ہی سے مغرب میں داخل ہوئی، اور قرونِ وسطیٰ کی ابتدا کی نصرانی ثقافت میں نفوذ کر کے وہ تمدن پیدا کیا جو ورثے میں ہم تک پہنچا ہے۔ مغرب کا یہ اسلامی تمدن نویں اور گیارہویں صدی کے درمیان اپنے بامِ عروج پر پہنچ گیا تھا لیکن اس کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اپنی داستان کو ۷۵۰ء سے شروع کرنا ہوگا۔

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، ۷۵۰ء میں بنی عباس نے دمشق کے بنی امیہ کا تختہ اُلٹ دیا۔ اور یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ جوں ہی بنی عباس خلافت پر قابض ہوئے اور مفتوحہ خاندان کے جس جس فرد پر فاتحوں کا ہاتھ پڑا اسے سفاکی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیا۔

بنی عباس کے دستِ انتقام سے جو چند اموی اشرافِ بچ گئے ان میں عبدالرحمٰن نامی ایک بیس سالہ وجیہ، دُبلا پتلا، بلند و بالا، عقاب جیسا اور سُرخ بالوں والا نوجوان بھی تھا۔ قدرت نے اس نوجوان کو غیر معمولی مردانگی اور ذہانت عطا کی تھی۔ یہی عبدالرحمٰن اسپین پہنچا، لڑ بھڑ کر اسپین کا مالک بنا اور یہاں اسی بنی امیہ کے اقتدار کو بحال رکھا جو مشرق میں نیست و نابود کر دیے گئے تھے۔

اپنے وطن سے عبدالرحمٰن کا فرار بڑا ڈرامائی رہا۔ ایک دن وہ دجلہ کے بائیں ساحل پر ایک بدوی پڑاؤ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یکایک چند سوار عباسیوں کا سیاہ پھریرا اُڑاتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی عبدالرحمٰن اپنے تیرہ سالہ چھوٹے بھائی کو لے کر دریا میں کود پڑا۔

چھوٹے بھائی کو تیرنا اچھی طرح نہ آتا تھا۔ اس پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ ساحل کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ یہاں دشمن کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم واپس آجاؤ تو تمھیں امان ہے۔ نادان لڑکا دشمن کے جھانسے میں آگیا۔ ساحل کی طرف پلٹا اور کم بخت دشمن نے اُسے وہیں ڈھیر کردیا۔ لیکن بڑے بھائی نے دشمن کی یقین آفرینیوں کی کوئی پروانہ کی اور تیرتا تیرتا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

پیدل، بے یار و مددگار، مفلس و نادار ـــــ اس حالت میں عبدالرحمٰن نے جنوب مغرب کی راہ لی اور بہت سی مصیبتیں جھیلتا فلسطین پہنچا۔ یہاں اُسے ایک دوست مل گیا۔ فلسطین سے اس نے مغرب کا رُخ کیا۔ شمالی افریقہ میں وہ اس ولایت کے عامل کے ہاتھوں قتل ہونے سے بال بال بچ کر نکل گیا۔ پھر قبیلہ قبیلہ پھرتا وہ پانچ سال کے بعد سبتہ پہنچا۔ وہ جہاں جہاں گیا نئے حکمراں خاندان کے جاسوس برابر اس کا پیچھا کرتے رہے عبدالرحمٰن دمشق کے دسویں اموی خلیفہ کا پوتا تھا اور اس کی ماں شمالی افریقہ کے کسی ضلع کے ایک بربر قبیلے کی عورت تھی۔ اپنی ننھیال پہنچا تو اس کے ماموؤں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔

اسپین کے جنوب میں سبتہ سے آبنائے جبل الطارق تک دمشق کی شامی فوجیں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ عبدالرحمٰن نے ان فوجوں میں اتنا اثر و رسوخ پیدا کرلیا کہ آخر کار انھوں نے عبدالرحمٰن کو اپنا امیر بنا لیا۔ اس کی قیادت میں یہ فوجیں جنوبی اسپین کے تمام شہروں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرتی چلی گئیں۔ اگرچہ پورے اسپین کو فتح کرنے میں کئی سال لگ گئے لیکن عبدالرحمٰن کی جبینِ استقلال پر کبھی شکن نہ آنے پائی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ نے عبدالرحمٰن کا مقابلہ کرنے کے لیے اسپین پر اپنا ایک عامل بھی مقرر کیا تھا لیکن دو سال بعد اسی خلیفہ کی بارگاہ میں عبدالرحمٰن کی طرف سے اسی عامل کا سر تحفۃً پیش کیا گیا ـــــ اس سر کو نمک اور کافور لگا کر محفوظ کیا گیا تھا اور اس پر اس کے تقرر کی سند اور ایک سیاہ علم لپیٹ دیا گیا تھا۔ "شکر ہے اس اللہ کا

جس نے ہمارے اور ایسے دشمن کے درمیان ایک سمندر حائل کر دیا!" اپنے عامل کی یہ درگت دیکھ کر بغداد کے خلیفہ کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ ایک لڑائی میں جس کی داستان کو مغربی ادب نے لازوال بنا دیا ہے، فرانکوں کے بادشاہ شارلیمین کو بھی عبدالرحمٰن کی اس بے پناہ قوتِ استقامت کا تجربہ ہوا۔ عباسی خلیفہ کے حلیف کی حیثیت سے شارلیمین قدرتی طور پر اسپین کے نئے امیر یا سلطان (عبدالرحمٰن نے اپنا یہی لقب اختیار کیا تھا) کا حریف بن گیا تھا۔ شارلیمین نے ۷۷۸ء میں اپنی فوجیں اسپین کے شمال مشرقی راستے سے سرقسطہ تک بڑھا دیں۔ لیکن جب شہر والوں نے اس کی پذیرائی نہیں کی اور شہر کے دروازے اس پر بند کر دیے، اور خود اس کے وطن میں گھر کے دشمن اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو اس کو اپنے ارادے سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ اس پسپائی میں جبال البرانس (کوہ پرنیز) کی تنگ گھاٹیوں سے فرانکوں کی فوج گزرنے لگی تو باسکو (Basques) اور دوسری پہاڑی قوموں نے اس فوج کے پچھلے سرے پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانکوں کو شدید جانی اور مالی نقصان اٹھانے پڑے۔ اس ہنگامے میں جو سردار مارے گئے ان میں ایک رولان (Roland) بھی تھا۔ اس سردار کی دلیرانہ مقاومت کو چانسن دی رولاں (Chauon de Roland) نامی نظم نے حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ یہ نظم نہ صرف فرانسیسی ادب کا شاہکار ہے بلکہ یہ قرونِ وسطیٰ کی تمام رزمیہ نظموں میں سب سے زیادہ ممتاز نظم مانی جاتی ہے۔

اپنے حریفوں کو مطیع کرنے کے دوران میں عبدالرحمٰن نے بربروں کی نہایت منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ فوج جمع کر لی تھی۔ اس فوج کی تعداد چالیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ اپنے سپاہیوں کو فیاضانہ طور پر نواز کر ان کی وفاداری حاصل کرنے کے ڈھنگ عبدالرحمٰن کو خوب یاد تھے۔ اب تک اس کی مملکت میں جمعہ کے دن عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ لیکن ۷۷۳ء میں اس نے یہ نام خطبے سے نکال دیا لیکن اُس نے خود اپنے لیے خلیفہ کا لقب

اختیار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ عبدالرحمٰن ثالث (سنہ ۹۱۲ء تا سنہ ۹۶۱ء) تک اس کے جتنے جانشین گزرے ہیں سب کے سب امیر ہی کہلاتے رہے۔ اس طرح عبدالرحمٰن اول کے عہد حکومت میں اسلامی مملکت کے صوبہ اندلس نے سب سے پہلے اسلام کے مسلّمہ خلیفہ کی اطاعت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

ملک کی سرحدیں مستحکم ہو گئیں اور ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا تو عبدالرحمٰن نے ان فنون کی طرف توجہ کی جو زمانۂ امن میں پروان چڑھتے ہیں۔ ان فنون میں اس نے اپنی وہی بڑائی دکھائی جو بڑائی وہ لڑائی کے فن میں دکھا چکا تھا۔ اس نے اپنی مملکت کے شہروں کو آراستہ کیا۔ اپنے پایۂ تخت میں پاک صاف پانی پہنچانے کے لیے ایک تالاب کھدوایا۔ شہر کے طرف میں ایک فصیل تیار کرائی اور شمال مشرقی شام کے اپنے ایک آبائی محل کے نمونے پر اپنے لیے شہر قرطبہ کے باہر ایک قصر تعمیر کرایا اور باغ بھی لگوایا۔ اس باغ میں آبرسانی کا انتظام کر کے اس میں شفتالو اور انار جیسے بدیسی درخت لگائے۔ اس کے باغ میں کھجور کا ایک درخت بھی تھا کہتے ہیں اسپین کی سرزمین میں یہ کھجور کا سب سے پہلا درخت تھا جو دیارِ شام سے لا کر لگایا گیا تھا۔ اس درخت کو مخاطب کر کے یاد وطن میں اس نے بعض نہایت ہی عمدہ شعر لکھے ہیں۱؎

۱؎ عبدالرحمٰن کے اصل عربی شعر ملاحظہ ہوں:-

تبدّت لنا وسط الرصافة نخلةٌ — تناءت بأرض الغرب عن بلد النخل
فقلت شبيهي في التغرب والنوى — وطول التنائي عن بنيّ وعن اهلي
سقتك غوادي من صوبها الذي — يسحّ ويستمري السماكين بالوبل

شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ”عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں“ کی بنیاد ان ہی اشعار پر رکھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لیے نخلِ طور ہے تو!
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں — پردیس میں ناصبور ہے تو

عبدالرحمٰن نے اپنی وفات سے دو سال پہلے ۷۸۶ء میں مکہ کی مسجد حرام اور بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کے نمونے پر[1] قرطبہ کی جامع مسجد بنوانی شروع کی۔ اس مسجد کی تکمیل اور توسیع اس کے جانشینوں نے کی اور بہت جلد یہ مسجد مغرب میں اسلام کی مشہور عبادت گاہ بن گئی۔ لیکن ۱۲۳۶ء میں نصرانیوں نے مسلمانوں کی اس یادگارِ زمانہ عمارت کو اس کے وسیع صحن اور پُرشکوہ ستونوں سمیت کلیسہ میں بدل دیا[2]۔ چنانچہ "لا مسکیتا" (La Moziquita)

---

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۷)

غربت کی ہوائیں بارور ہو
ساقی ترانم سحر ہو!

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اُٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے!
مومن کا مقام ہر کہیں ہے! (مترجم)

[1] یہاں پھر بے اختیار علامہ اقبال کی وہ نظم یاد آجاتی ہے جو "مسجد قرطبہ" پر انہوں نے عجیب جذب کیف کے عالم میں لکھی ہے۔ یوں تو یہ نظم کافی طویل ہے لیکن اس کے بعض اشعار میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو پروفیسر حتی نے اس کتاب کے مختلف ابواب میں اسپین کے بارے میں لکھا ہے۔ اللہ ان کی تربت پر نور کی بارش کرے، کیا خوب فرما گئے ہیں:

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہے جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور — تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

(بقیہ بر صفحہ ۱۵۹)

کے مشہور نام سے یہ شہرۂ آفاق عمارت آج بھی اپنے جلیل القدر بانیوں کی عظمت کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ جامع مسجد کے سوا عبدالرحمٰن نے دریائے وادی الکبیر (اس کو یورپ والے Guada la Quivior کہتے ہیں۔ یہ عربی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کے معنی بڑی ندی کے ہیں) پر ایک پل بھی تعمیر کرایا تھا۔ اس کے جانشینوں نے اس پل میں سترہ کمانوں کا اضافہ کیا۔ اموی حکومت کے بانی کی دلچسپیاں اپنی رعایا کی صرف مادی فلاح و بہبود کی حد تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اُس نے مختلف طریقوں سے عربوں، شامیوں، نومیدیوں، بربروں، ہسپانوی عربوں اور گاتھوں کو ایک ہی قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی بڑی دلسوزی سے کوشش کی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے سوا اس نے مختلف حیثیتوں سے اس ذہنی تحریک کی بھی ابتدا کی جس کی بدولت اسلامی اسپین نویں اور گیارھویں صدی میں عالمی ثقافت کے دو عظیم الشان مرکزوں میں گنا جاتا تھا۔

پورے یورپ میں خلیفہ عبدالرحمٰن کا دربار ہی سب سے زیادہ شاندار دربار تھا۔ اس دربار میں جرمنی، اطالیہ اور فرانس کے حکمرانوں کے سوا بازنطینی شہنشاہ نے اپنے سفیر بھیجے تھے۔ اس کا پایہ تخت قرطبہ تھا۔ قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ تھی۔ یہاں سات سو مسجدیں

---

(۵)

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار — حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب — ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی — خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے — رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(مترجم)

اور تین سو پبلک حمام تھے۔ شان و شوکت کے لحاظ سے بغداد اور قسطنطنیہ ہی قرطبہ کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ شاہی قصر شہر کی شمال مشرقی سمت میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے جبل الشارات (Sierra Moreva) کی ایک چوٹی پر واقع تھا۔ اس میں چار سو حجرے اور کمرے تھے۔ یہاں ہزاروں لونڈی غلام اور محافظ رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن ثالث کی ایک کنیز بہت سی دولت چھوڑ مری تھی۔ اس کی یہ وصیت تھی کہ اس دولت کو مسلمانوں کے فدیہ میں صرف کیا جائے جو نصرانیوں کی قید میں ہوں۔ جب اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیا گیا کہ نصرانیوں کی قید میں کوئی مسلمان قیدی نہیں ہے تو خلیفہ نے سنہ ۹۳۹ء میں اپنی ایک اور کنیز زہرا کی تجویز پر یہ عالی شان قصر تعمیر کرایا اور اس کو "الزہرا" ہی کے نام سے موسوم کیا۔ اس قصر کا سنگِ رخام نومیدیا اور قرطاجنہ سے منگایا گیا تھا۔ اس کے ستون، حوض اور ان کے طلائی مجسمے قسطنطنیہ سے لائے گئے تھے یا قسطنطنیہ سے تحفۃً بھیجے گئے تھے۔ دس ہزار معمار اور مزدور اور ڈیڑھ ہزار باربرداری کے جانور مسلسل بیس سال تک اس قصر کی تعمیر پر کام کرتے رہے۔ عبدالرحمن ثالث کے بعد کے خلفاء بھی قصر الزہرا کی توسیع و آرائش میں حصے لیتے رہے۔ بعد میں اس کے اطراف میں اتنے مکان بنے کہ یہ قصر ایک نواحی شہر کا مرکز بن گیا۔ اس شہر کے آثار کا ایک حصہ سنہ ۱۹۱۰ء میں زمین سے کھود کر نکالا گیا تھا اور اسے اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

خلیفہ نے قصر الزہرا کے اطراف سلافی (Slaves) محافظ دستے کا پہرہ قائم کیا تھا۔ یہ سلافی صقالبہ کہلاتے تھے۔ اس محافظ دستے میں تین ہزار ساڑھے سات سو آدمی تھے۔ اور یہ خلیفہ کی ایک لاکھ مستقل فوج کے سردار تھے۔ صقالبہ پہلے پہل ان غلاموں اور قیدیوں کو کہا جاتا تھا جنہیں جرمن اور دوسرے لوگ سلافی قبیلوں سے پکڑ پکڑ کر لاتے اور عربوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ لیکن بعد میں چل کر تمام زرخرید یورپی غلاموں کو بھی صقالبہ کہا جانے لگا۔ اور ان میں فرانک، گالیشین (Galician)، لمبارڈ اور ایسی ہی دوسری

قوموں کے غلام ہوتے تھے۔ بطور کلیہ یہ لوگ نوعمری حاصل کیے جاتے تھے اور انہیں عرب بنا لیا جاتا تھا۔ اسپین کے ان "انکشاریوں" (Janissaries) یا "مملوکوں" کی مدد سے خلیفہ نہ صرف غداروں اور قزاقوں پر نظر رکھتا تھا بلکہ ان کے ذریعہ پرانے عرب امیروں کے اثر و رسوخ کو گھٹاتا بھی رہتا تھا۔ اس زمانے میں تجارت اور زراعت کو خوب ہی فروغ حاصل ہوا اور سلطنت کی آمدنی کے ذرائع بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ خراج سے خلیفہ کو باسٹھ لاکھ پینتالیس ہزار دینار کے لگ بھگ آمدنی ہوتی تھی۔ اس آمدنی کا ایک تہائی حصہ فوجی ضرورتوں کے لیے کافی ہو جایا کرتا تھا۔ دوسرا ایک تہائی حصہ امور عامہ پر خرچ کیا جاتا تھا اور باقی ایک تہائی حصہ پس انداز کر لیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے قرطبہ کو کبھی ایسی خوش حالی نصیب نہ ہوئی تھی، اور نہ اندلس کبھی اتنا مالامال ہوا تھا، اور نہ اسپین کی سلطنت کو ایسی اقبال مندی حاصل ہوئی تھی۔ اس سرزمین کو زندگی کی یہ ساری نعمتیں صرف ایک شخص کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔ اس جلیل القدر ہستی نے تہتر سال کی بڑی عمر میں وفات پائی کہتے ہیں کہ اس نے اپنی ایک تحریر چھوڑی ہے۔ اس تحریر میں لکھا ہے "میں نے ساری عمر میں خوشی اور مسرت کے صرف چودہ ہی دن دیکھے ہیں۔"

مشرق ہو کہ مغرب، بنی امیہ ہوں کہ بنی عباس غرض ہر جگہ اور ہمیشہ اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ متزلزل اور غیر مستحکم رہا ہے۔ اسپین میں بنی امیہ کے ہاتھوں میں زمام حکومت اسی وقت آئی جب سے کہ عبدالرحمٰن نے اس سرزمین پر اپنی قوت اور اپنے اقتدار کا سکہ بٹھایا تھا۔ لیکن جب اس خاندان کے دوسرے ممتاز خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے سنہ ۹۱۲ء میں مسند خلافت پر قدم رکھا تو اس وقت خانہ جنگیوں، قبائلی بغاوتوں اور امیروں کی عام سیاسی نااہلیت کے ہاتھوں اسپین کی منظم اسلامی سلطنت صرف شہر قرطبہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اپنے نامور پیش رو کی طرح عبدالرحمٰن ثالث نے بھی عین عالم شباب میں حکومت کے

بارِگراں کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تیئیس سال سے زیادہ نہ تھی اپنے دادا عبدالرحمٰن اوّل کی طرح یہ بھی بڑا سمجھ دار اور ارادے کا پکا جوان تھا۔ ایک ایک کرکے اس نے اپنی سلطنت کے کھوئے ہوئے علاقوں کو نئے سرے سے فتح کیا اور ان کی اندرونی بدامنیاں دور کیں اور بڑے تدبّر کے ساتھ ان میں نظم و ضبط قائم کیا۔ عبدالرحمٰن ثالث نے ۹۱۲ء سے ۹۶۱ء تک یعنی مسلسل پچاس سال تک حکومت کی۔ اس کا دورِ حکومت اس زمانے کے اعتبار سے بہت زیادہ طویل رہا ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ امیر عبدالرحمٰن نے ۹۲۹ء میں سب سے پہلے امیر کی جگہ خلیفہ اور امیرالمومنین کا لقب اختیار کیا۔ اسی دن سے اسپین کی اموی خلافت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے اور اس کے جانشین خلیفہ الحکم ثانی (۹۶۱ء۔ ۹۷۶ء) اور حاجب منصور (۹۷۶ء۔ ۱۰۰۲ء) کے دور میں مغرب کی اسلامی سلطنت اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اس زمانے میں یعنی دسویں صدی کے لگ بھگ بنی اُمیہ کا دارالخلافہ قرطبہ یورپ کا سب سے زیادہ متمدن اور سب سے زیادہ مہذب شہر بن گیا تھا۔ قسطنطنیہ اور بغداد کے بعد تہذیب و تمدن کا یہی تیسرا مرکز تھا۔ اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکان، اکیس ۲۱ نواحی محلّے، ستر کتب خانے کتابوں کی بہت سی دکانیں اور کئی مسجدیں تھیں۔ اس شہر کو بین قومی شہرت حاصل ہوگئی تھی اور اس کا نام سن کر سیّاحوں کے دل میں شان و شوکت اور دلکشی و زیبائی کا ایک عجیب نقشہ پھر جاتا تھا۔ یہاں پکّی سڑکیں اور پختہ شاہراہیں تھیں۔ ان شاہراہوں پر جو مکان بنے ہوئے تھے، ان پر روشنی کرکے راتوں میں ان شاہراہوں کو میلوں تک منوّر رکھا جاتا تھا حالانکہ اس زمانے سے سات سو سال بعد بھی "شہر لندن کی کسی شاہراہ کو کوئی پبلک لمپ نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور شہر پیرس کی سڑکوں کی بھی صدیوں تک یہ حالت رہی کہ بارش کے موسم میں جو کوئی اپنے گھر کی دہلیز سے نیچے اُترتا اُس کے پاؤں ٹخنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتے تھے"۔

نارڈک (Nordic) وحشیوں ــ شمالی یورپ کے جرمن قبیلے ــ کو عرب جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ طلیطلہ کے ایک عالم قاضی صاعد بن احمد (متوفی ۱۰۷۰ء) کے اس بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے "چونکہ ان لوگوں کے سروں پر آفتاب کی شعاعیں بالکل سیدھی نہیں پڑتیں، اس لیے ان کی آب و ہوا سرد اور ماحول ابر آلود رہتا ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کے مزاج ٹھنڈے اور ان کی طبیعتیں اجڈ ہیں۔ ان کے جسم کافی پھیل گئے ہیں، چہرے پتلے اور بال لمبے ہو گئے ہیں۔ ان میں جودت طبع اور بصیرت نام کو نہیں۔ بلکہ اس کی بجائے ان پر بیوقوفی اور کند ذہنی مسلط ہے"۔ لیون (Leon) نافارا (Navarre) اور بارشلونا (Barcelona) کے حکمرانوں کو جب کبھی کسی جراح، راج معمار، یا اُستاد گانے والے یا لباس بنانے والے کی ضرورت ہوتی تو وہ قرطبہ ہی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس اسلامی دار السلطنت کی شہرت اتنی دور دور تک پہنچ گئی تھی کہ جرمنی کی ایک ساکزن راہبہ نے اس شہر کے قصے سُن سُن کر اس کو "نگینۂ عالم" کا لقب دیا تھا۔

خلفاء کے دورِ حکومت میں اسپین یورپ کے امیر ترین اور آباد ترین ملکوں میں گنا جانے لگا تھا۔ اس کے دار السلطنت قرطبہ ہی میں کوئی تیرہ ہزار جلاہے آباد تھے۔ اور یہاں چمڑے کی صنعت بڑے پیمانے پر جاری تھی۔ مراکش میں چمڑے کی دباغت اور گل کاری کا فن اسپین ہی سے منتقل ہوا تھا۔ اور ان دونوں ملکوں سے یہ فن فرانس اور انگلستان والوں نے سیکھا۔ اس واقعہ کی شہادت قرطبی چمڑے کے لیے Cardwainer, Cordovan اور مراکشی چمڑے کے لیے Morocco کی اصطلاحوں سے بخوبی ملتا ہے۔ اون اور ریشم کے کپڑے قرطبہ کے سوا مالقہ المریّہ اور دوسرے مرکزوں میں بھی بنے جاتے تھے۔ ریشم کے کیڑوں کی پرورش ابتداءً چین کا اجارہ بنی ہوئی تھی۔ اسے اسپین کی سرزمین میں سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے رواج دیا تھا۔ اور یہاں اس صنعت کو خوب ہی فروغ حاصل ہوا۔ المریّہ میں شیشے اور کانسے کا سامان بھی تیار ہوتا تھا۔ بلنسیہ کا ایک قصبہ باترنا کوزہ گری کا مرکز تھا۔ جیان اور الغرب سونے چاندی کی کانوں

قرطبہ لوہے اور سیسے کی کانوں اور مالقہ لعل دیا قوت کی کانوں کے لیے مشہور تھا۔ دمشق کی طرح طلیطلہ بھی اپنی تلواروں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ فولاد اور دوسری دھاتوں پر سونے چاندی کی مرصع کاری کا فن اسپین نے دمشق سے سیکھا اور اس فن کو اسپین کے سوا یورپ کے دوسرے مرکزوں میں بھی بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ چنانچہ لسانی باقیات میں Damascen اور Dameskean جیسے الفاظ اب بھی اس واقعہ کی گواہی دے رہے ہیں۔

مغربی ایشیا میں زراعت کے جو طریقے رائج تھے، ان سے اسپینی عربوں نے یورپ کو روشناس کرایا۔ ان لوگوں نے اسپین میں نہریں کھودیں، انگور کے باغ لگائے، اور دوسرے پودوں اور پھلوں کے سوا چاول، خوبانی، شفتالو، انار، نارنگی، نیشکر، روئی اور زعفران کی کاشت بھی پہلے پہل ان ہی عربوں نے شروع کی۔ جزیرہ نما کے جنوب مشرقی میدانوں کو قدرت کی طرف سے زرخیز زمین اور اچھی آب و ہوا ملی ہے۔ ان میدانوں میں شہری اور دیہی صنعت و حرفت اور تجارت کے اہم مرکز فروغ پاتے رہے۔ یہاں کے کاشتکار زیتون اور دوسرے خشک میووں کے سوا گیہوں اور دوسرے اناجوں کی کاشت بھی کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ زمینداروں سے پیداوار میں شراکت کے معاہدوں پر کھیتی باڑی کا کام کیا کرتے تھے۔

یہ زرعی ترقی بھی اسلامی اسپین کا ایک بہت بڑا کارنامہ اور اس سرزمین کے حق میں عربوں کا ایک لافانی عطیہ ہے۔ چنانچہ اسپینی باغات آج بھی "موروں" یعنی اندلسی عربوں کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ یہاں کا ایک مشہور باغ Generelixe ہے۔ یہ لفظ عربی نام "جنۃ العریف" (انسپکٹر کی جنت) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ باغ تیرہویں صدی میں بنا اور دولت نصریہ کی یادگار ہے۔ اس باغ کا محل الحمراء کے بیرونی محلوں میں تھا۔ یہ باغ اپنے "وسیع سایہ دار کنجوں، نقلی آبشاروں اور ہوا کی نزہت بیزیوں کے لیے ضرب المثل تھا" اس کو ایک مدور تماشہ گاہ کی صورت میں بنا کر اس کی چمن بندی کی گئی تھی۔ ایسی نہریں بنا کر اسے سیراب کیا گیا تھا کہ بے شمار جھرنے اور آبشار نباتی پھولوں کے تختوں، جھاڑیوں

اور درختوں کے کنجوں میں کھو جایا کرتی تھیں۔ آج بھی اس باغ میں تھوڑے سے سرو و چنار کے بلند و بالا درخت کھڑے اس باغ کی عظمت رفتہ کی ماتم داری کر رہے ہیں۔

اسلامی اسپین کی صنعتی اور زرعی پیداواریں ملک کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ اشبیلیہ، اسپین کا ایک زبردست دریائی بندرگاہ ہے۔ یہاں سے روئی، زیتون، اور تیل برآمد کیا جاتا تھا۔ اور مصر سے کپڑا، غلام اور یورپ سے گانے والیاں درآمد کی جاتی تھیں۔ مالقہ اور جیان کی بندرگاہوں سے جو چیزیں برآمد ہوتی تھیں ان میں زعفران، انجیر، سنگِ مرمر، اور شکر بھی شامل تھی۔ اسکندریہ اور قسطنطنیہ کے ذریعہ اسپینی پیداواروں کو ہند اور وسطی ایشیا جیسے دور دراز علاقوں تک میں منڈی حاصل ہو گئی تھی۔ خاص کر دمشق، بغداد اور مکہ سے بڑی سرگرم تجارت ہوا کرتی تھی۔ عصر حاضر کی بین قومی جہازرانی کی فرہنگ میں آپ کو Admiral (امیر البحر) Arsenal (دار الصناعہ) Avarage (عواریہ)، Cable (حبل) اور Shellop (جلبہ) جیسے عربی الاصل الفاظ ملیں گے۔ ان الفاظ سے گذشتہ زمانوں میں عربوں کے بحری اقتدار کی بیّن شہادت ملتی ہے۔

حکومت کے تحت ڈاک ۔۔ برید ۔۔ کا باقاعدہ انتظام تھا۔ اس حکومت نے اپنے سکّے مشرقی سکّوں کے نمونے پر ڈھلوائے تھے۔ سونے کا سکّہ دینار اور چاندی کا سکّہ درم کہلاتا تھا۔ شمال کی نصرانی سلطنتوں میں بھی عربی سکّے رائج تھے اور تقریباً چار سو سال تک ان سلطنتوں میں عربی یا فرانسیسی سکّوں کے سوا اور کوئی سکّہ رائج نہ تھا۔

اس عہد کی حقیقی عظمت سیاسی میدان کی جگہ دوسرے میدانوں میں نظر آتی ہے۔ عبد الرحمٰن ثالث کا جانشین الحکم خود عالم اور علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اس نے عالموں کو فیاضانہ عطیے اور وظیفے دیے تھے۔ اس خلیفہ نے اپنے دار الخلافت میں ستائیس مکتب ایسے قائم کیے تھے جس میں مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے عہد میں جامعہ قرطبہ کو جو عبد الرحمٰن ثالث کی بنائی ہوئی جامع مسجد میں قائم کی گئی تھی، دنیا کے تمام تعلیمی

اداروں میں ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ یہ جامعہ قاہرہ کی جامع ازہر اور بغداد کی جامعہ نظامیہ دونوں سے شہرت میں بڑھ گئی تھی۔ یہاں نہ صرف اسپین کے مسلمان اور نصرانی طالب علم آتے تھے بلکہ یورپ افریقہ اور ایشیا کے تشنگانِ علم بھی اپنی پیاس بجھانے یہاں آنے لگے تھے۔ الحکم نے اس جامع مسجد کی توسیع کرائی۔ اس میں سیسے کے نلوں کے ذریعہ آبرسانی کا انتظام کیا اور اس کو بازنطینی فن کاروں کے لائے ہوئے پچی کاری ٹائیلوں سے آراستہ کیا۔ الحکم نے اس جامعہ کے لیے مشرق کے عالموں کی خدمات حاصل کیں۔ ان عالموں کے مشاہروں کے لیے اس نے بہت سی جائیدادیں بھی وقف کر رکھی تھیں۔

جامعہ کے سوا شہر قرطبہ میں ایک اول درجہ کا کتب خانہ بھی تھا۔ خلیفہ الحکم کتابوں کا عاشق تھا۔ اس کے کارندوں نے کتابیں خریدنے یا قلمی نسخے نقل کرانے کی غرض سے اسکندریہ، دمشق اور بغداد کے تمام کتاب فروشوں کی دکانیں چھان ڈالی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس طریقہ سے الحکم نے تقریباً چار لاکھ کتابیں فراہم کر لی تھیں۔ ان کتابوں کی فہرست چالیس جلدوں پر مشتمل تھی اور ہر جلد کے بیس صفحے صنف شاعری کی کتابوں کے ناموں کے لیے مختص کیے گئے تھے۔ عالمِ اسلام میں جتنے خلیفہ گزرے ہیں الحکم ان میں سب سے بڑا جید عالم ہوا ہے۔ اس نے ان کتابوں میں سے بہت ساری کتابیں خود پڑھی تھیں۔ بعض قلمی نسخوں پر اس نے حواشی بھی لکھے ہیں جن کی وجہ سے بعد کے زمانے کے ناشروں اور مدیروں کی نظر میں ان نسخوں کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اسی زمانے میں ابوالفرج اصفہانی جو بنی اُمیہ سے تھا، عراق میں اپنی کتاب "کتاب الاغانی" لکھ رہا تھا۔ اس کتاب کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لیے الحکم نے ابوالفرج اصفہانی کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے تھے۔ اس وقت اندلس کا عام ثقافتی معیار اتنی بلندی پر پہنچ گیا تھا کہ ممتاز ولندیزی عالم ڈوزی (Dozy) نے اس کے متعلق جوشِ ستائش میں یہ تک لکھ دیا کہ "اندلس کے تقریباً ہر آدمی کو لکھنا پڑھنا آتا تھا"۔ اور یہ اس

زمانے کی بات ہے جب کہ نصرانی یورپ بس علم کی مبادیات ہی جانتا تھا، اور یہ مبادیات بھی بڑی حد تک گنتی کے اراکین کلیسا جانتے تھے۔

# ۱۵۔ مغرب پر احسان

مسلم اسپین کے ایک کالج کے باب الداخلہ پر جو کتبہ نصب ہے، اس میں یہ مقبول مقولہ درج ہے" دنیا کا مدار چار چیزوں پر ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدوں کا تقویٰ اور جوانمردوں کی شجاعت۔

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ اس یورپی تحریر میں جو اسلامی تصورات پیش کیے گئے ہیں ان میں علم و دانش ہی کو پہلا مقام دیا گیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی فوجوں نے مغربی دنیا پر اپنی مردانگی کا نہایت گہرا نقش بٹھایا تھا لیکن یہ نقش دیرپا ثابت نہیں ہوا اگرچہ عربوں کا دین یورپی تخیل کو پوری طرح مسخر نہ کر سکا، اور عربوں کا تصور عدل یہاں کم ہی کامیاب رہا لیکن اسلامی علم و ادب نے مغربی تفکر میں مختلف نقاط سے راہ پائی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے ذہنی ارتقا کی تاریخ میں مسلم اسپین نے ایک نہایت ہی درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط اور تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز کے درمیانی زمانے میں عربی بولنے والے ہی ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار بنے ہوئے تھے۔ عربی زبان ہی وہ واسطہ تھی جس کے ذریعہ قدیم سائنس اور فلسفہ کی بازیافت ہوئی ان میں اضافے ہوئے، ان کی اشاعت ہوئی اور ان سے مغربی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا مسلم اسپین کا سب سے زبردست اور جید عالم اور بدیع مفکر علی ابن حزم گزرا ہے۔ یہ ۹۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۶۴ء میں فوت ہوا۔ علی ابن حزم کا شمار ایسے دو تین اسلامی مصنفوں میں ہوتا ہے جن کا ذہن نہایت شاداب اور جن کی تصانیف

بے شمار ہیں۔ سوانح نگاروں نے تاریخ، فقہ، حدیث، منطق، شاعری اور متعلقہ موضوعات کی کوئی چار سو کتابیں اس سے منسوب کی ہیں اس کی باقی ماندہ تصانیف میں سب سے گراں قدر تصنیف وہ ہے جس نے ابن حزم کو تقابلی دین کے پہلے عالم ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ اس کتاب میں ابن حزم نے توریت اور انجیل کی داستانوں کے الجھاؤے دکھائے ہیں اور یہ الجھاوے ایسے تھے کہ سولھویں صدی میں معنوی تنقید کے پیدا ہونے تک کسی اور کا ذہن ان کی طرف منتقل نہ ہو سکا تھا۔

سترہویں صدی کے دوران میں مغربی یورپ کی نثر میں جو فرضی قصے کہانیاں اور اخلاقی تمثیلیں رائج رہیں ان میں اور ابتدائی عربی قصوں میں بڑی واضح مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ عربی قصے خود بھی ہندو ایرانی قصوں سے لیے گئے تھے۔ کلیلہ و دمنہ کے پر لطف قصوں کا ترجمہ قشتالیہ اور لیون کے بادشاہ الفانسو دانا (۱۲۵۲-۱۲۸۴ء) کے لیے اسپینی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک نو نصرانی یہودی نے ان قصوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا تھا۔ ان قصوں کا فارسی سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس ترجمہ سے لافانطین (Lafantain) نے استفادہ کیا ہے جس کا خود اس شاعر نے اعتراف کیا ہے" مقامہ" مسجع و مقفیٰ نثر میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی لسانی ندرتوں سے کام لیا جاتا ہے اس سے مقصود ایک سورما سوار کی مہموں کی داستان کے ذریعہ اخلاقی سبق دینا ہوتا ہے اسپینی زبان کے لیسے ناول جن میں ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے کردار پیش کیے گئے ہیں ان میں اور مقامہ میں قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یورپی ادب پر عربی زبان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنی طرز انشاء کا جو اثر ڈالا ہے اسی کی بدولت مغربی تخیل کو سخت ترین ذہنی بندشوں سے رہائی نصیب ہوئی جن میں وہ روایات کے ہاتھوں گرفتار تھا۔ اسپینی ادب کے اعلیٰ امزاح میں عربی نمونوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ سروانٹس (Cervantes) کی کتاب ڈان کوئیک زاٹ (Don Quixote) کی ظرافت اور بذلہ سنجی

میں بھی یہی رنگ دکھائی دیتا ہے اس کتاب کا مصنف ایک بار الجیریا میں گرفتار ہو گیا تھا اور
اس نے ازراہ مزاح یہ مشہور کر دیا تھا کہ اس کتاب کی اصل عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔
عربی زبان جہاں کہیں اور جب کبھی استعمال کی گئی وہاں شعر گوئی کا مذاق بڑے
زور شور کے ساتھ فروغ پاتا رہا بے گنتی اشعار ایک سے دوسرے تک زبانی منتقل ہوتے
اور اعلیٰ وادنیٰ ہر ایک سے داد تحسین حاصل کرتے تھے الفاظ کے حسن و ترنم سے محظوظ ہونا
عربی بولنے والی قوموں کی خاص خصوصیت ہے اور اس خصوصیت نے اسپین میں بھی
اپنے جلوے دکھائے ہیں۔ اندلس کا پہلا اموی حکمراں اور اس کے بہت سے جانشین شاعر
تھے اکثر حکمرانوں نے اپنے اپنے درباروں میں ملک الشعرا مقرر کر رکھے تھے۔ انہیں وہ سیر و
سیاحت اور رزم و بزم میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اشبیلیہ کو اس پر فخر تھا کہ یہاں
کے اعلیٰ درجہ کے شاعروں کی گنتی دوسرے تمام شہروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ
تھی ایک عرصہ سے قرطبہ میں بھی مذاق شعر کی شمع روشن ہو چکی تھی بعد میں یہی شمع غرناطہ
میں اس وقت تک ضیا پاشی کرتی رہی جب تک کہ یہ شہر اسلام کی پناہ گاہ بنا رہا۔
ابن زیدون (۱۰۰۳ء سے ۱۰۷۱ء) ایک اور بڑا اور مشہور شاعر ہوا ہے۔ اس کا تعلق
ایک عرب گھرانے سے تھا۔ ابتداء میں یہ قرطبہ کی چند سری (Oliganhchy) حکومت کے
صدر کا معتمد تھا، اس کے بعد غالباً خلیفہ مستکفی کی شاعرہ بیٹی الولّادہ سے بے محابا عاشقی
کی پاداش میں اپنے عہدے سے معزول کیا گیا۔ پھر کئی سال تک قید اور جلاوطنی کے بعد
وزیر اعظم اور امیر الجیش کے دہرے عہدے پر فائز ہوا، اور ذوالوزارتین یعنی وزیر سیف اور
وزیر قلم کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا۔ حسین و جمیل اور فاضل الولّادہ نے ۱۰۸۷ء میں وفات
پائی۔ اس کے ذاتی حسن و جمال اور ادبی قابلیت کی بڑی شہرت تھی، اس طرح وہ گویا اسپین
کی سیفو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کی عرب عورتوں میں ادب اور شاعری کا خاص
ذوق اور خاص فطری میلان پایا جاتا تھا۔

اسپین کی عربی شاعری نے رسمیاتی جکڑبندیوں سے ایک حد تک آزاد ہو کر نئی بحریں اور نئی طرزیں ایجاد کیں اور حسنِ فطرت کا تقریباً ویسا ہی ادراک حاصل کیا جو جدید شاعری میں پایا جاتا ہے، یہ شاعری اپنی چھوٹی چھوٹی رزمیہ نظموں اور عشقیہ غزلوں کے ذریعہ ان روحانی احساسات کا اظہار کرنے لگی جن میں قرون وسطیٰ کے سپاہیانہ نظام کے جلوے پنہاں تھے نغمہ و موسیقی نے ہر جگہ شاعری کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا اور اُسے استوار رکھا ہے۔

عام طور پر عربی شاعری اور خاص کر اس کی وہ صنف جو غزل کہلاتی ہے دیسی نصرانیوں کو بہت بھا گئی تھی جن عوامل نے نصرانیوں کو عربی ادب کو اپنانے پر اُبھارا ان میں سب سے زیادہ طاقتور عامل یہی غزل کی شاعری تھی عربی تغزلی شاعری کی دو طرزوں کو قشتالیہ کی مقبول عام طرز Villaincica کی صورت میں فروغ حاصل ہوا یہ طرز نصرانی گیتوں اور میلاد مسیح کی نظموں میں بہت زیادہ استعمال کی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی ہی میں اسپینی زبان میں افلاطونی محبت کی جو باقاعدہ تحریک شروع ہوئی تھی اس پر عربی شاعری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ گیارہویں صدی کے آخر میں جنوبی فرانس کے اولین پراونسی (Provancal) شعراء عشق و محبت کی شعلہ سامانیوں کو عجیب و غریب پر بہار تخیل کے سانچوں میں ڈھلتے بڑے زور شور کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے غزل گو شاعر جنہیں بارہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا تھا اپنے جنوبی "غزل سرا" (Zajal Singer) معاصروں ہی کے پیرو تھے۔ عربی مثالوں کو ہی اپنے سامنے رکھ کر جنوبی یورپ میں مُسلک ظرافت' (Cult of Dame) یک بیک نمودار ہوا۔ ابتدائی یورپی ادب کی سب سے بڑی یادگار 'چانسن دی رولان (Chanson de Roland) ہے جو سنہ ۱۰۸۰ء میں لکھی گئی۔ جس طرح ہومر کی نظموں سے تاریخی یونان کے آغاز کا پتہ چلتا ہے، بالکل اسی طرح چانسن دی رولان سے بھی ایک نئے تمدن یعنی مغربی یورپ کے تمدن کے آغاز کے آثار و علامات کا سراغ ملتا ہے یہ کتاب اپنی تخلیق کے لحاظ سے ایک ایسے فوجی ربط کی رہینِ منت

ہے جو اہل یورپ نے اس زمانہ میں اسلامی اسپین سے قائم کیا تھا۔

جیساکہ ہم دیکھ آئے ہیں، اسپین میں ابتدائی تعلیم بہت عام تھی اور تمام اسلامی ملکوں کی طرح اس کی بنیاد قرآن پڑھنے اور عربی صرف ونحو اور شاعری کے مطالعہ پر رکھی گئی تھی۔ عملی دنیا میں عورتوں کے مراتب ثابت کرتے ہیں کہ اندلس میں ان مقولوں پر کم ہی عمل کیا جاتا تھا جن میں عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی ممانعت آئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اساس دینیات، صرف ونحو، شاعری، لغت، تاریخ اور جغرافیہ تھی۔ کئی بڑے بڑے شہروں میں ایسی درس گاہیں تھیں جنہیں جامعات کہا جاسکتا ہے، ان میں قرطبہ، اشبیلیہ، بالقہ اور غرناطہ کی جامعات بہت ہی بلند پایہ تھیں جامعہ قرطبہ میں فقہ اور قانون کے سوا ہیئت، ریاضیات اور طب کے شعبے بھی قائم کیے گئے تھے۔ اس جامعہ میں ہزاروں طالب علم شریک ہوتے تھے اور یہاں کی سندیں ملک کے سب سے زیادہ بیش قرار عہدوں کی ضامن سمجھی جاتی تھیں جامعہ قرطبہ کا نصابِ تعلیم فقہ، اصول، قانون، طب کیمیا، فلسفہ اور ہیئت کے مضامین پر حاوی تھا۔ قشتالیہ اور دوسرے ملکوں کے طالب علم اس ادارہ کے بڑے دلدادہ تھے۔

جامعات کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کو بھی فروغ حاصل ہوتا گیا۔ قرطبہ کا شاہی کتب خانہ وسعت کے لحاظ سے بہت بڑا اور علمی ذخیرے کے اعتبار سے سب سے بہتر کتب خانہ تھا۔ بہت سے لوگوں کے پاس جن میں کچھ عورتیں بھی شامل ہیں اپنے خانگی کتب خانے بھی ہوتے تھے۔ سیاسی مجلسیں اور ناٹک گھر یونان اور روما کی زندگی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اسلامی زندگی میں ان چیزوں کو کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ اس لیے اسلامی زندگی نے کتابوں ہی کو حصول علم کا تنہا ذریعہ بنا دیا تھا۔

جیساکہ ہم بغداد کی سیر میں دیکھ چکے ہیں، وہاں کاغذ کی صنعت کافی فروغ پا چکی تھی اسلام نے یورپ پر جو بڑے بڑے احسان کیے ہیں ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے یورپ کو کاغذ سازی کے فن سے آشنا کرایا۔ اندلس میں بھی مقامی

طور پر کاغذ تیار کیا جاتا تھا اور اسی کی بدولت یہاں بڑی تعداد میں کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ ورنہ کاغذ کی صنعت کے بغیر یہ کبھی ممکن نہ ہوتا۔ مراکش نے کاغذ کی صنعت مشرق سے سیکھی اور بارہویں صدی کے وسط میں یہ صنعت مراکش سے اسپین منتقل ہوئی۔ انگریزی زبان میں اس تاریخی حقیقت کی ایک لسانی شہادت "ریم" (Ream) کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ یہ لفظ قدیم فرانسیسی لفظ Raym سے لیا گیا ہے۔ فرانسیسی زبان نے یہ لفظ اسپینی زبان کے لفظ Resma سے حاصل کیا ہے اور خود اسپینی زبان نے یہ لفظ عربی لفظ "رِزمہ" سے مستعار لیا ہے۔ اس لفظ کے معنی عربی میں گٹھری کے ہیں۔ اسپین کے بعد کاغذ سازی کی صنعت ۱۲۷۰ء کے قریب اسلامی اثر کے نتیجہ کے طور پر غالباً صقلیہ سے اطالیہ آئی۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ فرانس میں کاغذ سازی کے کارخانے پہلے پہل نصرانی مجاہدوں کے ذریعہ قائم ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اسپین کا عطیہ ہے۔ ان دونوں ملکوں سے کاغذ سازی کی صنعت پورے یورپ میں پھیل گئی۔ عبدالرحمٰن کا ایک معتمد اپنے گھر پر سرکاری مراسلے لکھ کر ایک خاص دفتر "طبع" — چھپائی کی اولین صورت — کرنے کے لیے بھیج دیا کرتا تھا اور اس کے بعد یہاں سے حکومت کے مختلف نمائندوں کے نام اس کے نسخے جاری ہوتے تھے۔

اسپین کی اسلامی سلطنت کی بربادی کے بعد فلپ ثانی (۱۵۵۶ء — ۱۵۹۸ء) اور اس کے جانشینوں نے جو باقی ماندہ کتابیں عربی کتب خانوں سے فراہم کیں ان کی تعداد کم وبیش دو ہزار تھی یہی کتابیں کتب خانۂ اسکوریال کی بنیاد بنیں۔ یہ کتب خانہ شہر میڈرڈ سے کچھ دور اب بھی موجود ہے۔ ان کتابوں کے سوا اور دوسری کتابوں کی فراہمی کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ سترہویں صدی کی ابتدا میں مراکش کا ایک سلطان شریف زیدان اپنے مال ومتاع کے ساتھ کہیں فرار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا کتب خانہ بھی ایک جہاز پر بار کرا دیا۔ لیکن اس جہاز کے کپتان کو پوری اُجرت پیشگی نہیں ملی تھی اس لیے اس نے

ان کتابوں کو اپنی منزل مقصود پر اتارنے سے انکار کر دیا اور مارسیلز جاتے ہوئے راستے میں یہ بحری قزاقوں کے ہتھے چڑھ گیا، ان کتابوں کی تعداد کم وبیش تین چار ہزار تھی۔ فلپ سوم کے حکم پر اس مال غنیمت کو اسکوریال کے کتب خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور اس کی بدولت یہ کتب خانہ عربی زبان کے قلمی نسخوں کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا۔

مغربی مسلمانوں نے ادب اور تاریخ کے میدان میں جو کمال دکھائے ہیں ان میں بنی نصر کے دربار کے دو عہدہ دار دوستوں یعنی ابن الخطیب اور ابن خلدون کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے لسان الدین بن الخطیب (۱۳۱۳ء۔۱۳۷۴ء) شام کے ایک عرب خاندان میں پیدا ہوا اس کا خاندان شام سے ہجرت کر کے اندلس میں آباد ہو گیا تھا غرناطہ کے بنی نصر کے ساتویں سلطان یوسف بن الحجاج اور اس کے بیٹے محمد پنجم نے اسے ذوالریاستین کا خطاب دیا تھا۔ ۱۳۷۱ء میں یہ ایک درباری سازش سے جان بچا کر بھاگا اور اس کے تین سال بعد فاس کے مقام پر ایک خانگی جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کی موت سے پورے عرب اسپین کا نہیں لیکن غرناطہ کا آخری مشہور ومعروف مصنف، شاعر اور سیاس دنیا سے اٹھ گیا۔ ابن خطیب نے شاعری، تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر ساٹھ کتابیں لکھی ہیں ان ساٹھ کتابوں میں سے اس وقت ایک تہائی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔ اس کی جو کتابیں زمانے کی دست برد سے بچ رہی ہیں، ان میں سے ہمارے لیے سب سے اہم غرناطہ کی تفصیلی تاریخ ہے۔

عبدالرحمن بن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) تونس کے ایک اندلسی خاندان میں پیدا ہوا یہ خاندان اپنا سلسلۂ نسب قبیلۂ کندہ سے ملاتا تھا۔ اس خاندان کا بانی نویں صدی میں یمن سے اندلس میں ہجرت کر آیا تھا اس خاندان کے لوگ تیرہویں صدی تک بھی اشبیلیہ میں باقی تھے۔ اپنی خدمت سے معزول ہونے سے پہلے وہ فاس میں کئی بڑی خدمتوں پر فائز رہا۔ ۱۳۶۲ء میں اس نے غرناطہ کے سلطان محمد سادس کی خدمت اختیار کر لی۔ اس سلطان نے ابن خلدون سے کئی اہم سیاسی کام لیے۔ اس کے بعد وہ اپنے طاقتور دوست ابن الخطیب کے

حسد کا شکار رہا، اور اندلس چھوڑ کر المغرب چلا آیا اور یہاں تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گیا۔ ابن خلدون کو اپنے مقدمہ (تاریخ) کی بنا پر بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں ابن خلدون نے پہلی بار تاریخ کے ارتقار کا نظریہ دنیا کے آگے پیش کیا ہے۔ اس نظریے میں اخلاقی اور روحانی قوتوں کے سوا آب وہوا اور جغرافیہ کے طبعی حقائق بھی پورے وقوف وآگہی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ قومی عروج وزوال کے قوانین کی دریافت اور ان کی تدوین کی سب سے پہلی کوشش ابن خلدون ہی نے کی ہے۔ اس لیے ابن خلدون کو۔ جیسا کہ خود اس نے دعوے کیا ہے فن تاریخ کی ماہیت اور اس کی وسعت کا انکشاف کرنے والا یا کم سے کم عمرانی علوم کا حقیقی بانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ابن خلدون سے پہلے تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ایسی وسیع اور فلسفیانہ نظر۔ یورپ والوں کا ذکر ہی کیا۔ کسی عرب مصنف نے بھی نہیں ڈالی تھی۔ ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں وفات پائی۔ دنیا نے اس کے کارنامے پر جتنی تنقیدیں اور تبصرے کیے ہیں ان سب میں اتفاق اسی بات پر کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کا عظیم ترین اور دنیا کا ایک زبردست مفکر تاریخ گزرا ہے۔

عربوں کی جغرافیائی تحقیقات کا اثر مغرب پر کم پڑا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریے کو عربوں ہی نے ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔ ہم اس سے پہلے ہندوؤں کے اس تصور کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ زمین کے نصف معلوم کرہ کا ایک مرکز ہے جو چاروں سمتوں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے اس کو آرین (Arin) کہتے ہیں۔ اس آرینی نظریہ کو ایک لاطینی تصنیف میں جگہ مل گئی جو ۱۴۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف سے کولمبس نے وہ نظریہ اخذ کیا جس کی رو سے اُسے یقین ہو چلا تھا کہ زمین کی شکل ناشپاتی جیسی ہے اور مغربی نصف کرہ میں آرین کے مقابل ویسا ہی ایک اونچا مرکز واقع ہے۔

مسلمانوں نے ہیئتی جغرافیہ اور ریاضیات کے جدید تصورات سے مغربی علوم کے دامن بھر دیے تھے۔ اسپین میں ہیئت کا باقاعدہ مطالعہ دسویں صدی کے بعد سے شروع ہوا

تھا۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کے مسلمان حکمرانوں کو اس سے بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اندلس کے اکثر ہیئت داں ستاروں کے اثرات کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں سے اکثر واقعات ستاروں ہی کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ستاروں کے اثرات کا مطالعہ یعنی علم نجوم کی تحصیل کے شوق کی بدولت دنیا کے تمام مقامات کے محلِ وقوع اور ان کے طولِ بلد اور عرضِ بلد متعین کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح علم نجوم ہیئت کا سرچشمہ بن گیا۔ لاطینی مغرب میں مشرقی ہیئت اور نجوم کا شوق اسپین ہی کے ذریعہ پھیلا۔ اسپین ہی میں مسلمانوں کی اہم ترین ہیئتی تصانیف کے لاطینی ترجمے ہوئے اور تیرہویں صدی میں الفانسو دہم نے جو الفانسوی جدولیں تالیف کی تھیں، وہ اسلامی ہیئت کی ایک ارتقائی شکل کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ عرب مصنفوں نے ستاروں سے متعلق جو تحقیق کی تھی اس کے ذریعہ انہوں نے کروی اور مستوی مثلث کے ابتدائی ابواب دیے۔ کیونکہ الجبرا اور تحلیلی علم ہندسہ کی طرح علم مثلث کی بنیاد بھی بڑی حد تک عربوں ہی نے ڈالی ہے جو کوئی بھی اجرام فلکی کے کسی معمولی نقشے پر نظر ڈالے تو یہ بات اس پر روشن ہو جائیگی کہ عرب ہیئت دانوں نے آسمان پر بھی اپنی محنت کے لازوال ارتسامات چھوڑے ہیں۔ یورپی زبانوں میں نہ صرف ستاروں کے نام ہی عربی الاصل ہیں۔ جیسے Acrab عقرب، Algedi الجدی Altair الطائر، Daneb ذنب، Pherked فرقد وغیرہ۔ بلکہ ان زبانوں میں بے شمار فنی اصطلاحیں بھی ایسی ملینگی جو عربی الفاظ سے لی گئی ہیں۔ جیسے Azimuth السموت، Nadir النظیر Zemit السمت وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں علم و حکمت کے اس بے بہا اسلامی ترکے کا بین ثبوت ہیں جس سے نصرانی یورپ مستفید ہوا ہے۔

عربی زبان سے ریاضیات کی جتنی بھی اصطلاحیں مستعار لی گئی ہیں ان میں ایک نہایت دلچسپ اصطلاح "صفر" ہے۔ اگرچہ عربوں نے "صفر" ایجاد نہیں کیا، لیکن عربوں ہی نے

یورپ کو عربی اعداد کے ساتھ ساتھ "صفر" سے بھی روشناس کرایا۔ اور اہل مغرب کو اس مفید ترین حسابی طریقہ کے استعمال کا ڈھنگ سکھا کر روزمرہ کی زندگی میں عملی حساب کی سہولتیں مہیا کیں۔ اگر حساب میں "صفر" کا استعمال نہ ہوتا تو ہمیں اپنے اعداد کے جوڑنے کے لیے اکائیوں دہائیوں اور سیکڑوں وغیرہ کے خانوں کا ایک جدول تیار کرنا یا گنتارا استعمال کرنا پڑتا۔

غیر مسلم یورپ میں عربی اعداد کی نشر و اشاعت کی رفتار بہت ہی سست رہی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں تمام تر اور ایک حد تک تیرہویں صدی میں بھی نصرانی یا تو قدیم رومی اعداد اور گنتارے استعمال کرتے رہے یا جدید عربی اعشاری نظام کو اپنے پرانے نظام سے ملا کر اس سے کام لیتے رہے، عملی مقاصد میں نئے رموز سب سے پہلے اطالیہ میں استعمال کیے گئے، پیسا کے لیونارڈو فیبانکی نے ۱۲۰۲ء میں ایک کتاب شائع کی جو عربی اعداد کی ترویج و اشاعت میں بڑی عہد آفریں ثابت ہوئی۔ اس شخص نے ایک مسلمان استاد کی شاگردی کی تھی اور شمالی افریقہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کتاب نہ صرف عہد آفریں ثابت ہوئی بلکہ اسی کتاب سے یورپی ریاضیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر پرانے اعداد ہی استعمال ہوتے رہتے تو علم حساب نے اب جو اپنی بعض شاخوں میں ترقی کی ہے وہ ہرگز ممکن نہ ہوتی۔ ہم اس وقت اپنے علم حساب کو جس ترقی یافتہ صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ تمام تر عربی اعداد اور "صفر" ہی کا کرشمہ ہے۔

مغربی مسلمانوں نے ہیئت اور ریاضیات کی طرح مطالعۂ قدرت کے میدان میں خاص کر خالص اور اطلاقی نباتیات کی تحقیقات سے دنیا کے علم میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے کھجور اور حشیش جیسے درختوں اور پودوں کے صنفی اختلاف کے نہایت صحیح مشاہدے کیے، انہوں نے پودوں کی تقسیم گروہوں میں کی، پہلا گروہ ان پودوں کا قرار دیا جو قلم لگانے سے اُگتے ہیں۔ دوسرا گروہ ایسے پودوں کا مانا جو بیج سے اُگتے ہیں اور تیسرے گروہ میں ایسے پودے شامل

کے جنہیں وہ خودرَو سمجھتے تھے اشبیلیہ کے ابن العوام نے بارہویں صدی کے آخر میں زراعت پر ایک رسالہ لکھا تھا یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہ صرف اہم ترین اسلامی رسالہ مانا جاتا ہے، بلکہ سارے قرونِ وسطیٰ میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں منظرِ عام پر آئیں ان سب میں اس رسالہ کا مرتبہ بہت بلند ہے ابن العوام نے اس رسالہ کی تیاری میں کچھ تو قدیم یونانی اور عربی ماخذوں سے خوشہ چینی کی ہے اور کچھ اسپین کے کاشتکاروں کے عملی تجربوں سے استفادہ کیا ہے، اس رسالہ میں پانچ سو چھاسی درختوں اور پچاس سے زیادہ پھلوں کی کاشت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس میں قلم لگانے کے نئے مشاہدے بھی پیش کیے گئے ہیں اور زمین اور کھاد کے خواص بیان کیے گئے ہیں ان کے سوا درختوں اور انگور کی بیلوں کے امراض کی علامتیں اور ان کے علاج کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔

اسپین بلکہ حقیقت میں اسلامی دنیا کا مشہور ترین عطار اور ماہر نباتیات عبداللہ ابن احمد ابن البیطار گزرا ہے اس نے ۱۲۴۸ء میں بمقام دمشق وفات پائی، عبداللہ بن البیطار نے "آسان علاجوں" پر ایک رسالہ یادگار چھوڑا ہے۔ یہ رسالہ قرونِ وسطیٰ کے تمام رسالوں میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

عام طور پر اسپین کے عرب طبیب پیشہ ور طبیب تھے انھوں نے طب کا پیشہ اپنی طبعی صلاحیتوں کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ ابن رشد، ابن میمون، ابن باجہ اور ابن طفیل وغیرہ پہلے فلسفی تھے۔ ابن الخطیب کو ہم ادیب اور مورخ کی حیثیت سے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے پاس اور دوسرے بہت سے طبیبوں کی طرح ایک قلمدان وزارت بھی تھا۔ چودھویں صدی کے وسط میں یورپ "کالی بلا" یعنی طاعون کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہا تھا اور ملت مسیح کو اس عقیدہ نے بالکل ہی لاچار اور بے دست و پا بنا رکھا تھا کہ یہ وبا قضائے الٰہی ہے جس کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن غرناطہ کے اسی مسلمان طبیب نے اس زمانہ میں تعدیہ کی تائید میں ایک رسالہ لکھا۔ اس رسالہ میں حقیقی سائنٹفک تحقیقات کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تعدیہ کے امکان کو نہیں مان سکتے، کیونکہ یہ احکام الٰہی کے خلاف ہے

ان لوگوں کو ہمارا یہ جواب ہے کہ تعدیہ کا وجود تجربات، تحقیقات، فہم و ادراک کی شہادت اور قابل اعتماد بیانات سے ثابت ہے، یہ تمام حقائق زبردست دلیلیں۔ تعدیہ کی صداقت ہر تحقیق کرنے والے پر پوری طرح ثابت ہو سکتی ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو کسی متعدی مرض میں مبتلا مریض کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور رہتا سہتا ہے آخرکار اسی مرض میں خود بھی مبتلا ہو جاتا ہے لیکن ایک ایسا شخص جو متعدی مرض میں مبتلا مریض سے دور رہتا ہے اس مرض سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ تحقیق کرنے والا یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ متعدی مرض کے جراثیم مریض کے کپڑوں، اس کے کھانے پینے کے برتنوں حدیہ کہ کان کے بندوں کے ذریعہ سے بھی دوسرے آدمیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی فتح اسپین کی ابتدائی دو صدیوں میں مشرقی ثقافت کا دریا اندلس کی سرزمین میں کافی چڑھاؤ کے ساتھ بہتا رہا۔ اسپین کے عالم طلب علم میں مصر، شام، عراق یہاں تک کہ ماوراء النہر اور چین تک کا سفر کیا کرتے تھے لیکن گیارہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں میں دریا کا رخ بالکل پلٹ گیا اور بارہویں صدی میں یہ پورے چڑھاؤ کے ساتھ یورپ کی طرف بہنے لگا۔ شمالی افریقہ اور اسپین نے اور خاص کر شہر طلیطلہ (جہاں کریمونا کے جیرارڈ اور مائیکل اسکاٹ نے کام کیا تھا) نے عربی طب کو یورپ منتقل کرنے میں نہایت اہم حصہ لیا ہے اسی کی بدولت طب کی تینوں روایتوں یعنی یہودی، نصرانی اور اسلامی روایتوں کو ترجمہ کی صورت میں یکجا ہونے کا موقع ملا، ترجمے کے اس روپ میں روایتیں آسانی کے ساتھ ایک دوسرے میں گھل مل گئیں ان ترجموں کے سوا ایسے ہی دوسرے ترجموں کے ذریعے سے بھی عربی زبان کی بہت سی فنی اصطلاحیں یورپی زبانوں میں رائج ہو گئیں مثلاً Gulup (عربی لفظ جلاب جو فارسی لفظ گلاب کا معرب ہے اور اس کے معنی عرق گلاب کے ہیں) کی اصطلاح ایک خوشبودار طبی مشروب کے لیے استعمال کی جاتی ہے طبی ضابطے کے مطابق شکر کو پانی میں حل کر کے اس میں کوئی دوا ملا دی جاتی ہے اور اس محلول کو Syrup کہتے ہیں جو عربی لفظ شراب سے لیا گیا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی لاطینی میں سوڈا Soda کے معنی دردِ سر اور

سوڈانیم (Sodanium) کے معنی درد سر کے علاج کے تھے حقیقت میں یہ عربی لفظ "صداع" ہے جس کے معنی شدید درد سر کے ہیں۔ عربی تصانیف کی بے شمار کیمیائی اصطلاحیں لاطینی زبان کے ذریعہ یورپی زبانوں میں پھیل گئیں۔ مثلاً الکوہل (Alcohal)، المبک (Alembic)، القلی (Alkali) اور انٹی مونی (Antimony) وغیرہ۔

اسپین کے عرب عالموں کا سب سے بڑا کارنامہ تو وہ ہے جو انہوں نے فلسفیانہ تفکر کی اقلیم میں انجام دیا ہے، ان لوگوں نے اور ان کے مشرقی ہم مذہبوں نے یونانی فلسفہ کو اپنی جن تصانیف اور تالیفوں کے ذریعہ لاطینی مغرب میں منتقل کیا ہے، اگر اس کو ایک زنجیر سے تعبیر کیا جائے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسپین کے عربوں نے اس زنجیر میں آخری اور محکم ترین کڑی کا اضافہ کیا ہے۔ اس علم میں اُنھوں نے اپنی طرف سے اضافے کیے ہیں اور خاص کر عقل و ایمان، مذہب اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کر کے بہت بڑا کام کیا ہے اگرچہ مسلمان مفکروں کے نزدیک ارسطو کا کہا حق تھا، افلاطون کا کہا حق تھا اور قرآن کا کہا حق تھا لیکن حق کا ایک ہی ہونا بھی از بس ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں میں مطابقت کے لیے وہ بڑی مستعدی سے کمربستہ ہو گئے۔ کسی زمانہ میں نصرانی متکلموں کو بھی اسی مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن ان کی دینیات میں عقائد اور اسرار دونوں یکجا ہو جانے کی وجہ سے ان کا کام اور مشکل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں یونانیوں کا فروغ دیا ہوا فلسفہ اور عبرانی پیغمبروں کا پروان چڑھایا ہوا دینِ توحید یہی دو چیزیں قدیم مغرب اور قدیم مشرق کے سب سے بڑے ورثے ہیں۔

جدید تصورات کا جو پہلا سیلاب (اس میں زیادہ تر فلسفہ اور طب کے تصورات تھے) یورپ میں امنڈا ہے، اس سے تاریک زمانہ ختم ہوتا ہے اور علمی دور کی سحر نمودار ہوتی ہے، عربی خیالات سے واسطہ پڑنے پر یورپ والوں کے دلوں کو علم و فلسفہ کی تحصیل کے شوق نے گرمایا اور قدیم یونانی علوم کی نو آگہی نے اس آتشِ شوق کو اور بھڑکایا۔ ان دونوں کے طفیل اہلِ یورپ

نے بڑی تیزی اور مستعدی کے ساتھ اپنا آزاد علمی ماحول پیدا کرلیا جس کے ثمرات سے ہم اب تک مستفید ہوتے چلے آرہے ہیں۔

یہاں ہم مسلم اسپین کے بہت سے بڑے بڑے فلسفیوں میں صرف چند ایک ہی کا ذکر کرسکتے ہیں۔ ان میں ایک ابن طفیل ہے جس نے ۱۱۸۵ء میں وفات پائی ہے اس کا شاہکار ایک اچھوتا فلسفیانہ افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا عنوان ہے "حیی ابن یقظان" اس افسانے کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ فہم انسانی کسی خارجی عامل کی مدد کے بغیر عالمِ بالا کی آگہی حاصل کرسکتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس دنیا کا دارومدار ایک قادر مطلق ہستی پر ہے۔ یہ قرون وسطیٰ کے ادب کا بالکل اچھوتا اور نہایت دلکش افسانہ ہے۔ اڈورڈ پوکاک نے ۱۶۷۱ء میں اسے پہلی بار لاطینی میں منتقل کیا تھا پھر اس کے بعد یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ چنانچہ ولندیزی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۶۷۲ء میں، روسی زبان میں ۱۹۲۰ء میں اور اسپینی زبان میں حال ہی میں یعنی ۱۹۳۱ء میں ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی تصنیف "رابن سن کروسو" کا سرچشمہ بھی یہی کتاب ہے۔

اپنے اثر اور خاص کر مغرب پر اپنے اثر کے لحاظ سے سب سے بڑا مسلمان فلسفی عرب اسپین کا ہیئت داں، طبیب اور ارسطو کا شارح ابن رشد ہے جسے یورپ والے Averroes کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابن رشد ۱۱۲۵ء میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا تھا۔ علم طب میں اس کا اہم ترین کارنامہ اس کی وہ تصنیف ہے جس میں اس نے اس حقیقت کو تسلیم کرایا ہے کہ کسی شخص کے چیچک ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں نکلتی اور جس میں پردۂ چشم (شبکۃ العین) کے وظیفہ کی ٹھیک ٹھیک تشریح کی گئی ہے۔ تاہم یہودی اور نصرانی دنیا میں ابن رشد پہلے پہل ارسطو کے فلسفہ کے شارح کی حیثیت سے مشہور رہا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ قرون وسطیٰ کے شارح بذات خود مصنف ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ اگلوں کی تصانیف کے خاکے کے اندر یا اس کو پس منظر میں رکھ کر فلسفہ یا سائنس پر اپنی مستقل تصانیف پیش کیا کرتے تھے۔

اس طرح ابن رشد نے جو شرحیں لکھی ہیں وہ سب کی سب اصل میں اس کے اپنے مستقل رسالوں کا ایک سلسلہ ہیں۔ اپنے بعض رسالوں میں ابن رشد نے ارسطو کی بعض تصانیف کے صرف نام لیے ہیں اور ان کے مضامین کے خلاصے کیے ہیں۔ مسلم ایشیا یا مسلم افریقہ کے مقابلہ میں ابن رشد کا رشتہ نصرانی یورپ سے زیادہ استوار معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح ارسطو کو اہل مغرب نے 'استاذ' مانا ہے بالکل اسی طرح ابن رشد کو 'شارح' تسلیم کیا ہے۔ حقیقت میں یہ ابن رشد کا ارسطو تھا جس نے قرون وسطیٰ کے یورپی نصرانیوں، اہل مکتب اور عالموں کے دلوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ بارہویں صدی کے آخر سے لے کر سولہویں صدی کے ختم تک سب سے زیادہ ذی اثر مکتب خیال ابن رشد کا فلسفہ ہی تھا۔ تنگ خیال مذہبی ردعمل کے باوجود یہ مکتبِ خیال سب سے پہلے اسپین کے مسلمانوں ہی میں قائم ہوا اس کے بعد یہودیوں اور آخر میں نصرانی پادریوں میں اس کی نشر و اشاعت ہوئی۔ ابن رشد عقلیت پسند تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مذہب کے الہامی اصول و عقائد کے سوا ہر چیز کو عقل اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے چنانچہ ابن رشد کے اس خیال کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ آزاد خیالی کا بانی اور مذہب کا بہت بڑا دشمن تھا۔ لیکن اس خیال میں کچھ بھی صداقت نہیں ارسطو کے فلسفہ پر جن اگلے مسلمان محققوں نے کام کیا تھا، اُنھوں نے بہت سی غیر مستند کتابوں کو بھی ارسطو کی تصنیف سمجھ لیا تھا، ان میں بہت سی نوافلاطونی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ابن رشد کے فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو خالص اور سائنٹفک ارسطاطالیت کا راستہ دکھایا، مذہبی علماء نے ابن رشد کی تصانیف سے مذہب کی نظر میں قابل اعتراض اجزاء کو خارج کیا اور اس کے بعد جامعہ پیرس اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں میں اس کی تصانیف نصاب میں شریک کی گئیں، ابن رشد نے جس ذہنی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اپنے تمام محاسن و معائب کے ساتھ یورپی تفکر میں جدید تجربی سائنس کے ظہور تک ایک ذی حیات عامل کی

طرح اپنا کام کرتی رہی۔

اس زمانے کے فلسفیوں میں اگر کسی کو ابن رشد کے بعد پہلا درجہ دیا جاسکتا ہے تو وہ اس کا ہم عصر اور ہم وطن قرطبی یہودی ابن میمون یا ابن میمونڈ ہے جو عیسٰی ابن میمون کے نام سے مشہور ہے۔ اسے پورے عربی دور کے تمام یہودی فلسفیوں اور طبیبوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ۱۱۳۵ء میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا لیکن اس کا خاندان مسلمانوں کی مذہبی تعذیب کی تاب نہ لاکر ۱۱۶۵ء میں قاہرہ چلا آیا اور یہیں بس گیا۔ بعض سوانح نگاروں نے دعویٰ کیا ہے کہ ابن میمون نے اسپین میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا اور درپردہ دین موسوی پر قائم رہا لیکن اس دعوے پر حال ہی میں نقادوں نے سخت تنقیدیں کی ہیں، قاہرہ میں ابن میمون شہرۂ آفاق سلطان صلاح الدین اور اس کے بیٹے ملک العزیز کا درباری طبیب مقرر ہوا۔ ۱۱۷۷ء میں اس کو قاہرہ کے یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی عہدہ دیا گیا اس عہدہ پر وہ اپنی وفات تک فائز رہا۔ اس نے ۱۲۰۴ء میں وفات پائی۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت کو اسی راستہ ہاتھوں پر لیجایا گیا جس پر کسی زمانے میں حضرت موسیٰؑ چل چکے تھے اور طبریہ لے جاکر وہاں اُسے دفن کیا گیا، اس کی قبر تکلف سے بری اور بالکل سیدھی سادی ہے۔ اس کی زیارت کے لیے اب بھی ہزاروں زائر آیا کرتے ہیں۔ مصر جدید کے نادار یہودی مریض اب بھی قاہرہ کے صلوات ربی موسیٰ بن میمون کے تہ خانے میں اس لیے شب بسر کیا کرتے ہیں کہ اس مقام کی برکت سے ان کا مرض دور ہو جائے۔ یہودیوں کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "موسیٰ سے موسیٰ تک موسیٰ کا ہم پلہ کوئی نہیں ہوا" اس کہاوت سے یہودیوں میں موسیٰ بن میمون کی ہر دلعزیزی اور اس کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ابن میمون نے ایک ہیئت داں، عالم دینیات، طبیب اور سب سے بڑھ کر ایک فلسفی کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اس نے ختنہ کے طریقہ کی اصلاح کی۔ بواسیر کی علت قبض

کو قرار دیا اور اس کے لیے ایک ایسی ہلکی پھلکی غذا تجویز کی جس میں بیشتر ترکاریاں ہیں۔ حفظ صحت
کے بارے میں اس کے تصورات بہت بلند تھے، طب میں اس کی سب سے مشہور کتاب
"الفصول فی الطب" ہے۔ فلسفہ پر اس نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور
وہ کتاب ہے جس کا نام "دلالۃ الحائرین" ہے۔ اس کے معنی پریشان لوگوں کے رہنما کے
ہیں۔ اس کتاب میں اس نے موسوی شریعت کو اسلامی ارسطاطالین سے یا اس سے بھی
وسیع تر معنی میں عقل اور مذہب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس نے
پیغمبرانہ خوابوں کی تعبیر اس طرح کی ہے گویا یہ بھی طبعی تجربات تھے۔ اس حد تک کم سے کم وہ
حکمیاتی فلسفہ کا علم بردار رہے اور یہ فلسفہ اناجیل کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسند علماء اس سے اس قدر بگڑ گئے کہ اس کی کتاب کو "دلالۃ" کے بجائے
"ضلالۃ" یعنی بھٹکانے والی کہنے لگے۔ اس کتاب میں اور اسی طرح دوسری کتابوں
میں جو فلسفیانہ تصورات پیش کیے ہیں وہ ابن رشد کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ابن
میمون نے اس باب میں ابن رشد سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ آزادانہ طور پر انہیں
فروغ دیا ہے۔ ابن رشد کی طرح وہ بھی یونانی زبان سے ناواقف تھا اور اس کو صرف عربی
ترجموں پر تکیہ کرنا پڑا۔ اگرچہ اُس نے نظریہ تخلیق کو پیش ضرور کیا ہے لیکن اس پر غور و فکر کرنے میں
اس نے خود حصہ نہیں لیا۔ اس زمانے کے ان تمام مفکروں کے پاس جو عربی زبان میں اپنے
افکار و تخیلات پیش کیا کرتے تھے دو قسم کے نظریے تھے پہلا نظریہ انجیل کے بنیادی عقائد کی
صداقت کا ہے اس کی رو سے خدا کو ہر شے کا خالق تسلیم کیا گیا ہے اور دوسرا نو افلاطونی
اور ارسطاطالیسی نظریہ تھا۔ ابن میمون کا پیش کیا ہوا نظریہ ان دونوں نظریوں سے الگ
تھا اس کا یہ نظریہ جوہر کے نظریہ سے مشابہ تھا، ایک کتاب کے سوا اس کی تمام تصانیف عربی
زبان میں ہیں، لیکن ان کا رسم خط عبرانی ہے۔ یہ تصنیفیں بہت جلد عبرانی زبان میں اور اس کے بعد
جزئی طور پر لاطینی زبان میں منتقل ہو گئیں۔ ان تصانیف نے اپنے اثرات زیادہ تر یہودیوں اور

نصرانیوں پر مرتب کیے ہیں اور یہ اثرات زمان و مکان کے اعتبار سے بہت دور رس تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس کی کتابیں یہودی فلسفہ کو غیر یہودی فرقوں میں منتقل کرنے میں زبردست وسیلہ بنی رہیں۔ چنانچہ دور جدید کے نقادوں نے البرٹس میاگنس (Albertus Magnes) اور اس کے رقیب ڈنس اسکوٹس (Dans Scotus) اور اسپی نوزا (Spinuza) حتیٰ کہ کانٹ (Kant) کی تصانیف میں بھی ابن میمون کی تصانیف کے اثر کا سراغ لگایا ہے۔

اس زمانے کے عارف کامل اور اسلامی تصوف کے روحِ رواں ایک ہسپانوی عرب محیی الدین ابن عربی تھے۔ یہ اشبیلیہ میں پیدا ہوئے اور وہیں انہوں نے اپنی زندگی بسر کی لیکن ۱۲۴۰ء میں بمقام دمشق وفات پائی، جہاں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ انہوں نے اپنی ایک تصنیف میں حضرت محمدؐ کے سفر معراج اور سیر افلاک کے واقعہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ ڈانٹے (Dante) نے اپنے شہ کار طربیہ خداوندی کی تیاری میں اسی تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔

تیرہویں صدی کے آخر تک عربی سائنس اور عربی فلسفہ دونوں یورپ منتقل ہو چکے تھے۔ وہ ذہنی راستہ جو طلیطلہ کے پھاٹکوں سے شروع ہو کر کوہ پرنیز میں سے ہو کر گزرتا تھا اب پراونس (Provence) اور الپائن (Alpine) کے دروں میں سے بل کھاتا لورین، جرمنی، وسطی یورپ اور رود بار انگلستان کو پار کر کے انگلستان کی سرزمین تک پہنچ گیا تھا، سرزمین فرانس میں مارسیلز، تولوز، ناربونے اور مانٹ پلیر عربی فلسفہ کے مرکز بن گئے تھے، مغربی فرانس میں کلونی کا خطہ جہاں کی خانقاہ میں کئی اسپینی راہب مقیم تھے۔ بارہویں صدی میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا تھا، پیٹر نامی یہاں کے ایک پادری نے ۱۱۴۱ء میں اسلام کے خلاف کئی رسالے شائع کرنے کے سوا قرآن کا سب سے پہلا لاطینی ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ لورین یا لوتھارنجیا (Lotharingia) میں عربی سائنس کی ترویج دسویں صدی میں ہوئی تھی اس کی بدولت یہ سارا علاقہ بعد کی دو صدیوں تک سائنٹفک تحقیق کا

مرکز بنا رہا۔ عربی علوم وفنون کی ترویج کے لیے لیاج۔ گورز۔ کولون اور دوسرے لوتھارنجی شہروں نے نہایت ہی زرخیز زمین فراہم کی تھی۔ لورین سے عربی علوم وفنون کی شعاعیں جرمنی کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنے لگیں، لورین کے باشندوں اور یہاں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں نے اس روشنی کو نارمن انگلستان میں منتقل کیا، اسپینی عربی علوم وفنون سارے مغربی یورپ کی رگ وپے میں سرایت کر گئے اور ان علوم وفنون کو یورپ میں منتقل کرنے کے لیے اسپین واسطے کی جو خدمت انجام دیتا چلا آرہا تھا، اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

# ۱۶۔ ہلال پر صلیب کا سایہ

پہلی اسلامی صدی میں عرب کے ابنائے بادیہ نے جس حیرت انگیز تیزی کے ساتھ متمدن دنیا کے بیشتر حصّہ کو فتح کر لیا، اس تیزی کی نظیر اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد تیسری صدی کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے وسط کے درمیانی زمانے میں عربی اقتدار کا تنزل و انحطاط ہے۔ سنہ ۸۶۲ء کے قریب جتنا وسیع اقتدار اکیلے ایک آدمی یعنی بغداد کے خلیفہ کو حاصل ہو گیا تھا ویسا اقتدار روئے زمین پر کسی اور ذی حیات مخلوق کو حاصل نہ تھا۔ لیکن سنہ ۹۲۰ء میں اسی خلیفہ کے جانشین کے اقتدار کی یہ حالت تھی کہ خود دارالخلافہ بغداد پر اس کا کچھ ایسا بس نہ چلتا تھا۔ سنہ ۱۲۵۸ء میں یہ شہر ہی خود تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے زوال کے ساتھ ہی عربی سیادت کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور حقیقی خلافت کی تاریخ بھی تمام ہو گئی۔

خارجی عوامل میں وحشی مغلوں یا تاتاریوں کی ہولناک یورشیں آخر کار بغداد کی خلافت کے زوال کا سبب دکھائی دیتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان یورشوں نے صرف زوال کا راستہ صاف کیا ہے۔ حدیہ کہ قلب خلافت اور خلافت کے دائرے میں جو بے شمار آزاد اور نیم آزاد حکمراں خاندان حشرات الارض کی طرح اُبل پڑے تھے، وہ بھی مرض انحطاط کی علت نہیں بلکہ علامت تھے۔ مغرب کی رومی شہنشاہیت کی طرح خلافت بغداد کا مرد بیمار بھی پہلے ہی سے بستر مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا کہ لٹیرے دروازے توڑ کر اندر گھس آئے اور میراث شاہی میں سے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا لوٹ لے گئے۔

خلافت اب پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ پہلے تو یہ کہ ابتداء میں جتنی بھی فتوحات حاصل ہوئی تھیں، ان میں سے اکثر تو برائے نام تھیں اور جو طریق جہانبانی اختیار کیا گیا وہ ان فتوحات کی

بقا و استحکام میں ممد و معاون ثابت نہ ہو سکا۔ جلب منفعت اور غیر منصفانہ حصول اندازی گویا مسلمہ حکمت عملی کی تعریف میں داخل کر لیے گئے تھے۔ یہ استثنا نہیں قاعدہ بن گیا تھا۔ عربوں اور غیر عربوں کے درمیان عرب مسلمانوں اور نو مسلموں کے درمیان اور مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان امتیازی سلوک باقی رہا۔ خود عرب قوم میں بھی شمال اور جنوب میں امتیاز کا جذبہ کارفرما رہا۔ ایرانی، عجمی، تورانی، ترک اور حامی بربر سامی عربوں کے ساتھ ایک متجانس کل کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ کوئی نسلی شعور ان تمام مخالف و متضاد عناصر کو باہم مربوط و متصل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اہل ایران کی چشم تصوّر سے ان کی قدیم قومی عظمت کے جلوے محو ہونے نہیں پائے تھے اس لیے وہ کبھی بھی اس نئے نظامِ حکومت سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوئے۔ بربروں نے ہر قسم کی فرقہ وارانہ تحریکوں میں خوشی خوشی حصہ لے کر اپنی قبیلہ واریت اور اپنے الگ ہونے کے احساس کا غیر واضح طور پر اظہار کیا۔ اہل شام ایک مدت سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کون رہنما انہیں عباسیوں کے طوق سے نجات دلائیگا۔ خود دین کے اندر بھی کئی مرکز گریز قوتیں سرگرمی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ یہ قوتیں حربی اور سیاسی قوتوں سے کچھ کم نہ تھیں۔ شیعہ، قرامطی، حشاشین اور اسماعیلہ جیسے فرقے ان ہی مرکز گریز قوتوں کے شاخسانے تھے۔ ان میں سے اکثر فرقے مذہب سے زیادہ دوسرے اغراض و مقاصد کی نمائندگی کرتے تھے۔ قرامطہ نے خلافت کے مشرقی حصہ کو اپنی پے در پے ضربوں سے بے حال کر رکھا تھا اور اس کے بعد ہی فاطمیوں نے خلافت کے مغربی حصہ پر قبضہ کر لیا۔

اس زوال و انحطاط میں بہت سی سماجی اور اخلاقی قوتوں کا ہاتھ بھی شامل تھا۔ سیکڑوں سالوں کے دوران میں فاتحوں کا خون مفتوحوں کے خون سے مل کر اپنا خالص رنگ کھو بیٹھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحوں کا اعلیٰ مرتبہ اور ان کے بہتر صفات سب ناپید ہو گئے۔ عربوں کی قومی زندگی کے انحطاط کے ساتھ ہی عرب تحمل اور عرب اخلاق کا خاتمہ

ہوگیا۔ فاتحوں کی مملکت آہستہ آہستہ مفتوحوں کی مملکت بن گئی۔ حرم اور حرم کے بے شمار خواجہ سرا ننگ نسوانیت کنیزیں اور ننگ آدمیت غلمان، قصر شاہی کی بے گنتی خواصیں اور اَن گنت سوتیلے بھائی بہن، ان کی ناگزیر رقابتیں اور سازشیں، نغمہ و شراب میں ڈوبی ہوئی عیش پرست زندگی ــــ غرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے عوامل نے مل کر منزلی زندگی کا رس چوس لیا تھا۔ تخت و تاج کے پہلے ہی سے کمزور وارثوں کا موقف جانشینی کے حق کے بارے میں ان کے ان گنت جھگڑوں اور منافستوں کی وجہ سے اور بھی غیر یقینی بن کر رہ گیا تھا۔

ایسے ہی معاشی عوامل اہم تھے۔ محاصل کی کثرت اور حکمراں طبقہ کے فائدے کی صوبہ داری حکومت دونوں نے زراعت اور صنعت و حرفت کی کمر توڑ دی۔ حکمراں طبقہ جتنا دولتمند ہوتا جاتا اسی نسبت سے عوام کی غربت بڑھتی جاتی تھی۔ بڑی ریاستوں کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتی جارہی تھیں۔ اور ان کے والی مستقل طور پر اپنے زرعی غلاموں کو لوٹ رہے تھے۔ پے در پے خون آشام لڑائیوں نے فوجی بھرتی میں انسانوں کو کھینچا تو کھیتی باڑی کی بہت سی زمینیں تباہ ہو کر رہ گئیں۔ عراق ادنیٰ میں موسمی طغیانیوں سے تباہی پھیل رہی تھی اور مملکت کے مختلف علاقوں میں بارش کی کمی اور قحط کی وجہ سے بربادیوں میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ طاعون، چیچک، ملیریا، اور دوسرے بخار جیسی وباؤں کا بار بار پھیلنا، جن کے آگے قرون وسطیٰ کا انسان بالکل بے بس تھا، بڑے بڑے علاقوں کی آبادی کو کم سے کم کرتا جاتا تھا۔ عربوں کی فتوحات کے بعد چار صدیوں کے وقائع میں ہمیں جن بڑی بڑی اور ہولناک وباؤں کا تذکرہ ملتا ہے ان کی تعداد چالیس سے کم نہیں ہے۔

اسپین اور یورپ کے دوسرے حصوں میں اسلامی اقتدار کے زوال کے اسباب مجموعی حیثیت سے اسی قسم کے ہیں جن کے ہاتھوں مملکت کے مشرقی اور وسطی علاقوں میں خلافت کا خاتمہ ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں یہ کاری ضرب نصرانیوں نے لگائی اور وہاں یہ کام

مغلوں نے کیا۔

قرطبہ کی اموی خلافت کا قصر ۱۰۳۱ء میں منہدم ہوا۔ اس کے کھنڈر پر کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں نمودار ہوئیں لیکن یہ سب کی سب آپس کے کشت و خون میں مشغول ہو گئیں ایسی کوئی شعلہ مستعجل ہیں ریاستیں ہیں شہروں یا صوبوں میں نمودار ہوئیں اور ان میں افضلیت اشبیلیہ کی ریاست کو حاصل تھی۔ کسی زمانے میں یہاں کے دربار کی شان و شوکت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دربار قرطبہ کے دن یاد آنے لگے تھے لیکن اسی صدی کے ختم ہونے سے پہلے دوسری ریاستوں کے ساتھ اشبیلیہ کی ریاست بھی ایک نئی ترقی پذیر طاقت یعنی مراکش کے ایک بربر خاندان کا شکار ہو گئی۔ اب اسپین میں بربر سیادت کا دور شروع ہو چکا تھا۔

یہ بربر خاندان جو شمالی مغربی افریقہ اور اسپین دونوں ملکوں پر حکمراں تھا مرابطین (۱۰۹۰ء۔ ۱۱۴۷ء) کہلاتا تھا۔ "مرابط" کے معنی ہتھیا ربند "عابد" کے ہیں۔ اس خاندان کی ابتدا عسکری بھائی چارے سے ہوئی تھی۔ مرابطوں کی بھرتی پہلے پہل ایسے قبیلوں سے ہوئی تھی جن کے افراد نقاب پہنا کرتے تھے۔ یہ نقاب آنکھ کے نیچے پورے چہرے کو چھپائے ہوتا تھا چنانچہ طوارق قبیلے کے لوگ جو انہی کی اولاد ہیں اور الجزائر کے جنوب میں رہتے ہیں اب بھی ایسا ہی نقاب پہنتے ہیں۔ اسی لیے مرابطین کا دوسرا نام "ملثمین" ۔ نقاب پوش۔ پڑ گیا۔ مرابطین کے بعد ایک اور بربر قبیلے نے زور پکڑا۔ عرب خاندانوں میں غرناطہ کا حکمراں خاندان بنی نصر قابل ذکر ہے جس کی حکومت دولت موحدین کے نام سے مشہور ہوئی۔ محمد الغالب کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ اس نے ۱۲۳۲ء سے ۱۲۷۳ء تک حکومت کی اور مشہور عالم قصر الحمراء اسی فرمانروا نے تعمیر کرایا تھا۔

غرض مشرق میں، مغرب میں ہر جگہ اسلامی مملکت طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں جگہ جگہ بن گئیں لیکن اس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، تاہم اس داستان کا عام خاکہ اور خاص کر یورپ میں اسلامی اقتدار کے آخری دنوں کی داستان

قابل ذکر ہے۔ اس داستان میں ایک دلچسپ اور ہمیشہ کی طرح شاندار بات یہ ہے کہ عوام اور ثقافتوں کے درمیان امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش برابر جاری رہی ہے اور ایسے زمانوں میں بھی کی گئی ہے جبکہ یہ دونوں عناصر نہایت بے رحمی کے ساتھ ایک دوسرے کو فنا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اپنا علم اور اپنا آرٹ ہی دوسروں تک پہنچانے کی جو صلاحیت انسان کے اندر پنہاں ہے وہی اس کے تمدن کی بہت سی بہترین اور دیرپا خصوصیتوں کی مظہر ہوتی ہے۔

اسپین کی اموی خلافت گیارہویں صدی میں زوال پذیر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اسپین کی نصرانی فتح جدید کا دروازہ بھی کھل گیا۔ ہسپانوی مورخ اصل میں جنگ کوفادونغا (Covadonga) ہی کو نصرانی فتح جدید کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ یہ لڑائی ۷۱۸ء میں لڑی گئی تھی اور اس میں آسٹریا کے ایک سردار پلے یو (Pelayo) نے مسلمانوں کی یلغار کو روکا تھا۔ اگر مسلمانوں نے آٹھویں صدی میں شمالی کوہستانی علاقہ کی نصرانی سلطنت کے بچے کھچے آثار مٹا دیے ہوتے تو اسپین کی بعد کی تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی۔ پہلے پہل تو شمالی نصرانی سرداروں کی باہمی آویزشوں نے اس بازیابی کی راہ میں مشکلیں پیدا کیں، لیکن آگے چل کر ۱۲۳۰ء میں قشتالیہ اور لیون میں پکا اتحاد ہو گیا۔ اس اتحاد نے عمل بازیابی میں بڑی تیزی پیدا کر دی۔ تیرہویں صدی کے وسط میں پورے ملک میں غرناطہ کو چھوڑ کر نصرانیوں کی فتح جدید عملاً مکمل ہو چکی تھی۔ طلیطلہ ۱۰۸۵ء میں فتح کر لیا گیا۔ ۱۲۳۶ء میں قرطبہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اشبیلیہ نے ۱۲۴۸ء میں اپنا علم سرنگوں کر دیا۔

تیرہویں صدی کے وسط کے بعد سے دو زبردست اقدام کیے گئے۔ یعنی پورے اسپین کو نصرانی بنانا اور اس کو متحد کرنا۔ مگر پورے ملک کو نصرانی بنانے کا کام اسپین کو نئے سرے سے فتح کرنے اور اُسے متحد کرنے سے بالکل ہی مختلف قسم کا تھا۔ جزیرہ نمائے اسپین کے صرف ان ہی علاقوں میں اسلام کی جڑیں پھیل سکیں جہاں کسی زمانے میں قدیم سامی اور قرطاجنی

تہذیبوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا تھا۔ یہی صورت جزیرۂ صقلیہ میں بھی پیش آئی۔ یہ جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس میں کافی معنویت پوشیدہ ہے۔ مجموعی حیثیت سے اسلام اور نصرانیت کے درمیان اختلاف اور خصومت کا جو خط کھینچا گیا تھا وہ اس خط کے عین مطابق تھا جو قدیم قرطاجنی اور یونانی، رومی تہذیبوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی تک پورے اسپین میں بہت سے مسلمان یا تو زیر ہو کر یا معاہدے کی رو سے نصرانیوں کی رعیت تو بن چکے تھے لیکن کسی نہ کسی طرح اپنے دین اور اپنی شریعت پر قائم تھے۔ ایسے مسلمانوں کو مُدَجنین (Mudegar) کا لقب دیا گیا تھا۔ Mudeger ایک عربی لفظ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی "ملکی حقوق یا فتنہ" کے ہیں لیکن اب بہت سے مدجنین عربی زبان بھولتے، اسپین کی رومانسی بولی اختیار کرتے اور کم و بیش نصرانیوں میں ضم ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اسپین کے آخری اتحاد کے اقدام کی رفتار سست لیکن یقینی تھی۔ اس زمانے میں نصرانی عملداری صرف دو سلطنتوں یعنی قشتالیہ اور ارغون پر مشتمل تھی۔ سنہ ۱۴۶۹ء میں ارغون کے حکمران فرڈیننڈ (Ferdinand) نے قشتالیہ کی ملکہ اسابیلہ (Isabella) سے شادی کر لی۔ اس رشتۂ ازدواج نے دونوں سلطنتوں کو دائمی طور پر متحد کر دیا۔ اس اتحاد نے اسپین کے اسلامی اقتدار پر گویا قیامت ڈھا دی۔ بنی نصر کے آخری سلاطین کسی طرح اس کے اہل نہ تھے کہ بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کر سکتے۔ یہ آخری سلاطین گھریلو جھگڑوں میں کچھ ایسے اُلجھے کہ ان کا موقف اور بھی بدتر ہو گیا۔ سنہ ۱۲۳۲ء سے سنہ ۱۴۹۲ء تک بنی نصر میں کوئی بائیس سلاطین ہوئے۔ ان میں سے چھ سلاطین تو دو بار اور ایک سلطان تین بار تخت نشین ہوا۔ ۲۔ جنوری سنہ ۱۴۹۲ء کو (اور اسی تاریخ سے امریکہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے) نصرانی فوجیں ایک طویل اور جاں توڑ محاصرہ کے بعد شہر غرناطہ میں داخل ہو گئیں اور "صلیب نے ہلال کو گہنا دیا"۔

"دی کیتھولک مجسٹیز" فرڈیننڈ اور اسابیلہ نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدۂ صلح کی جو شرطیں طے کی تھیں، ان پر وہ قائم نہیں رہے۔ سنہ ۱۴۹۹ء میں ملکہ اسابیلہ کے خاص پادری

Cordinal Ximenez de Cisveros کی قیادت میں جبرًا مسلمانوں کا مذہب تبدیل کرنے کی ایک باقاعدہ مہم شروع کی گئی۔ پہلے پہل تو اس پادری نے اسلام سے متعلق تمام عربی کتابوں کو مٹانے کے لیے انہیں جلانا شروع کیا۔ غرناطہ میں عربی مخطوطے جمع کر کے جلائے گئے۔ اس کے بعد مذہبی عدالت احتساب قائم کی گئی اور بے روک ٹوک اپنا کام کرنے لگی۔ تسخیر غرناطہ کے بعد جو مسلمان ملک میں باقی رہ گئے تھے ان کو اب "مورسکو" (Morisco) کہا جانے لگا۔ یہ ایک اسپینی لفظ ہے۔ اس کے معنی "چھوٹے مور" کے ہیں۔ مغربی افریقہ کو رومی ماؤری ٹانیا (Mauretania) اور اس کے باشندوں کو "ماؤری" (Mauri) کہتے تھے۔ غالبًا یہ ایک فینیقی الاصل لفظ ہے جس کے معنی مغربی کے ہیں۔ اسی لفظ سے اسپین کے عرب مسلمانوں کے لیے ہسپانوی زبان میں "مورو" (Moro) اور انگریزی زبان میں "مور" (Moor) کا لفظ وضع ہوا۔ بربر اصلی "مور" تھے لیکن اسپین اور شمالی افریقہ کے تمام مسلمانوں پر بھی "مور" کی اصطلاح کا اطلاق کیا جانے لگا۔ جزائر فلپائن کے پچاس ہزار مسلمان آج بھی "مور" یا "مورو" (Moros) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان جزیروں کو میگے لان (Magellan) نامی ایک اسپینی نے ۱۵۲۱ء میں دریافت کیا تھا۔ اس لیے اسپینیوں نے یہاں کے مسلمانوں کو بھی مورسکو کہنا شروع کر دیا۔ اصل میں مورسکو کی اصطلاح کا اطلاق اسپین کے ایسے باشندوں پر بھی کیا جاتا تھا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا

اسپین کے مسلمان ایک رومانسی بولی بولتے تھے لیکن اس کے لیے بھی وہ عربی رسم خط استعمال کرتے تھے۔ اکثر نہ سہی لیکن بہت سے مورسکو حقیقت میں ہسپانوی نسل سے تھے۔ اب ان سب کو یہ "یاد دلایا" جا رہا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد نصرانی تھے۔ اس لیے انہیں بھی نصرانی مذہب قبول کر لینا چاہیے یا پھر اسلام پر قائم رہنے کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے مُدجنین بھی مورسکو کے زمرہ میں داخل کر دیے گئے تھے اور ان میں سے بہت سے پوشیدہ طور پر مسلمان ہو گئے تھے۔ یعنی ظاہر میں تو یہ لوگ اپنے آپ کو نصرانی بتاتے تھے، لیکن اندرونی طور

پر دینِ اسلام پر قائم تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنی شادیاں ظاہر میں نصرانی رسم و رواج کے مطابق کر لیا کرتے تھے مگر گھر آ کر شادی کے اسلامی رسوم ادا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو صرف دکھاوے کی خاطر اپنا نصرانی نام رکھ لیتے تھے اور گھریلو استعمال کے لیے ان کا ایک عربی نام بھی ہوتا تھا۔ ۱۵۰۱ء میں ایک شاہی فرمان نافذ ہوا کہ قسطالیہ اور لیون کے مسلمان باشندے یا تو نصرانیت قبول کر لیں یا اسپین سے نکل جائیں۔ مگر اس فرمان پر سختی کے ساتھ عمل نہیں کرایا گیا۔ ۱۵۲۶ء میں ارغون کے مسلمانوں کے سامنے بھی اسی قسم کی متبادل شرطیں پیش کی گئیں۔ ۱۵۵۶ء میں فلپ دوم نے ایک قانون کے ذریعہ ملک کے رہے سہے مسلمانوں کے لیے یہ قانون بنایا کہ وہ اپنی زبان، اپنی عبادت اپنے عقائد اور اپنی مخصوص طرزِ زندگی سے فوراً دست کش ہو جائیں۔ اس بادشاہ نے یہ حکم بھی نافذ کیا تھا کہ اسپین کے تمام غسل خانوں کو ڈھا دیا جائے تاکہ اس سرزمین پر کفر و الحاد کی کوئی نشانی باقی نہ رہنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غرناطہ کے مسلمانوں نے بغاوت کر دی یہ بغاوت آس پاس کی پہاڑیوں تک پھیل گئی۔ یہ اپنی نوعیت کی دوسری شورش تھی۔ لیکن یہ شورش دبا دی گئی۔ ۱۶۰۹ء میں بادشاہ فلپ سوم نے مسلمانوں کو اسپین سے خارج کرنے سے متعلق آخری حکم نامے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ اس کے بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ سرزمین اسپین سے بہت بڑی گنتی میں عملاً تمام مسلمان زبردستی نکال دیے گئے۔ کہتے ہیں کوئی پانچ لاکھ مسلمانوں کو اس نیرنگی تقدیر کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ لوگ افریقہ کے ساحلوں یا دوسرے دور دراز اسلامی ملکوں کو جانے والے جہازوں پر سوار ہونے پر مجبور کر دیے گئے۔ مراکش کے بحری قزاقوں کی بھرتی زیادہ تر ان ہی غریب الوطن "مرسکو" مسلمانوں کے جتھوں سے ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا ہے کہ زوالِ غرناطہ سے لے کر سترہویں صدی کے پہلے دہے کی درمیانی مدت میں تقریباً تیس لاکھ مسلمان یا تو جلاوطن کر دیے گئے یا انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح اسپین کی حد تک مسلمان اس ملک سے رخصت ہو گئے۔ اگرچہ عربی

ثقافت کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کرلی گئی ہے کہ جس جگہ اس نے قدم رکھا وہاں ہمیشہ کے لیے اس کے قدم جم گئے۔ لیکن "موروں" نے اس قاعدۂ کلیہ میں ایک استثناء پیدا کر دیا۔ "موروں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ کچھ عرصے تک نصرانی اسپین چاند کی طرح مستعار روشنی کے بل بوتے پر چمکتا رہا۔ دو دنوں کی چاندنی ختم ہوئی اور پھر اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں اسپین آج تک پڑا ٹھوکریں کھاتا ہے۔"

اسپین میں مسلمانوں کی جتنی بھی مذہبی یادگاریں تھیں وہ تمام کی تمام تباہ و برباد کر دی گئیں۔ البتہ ایک مسجد قرطبہ باقی رہ گئی۔ یہ مسجد مسلمانوں کی اولین اور عظیم ترین یادگاروں میں سے ایک یادگار ہے۔ اس کی بنیاد ایک نصرانی کلیسا کے محل وقوع پر ۷۸۶ء میں رکھی گئی۔ یہ کلیسا خود بھی ایک رومی معبد پر بنایا گیا تھا۔ مسجد کے وسطی دالان اور اس کے چوپہل مینار کی تعمیر ۷۹۳ء میں مکمل ہوئی۔ اسپینی مینار افریقی میناروں کے نمونے پر بنائے جاتے تھے! اور افریقہ کے مینار شامی میناروں کی نقل تھے۔ جامع قرطبہ کی چھت ۱۲۹۳ ستونوں پر قائم کی گئی تھی۔ پیتل کے چراغوں سے ساری مسجد روشن ہوتی تھی۔ یہ چراغ نصرانی کلیسا کے گھنٹوں کی دھات سے بنائے گئے تھے۔ شیشے کے ایک ایک جھاڑ — ثریا — میں ایک ایک ہزار بتیاں لگائی گئی تھیں۔ اور سب سے چھوٹے جھاڑ میں کم سے کم بارہ بتیاں ہوتی تھیں۔ مسجد کی تزئین کے لیے بازنطینی صناع مقرر کیے گئے تھے۔ جیسے کہ شام کی مسجد امیہ کی تزئین کے لیے بازنطینی صناعوں سے کام لیا گیا تھا۔ اس مسجد کی تعمیر پر اکیلے اس کے بانی ہی نے اسی ہزار اشرفیاں صرف کی تھیں۔ یہ اشرفیاں گوتھوں سے مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھیں۔ اس کے بعد ۱۰۰۰ء تک یعنی حاجب منصور (۹۷۷ء-۱۰۰۲ء) کے عہد تک برابر مسلمان اس مسجد کی تعمیر و ترمیم میں حصہ لیتے رہے۔ اور آج یہ مشہور زمانہ یادگار بی بی مریم کا ایک کلیسا (Cathedral to the Virgin of the Assumption) بنی ہوئی ہے۔

اسپین کے مسلمانوں کی غیر مذہبی یادگاروں میں سے اس وقت جو یادگاریں باقی رہ گئی ہیں ان میں اشبیلیہ کا "الکزر" (Alcazar) جو عربی لفظ القصر کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اور غرناطہ کا قصر الحمراء، دونوں سب سے زیادہ شاندار اور بڑی پرشکوہ عمارتیں ہیں۔ ان عمارتوں کے نقش و نگار، تزئین و آرائش اور صناعی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اشبیلیہ کے القصر کا قدیم ترین حصہ سنہ ۱۱۹۹ء سے لے کر سنہ ۱۲۰۰ء تک کسی موحد عامل کے ایماء سے طلیطلہ کے ایک تعمیر کار نے بنایا تھا۔ موحدین کا تعلق ایک بربر خاندان سے تھا اور اس نے مرابطین خاندان کے بعد اسپین پر حکومت کی ہے۔ سنہ ۱۳۵۳ء میں القصر کو مدجنین تعمیر کاروں نے شاہ پیٹر ظالم (Peter the Cruel) کے ایماء سے اسلامی طرز پر دوبارہ تعمیر کیا تھا، اور یہ محل چند سال پہلے تک اسپین کے شاہی خاندان کی رہائش گاہ بنا رہا۔ قرطبہ، طلیطلہ اور اسپین کے دوسرے شہروں کے قصروں میں اشبیلیہ کا القصر سب سے زیادہ مشہور قصر ہے۔ طلیطلہ کے قصر کو اسپین کی حالیہ خانہ جنگی میں کافی نقصان پہنچا ہے۔

اسپینی مسلمانوں کی آرائشی طرز قصر الحمراء میں حد کمال کو پہنچ گئی تھی۔ غرناطہ کے اس قلعہ کو پچی کاری، قلمی تزئین، کاشی کاری اور کتبات کی بے حساب تزئین و آرائش کے ساتھ ایک نہایت ہی وسیع اور عظیم الشان پیمانے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بنی نصر کے ایک سلطان محمد الاول الغالب نے سنہ ۱۲۴۸ء میں یہ محل بنانا شروع کیا تھا، لیکن چودھویں صدی کے وسط میں جا کر کہیں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔

گھوڑ نعلی کمانیں جو مغربی مسلمانوں کی اہم ترین تعمیری خصوصیت مانی گئی ہے، مشرق قریب کی قبل اسلام عمارتوں میں بھی پائی گئی ہیں۔ اسی قسم کی لیکن مدور گھوڑ نعلی کمانیں دمشق کی مسجد امیہ میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ یہ دوسری قسم کی کمانیں اگرچہ مغرب میں "موری کمانوں" کے نام سے مشہور ہو گئیں لیکن اصل میں یہ کمانیں اسلامی فتح سے پہلے ہی اسپین میں موجود تھیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسپینی اور خاص کر قرطبی مسلمانوں

ہی نے ان کمانوں کی ترکیبی اور تزئینی استعمال کے امکانات کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی عمارتوں میں انہیں کثرت سے استعمال کیا۔ اسلامی قرطبہ کا ایک اچھوتا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لداؤ چھتوں کی وہ طرز ایجاد کی جس میں چھتوں کو متقاطع کمانوں اور نمایاں متقاطع کڑیوں پر قائم کیا جاتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی جو دوسری تعمیری خصوصیات قرطبہ میں فروغ پاتی رہیں انہیں مستعربین نے طلیطلہ اور جزیرہ نمائے اسپین کے دوسرے شمالی مرکزوں میں منتقل کیا۔ یہاں نصرانی اور اسلامی روایتوں کے امتزاج سے ایک مخصوص طرز تعمیر کا ظہور ہوا۔ اس طرز تعمیر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترتیب اور تناسب کے ساتھ گھڑ نعلی کمانیں اور لداؤ چھتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مُدجنین فن کاروں کے ہاتھوں اس ملی جلی تعمیر کاری کو بڑا حسن اور بڑا کمال نصیب ہوا اور یہی اسپین کا قومی طرزِ تعمیر بن گیا۔

غرناطہ کی تسخیر کے بعد ایک عرصہ تک "موری" رقاص اور مغنی اسپین اور پرتگال کے دیسی باشندوں کے لیے لطف و سرور کا سامان فراہم کرتے رہے۔ مشہور عالم ری بیرا (Ribera) کی تازہ ترین تحقیق سے یہ واضح ہے کہ تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں کی اسپین بلکہ پورے جنوب مغربی یورپ کی عام پسند موسیقی اس علاقے کی عشقیہ شاعری اور تاریخی رومانوں کی طرح پہلے اندلسی ماخذوں سے پھر عربی زبان کے ذریعہ ایرانی، بازنطینی اور یونانی ماخذوں سے حاصل کی گئی تھی جس طرح فلسفہ، ریاضیات اور طب کے علوم یونان و رومہ سے سفر کرتے ہوئے بازنطینیہ پہنچے اور یہاں سے ایران اور بغداد آئے اور پھر یہاں سے اسپین میں نمودار ہوئے، اور یہاں سے پورے یورپ میں پھیلے، وہی حال موسیقی کے بہت سے نظریوں اور عملی طریقوں کا رہا ہے۔

یورپ میں اسپین کے بعد جزیرۂ صقلیہ (سسلی) ہی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمانوں نے مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے تھے۔ مسلمانوں نے صقلیہ پر ۶۵۲ء میں اکا دکا حملے شروع کر دیے تھے، لیکن اس کی فتح ۸۲۷ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد یہ جزیرہ

مسلسل (۱۸۹) سال تک سرکش عرب سرداروں کے زیر نگیں رہا اور کبھی اس کا ایک حصّہ اور کبھی پورا جزیرہ دنیائے عرب کا ایک صوبہ بنا رہا۔ اس کا صدر مقام بُلرم (Palermo) تھا۔

جس طرح مسلمانوں نے شمال مغربی یورپ پر یورشیں کرتے وقت اسپین کو اپنا پہلا مورچہ قرار دیا تھا، اسی طرح جب انھوں نے اطالیہ پر حملے شروع کیے تو جزیرۂ صقلیہ ہی کو اپنا مورچہ بنایا۔ تونس کے اغالبی خاندان کا ایک شخص امیر ابراہیم ثانی جو جزیرہ صقلیہ کا حکمران تھا، اپنی موت سے کچھ ہی دنوں پہلے ۹۰۲ء میں آبنائے کے اس پار اطالیہ کے دامن میں قِلوریہ (Calabria) تک بڑھ آیا تھا لیکن ابراہیم ثانی پہلا عرب حملہ آور نہیں جس کو اطالیہ کی سرزمین پر قدم رکھنے کا امتیاز حاصل ہو۔ کیونکہ بلرم (پالرمو) کی فتح کے تھوڑے ہی عرصے بعد شمالی افریقہ کے دوسرے اغالبی فوجی سردار جنوبی اطالیہ کے حریف لمبارڈون کے باہمی جھگڑوں میں دخیل ہو گئے تھے۔ یہ لمبارڈ جنوبی اطالیہ کے نچلے علاقے پر ابھی تک بازنطینی شہنشاہ کے تحت فرمانروائی کر رہے تھے۔ ۸۳۸ء میں جب نیپلز والوں نے عربوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا تو کوہ وسویس کی گھاٹیاں مسلمانوں کے نعرۂ جہاد سے گونج اُٹھیں۔ اس کے تقریباً چار سال بعد اڈریاٹک (Adreatic) میں مسلمانوں نے باری (Bari) پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ مقام آنے والے تیس سالوں تک اسلامی فوجوں کا ایک اہم مرکز بنا رہا۔ قریب قریب اسی زمانے میں فاتح مسلمان شہر وینس میں در آئے اور ۸۴۶ء میں خود شہر رومہ کو بھی ان عربی فوجوں نے دھمکی دینی شروع کر دی تھی جو اوسٹیا (Ostia) کے ساحل پر پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ اگرچہ یہ فوجیں روما کے "لازوال شہر" کی فصیلوں کے اندر گھس جانے میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن اُنھوں نے سینٹ پیٹر کے کنیسہ (جو پاپائے روم کے قصر وٹیکن کے پہلو میں کھڑا تھا) اور سینٹ پال کے کنیسہ کو (جو شہر پناہ کے باہر واقع تھا) لوٹا اور پادریوں کی قبریں اُکھیڑ کر پھینک دیں۔ اس واقعہ کے

تین سال بعد ایک دوسرا اسلامی بیڑا اوسٹیا پہنچا لیکن اطالوی بیڑے اور سمندر کے طوفان نے مل کر مسلمانوں کے اس بیڑے کو تباہ کر ڈالا۔ مشہور مصور رافیل (Raphael) کی ایک تصویر میں یہ بحری لڑائی اور روما کی نجات بڑی خوبی کے ساتھ دکھائی گئی ہے لیکن اس تباہی کے باوجود اطالیہ پر مسلمانوں کا قبضہ اس قدر مضبوط و مستحکم ہو چکا تھا کہ پاپائے روم جان ہشتم (۸۷۲ء۔۸۸۲ء) کو اپنی سلامتی اسی میں نظر آئی کہ وہ مسلمانوں کو خراج ادا کرے۔ چنانچہ دو سال تک وہ برابر انہیں خراج ادا کرتا رہا۔

اغالبی سرداروں نے اپنے حملے صرف اطالیہ کے ساحل تک ہی محدود نہیں رکھے تھے ۸۶۹ء میں یہ مالٹا پر قابض ہو گئے۔ دسویں صدی میں اطالیہ اور اسپین سے بحری قزاقانہ حملے کوہ آلپس کے دروں سے گزر کر وسط یورپ تک پھیل گئے تھے۔ آلپس کے پہاڑوں میں سیاحوں کو کئی ایک گڑھیاں اور فصیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے بارے میں مقامی رہبر بیان کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے حملوں کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ کے بعض مقامات کے نام جیسے غالی (Gaby) یا الغابی (Algaby) غالباً عربی ناموں کی باقیات ہیں۔

۸۷۱ء میں نصرانیوں نے باری پر پھر قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے مسلمانوں کے ان حملوں کا خاتمہ ہو گیا جن سے اطالیہ اور وسطی یورپ کو ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا۔ باری میں فوجی سردار اتنے خود مختار ہو گئے تھے کہ وہ بلرم (پالرمو) کے امیر سے بے نیاز ہو کر اپنی "سلطانی" کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔ ۸۸۰ء میں بازنطینی شہنشاہ باسیلیوس اول (Basil) نے طارنت (Taranto) کی اہم گڑھی مسلمانوں سے چھین لی اور چند سال بعد قلوریہ (کیلیبریا) کے باقی عربوں کو بھی وہاں سے نکال دیا۔ اس طرح اس اسلامی حملکت کے پھیلاؤ کی آخری منزل آ گئی جس کی ابتدا ڈھائی صدی پہلے عرب کے دور دراز ملک سے ہوئی تھی۔ وہ بے شمار "اسلامی برج" (Saracen Towers) جن کے اوپر سے صقلیہ یا افریقہ کے

عربی بحری بیڑوں کی آمد کا اعلان کیا جاتا تھا آج بھی جنوبی نیپلز کے بے نظیر ساحل کی خوبصورتی اور حسن میں چار چاند لگاتے نظر آتے ہیں۔

۱۰۶۰ء میں تانکرودی ہوتفیل کے بیٹے کونٹ روجر (Count Roger, son of Tancred de Hanleville) نے مسینا پر قبضہ کرلیا اور اسی سال سے جزیرہ صقلیہ پر نارمن فتح کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نارمن فتح تسخیر پالرمو (۱۰۷۲ء) اور تسخیر سرقوسہ (Syracuse) سے اپنی منتہا کو پہنچ گئی اور ۱۰۹۱ء میں اس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ۱۰۹۰ء میں روجر نے مالٹا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح نارمنوں کے لیے۔ جن کے پاس براعظم یورپ میں پہلے ہی سے ایک طاقتور سلطنت موجود تھی۔ نو مفتوح علاقوں میں اب کسی طرح کا خطرہ باقی نہ رہا۔

جزیرہ صقلیہ کو نارمنوں کے دورِ حکومت میں ایک دلچسپ نصرانی اسلامی ثقافت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اس جزیرہ پر عربوں کے پورے دورِ حکومت میں مشرقی تمدن کا ایک ایسا سیلاب اُمنڈتا رہا جو ماضی کے تمدن کی باقیات سے معمور تھا۔ پھر اس سیلاب نے نارمنوں کے دور حکومت میں یونان وروما کی ثقافت کی بیش قرار باقیات کے ساتھ گھل مل کر ایک واضح شکل اختیار کرلی اور نارمن ثقافت کو اس کی نمایاں خصوصیات سے مالامال کیا۔ اس وقت تک عرب لڑائیوں اور آپس کے جھگڑوں میں کچھ ایسے الجھے ہوئے تھے کہ انھیں زمانۂ امن کے فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے کا بہت کم موقع مل سکا تھا لیکن اب ان کی تخلیقی اور اختراعی صلاحیتیں عرب نارمن آرٹ کے ایک طوفان کی صورت میں منظر عام پر آنے لگیں۔

اگرچہ خود روجر اول ایک جاہل نصرانی تھا لیکن اس نے اپنی پیدل فوج بڑی حد تک مسلمانوں ہی سے تشکیل دی تھی۔ اس نے عربی علوم کی سرپرستی کی، اور اپنے دربار میں مشرقی مفکروں ہیئت دانوں اور طبیبوں کو جمع کیا۔ اس کے دورِ حکومت میں

غیرنصرانیوں کو بھی پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ پالرمو میں اس کا دربار مغربی سے زیادہ مشرقی دربار نظر آتا تھا۔ روجر کے بعد ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جزیرۂ صقلیہ ایک ایسی بے نظیر نصرانی سلطنت کا منظر پیش کرتا رہا جس کے بعض اہم ترین عہدوں پر مسلمان فائز تھے

کاغذ پر لکھی ہوئی یورپ کی قدیم دستاویز ایک فرمان ہے۔ اس فرمان کو روجر اول کی ملکہ نے یونانی اور عربی زبانوں میں غالباً ۱۱۰۹ء میں جاری کرایا تھا۔ بہت ممکن ہے فرمان کا یہ کاغذ صقلیہ میں نہ بنا ہوگا بلکہ مشرق سے صقلیہ میں عربوں نے درآمد کیا تھا۔

صقلیہ کے عربوں کی عجیب و غریب اور دلکش پیادہ فوج کی بھرتی روجر نے شروع کی تھی۔ یہ فوج روجر کے جانشین اور اس کے بیٹے روجر دوم (۱۱۳۰-۱۱۵۴) اور فریڈرک دوم کے عہد میں بڑی ترقی کر گئی تھی۔ روجر دوم مسلمانوں کی سی پوشاک پہنا کرتا تھا۔ اسی لیے اس کو بعض نقاد "نیم بے دین بادشاہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس بادشاہ کی شاہی عبا عربی نقش ونگار سے مزین ہوتی تھی۔ اس بادشاہ کے پوتے کے عہدِ حکومت میں ایک اندلسی سیاح ابن جبیر نے پالرمو کی نصرانی عورتوں کو اسلامی لباس پہنتے دیکھا ہے۔

روجر دوم کے دربار کا سب سے بڑا رتن ادریسی تھا۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا ممتاز ترین جغرافیہ داں اور نقشہ کش گزرا ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن محمد الادریسی کے والدین ہسپانوی عرب تھے۔ ادریسی ۱۱۰۰ء میں بمقام سبتہ پیدا ہوا اور ۱۱۶۶ء میں انتقال کر گیا۔ اس نے اپنی زندگی کا زبردست کارنامہ پالرمو میں روجر دوم کی سرپرستی میں انجام دیا۔ اس نے روجر کے نام پر جو رسالہ لکھا ہے وہ نہ صرف بطلیموس اور مسعودی کی تصانیف کا ہم پلہ ہے بلکہ یہ ان ناظروں کے اصلی بیانوں پر مبنی ہے جو مختلف ملکوں اور شہروں کو جغرافیائی معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے

ادریسی نے اپنے جمع کیے ہوئے مواد کا جو تنقیدی موازنہ کیا ہے اس سے ادریسی کی غیر معمولی وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے سوا اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ادریسی میں زمین کی گولائی جیسے بنیادی حقائق سمجھنے کی بھی خاصی صلاحیت موجود تھی۔ ادریسی نے یہ بھی بتایا ہے

که دریائے نیل کا منبع (جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں
دریافت ہوا ہے) کسی خط استوائی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس عظیم الشان تصنیف کے
سوا ادریسی نے اپنے نارمن مربی کے لیے ایک نقرئی کرۂ ارض اور دنیا کا ایک مدوّر نقشہ
بھی تیار کیا تھا۔ یہ نقشہ بھی چاندی کا تھا۔" دو نصرانی سلاطین صقلیہ" میں دوسرا "سلطان"
روجر دوم کا پوتا فریڈرک دوم ہے۔ یہ بادشاہ صقلیہ کے علاوہ جرمنی کا بھی حکمراں تھا۔ اس نے سنہ ۱۲۲۰ء
میں مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور سنہ ۱۲۲۵ء میں بیت المقدس کی وارث
شہزادی اسابیلہ سے شادی کر لی۔ اس طرح فریڈرک بیت المقدس کا بھی حکمراں بن گیا۔ اس
زمانے کی پوری نصرانی دنیا میں سب سے زیادہ مقتدر اور سب سے زیادہ مہذب ہستی
شہنشاہ فریڈرک کی ذات تھی۔ شادی کے تین سال بعد اس نے ایک صلیبی لڑائی شروع کی
اس جنگ کے دوران میں فریڈرک اسلامی تصورات سے اور بھی متاثر ہوا۔

شہنشاہ فریڈرک نے اپنے محل میں خواصیں بھی رکھی تھیں۔ اس کی خانگی اور سرکاری
زندگی نیم مشرقی تھی۔ اس کا دربار شام اور بغداد کے دراز ریش اور ڈھیلی ڈھالی عبا پہننے والے
فلسفیوں، مشرق کی نوخیز رقاصاؤں اور مشرق و مغرب کے یہودیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس
کو دنیائے اسلام سے بڑی دلچسپی تھی اور خاص کر سلطان مصر کے ساتھ اس نے سیاسی
اور تجارتی تعلقات قائم کیے تھے۔ آفتاب کی حرارت کے ذریعہ اس نے شترمرغ کے انڈوں
سے بچے نکالنے کا تجربہ کرنے کی خاطر مصر سے ماہروں کو بلایا تھا۔ اس نے شام سے ماہر
شاہین بازوں کو طلب کر کے بازوں کی تربیت کا بذات خود مشاہدہ کیا اور بازوں کی آنکھوں
پر پٹی باندھ کر شخصی طور پر اس بات کا اطمینان کرنے کی کوشش کی کہ یہ پرندے اپنی قوتِ
شامہ کے ذریعہ اپنی غذا کا پتہ چلا سکتے ہیں یا نہیں۔ تھیوڈر (Theodore) نامی ایک
یعقوبی نصرانی اس کے دربار کا ترجمان منجم گزرا ہے۔ فریڈرک نے اس سے عربی زبان سے
شاہین بازی کے ایک رسالہ کا ترجمہ کرایا۔ فریڈرک نے شاہین بازی پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ اصل

ہیں اسی ترجمہ اور ایک فارسی ترجمہ پر مبنی ہے۔ جدید علم مطالعۂ قدرت کی سب سے پہلی کتاب یہی ہے۔ درباری منجم کی حیثیت سے تھیوڈر کا جانشین مائیکل اسکاٹ (Michael Scot) ہوا۔ یہ شخص ۱۲۲۳ھ سے لے کر ۱۲۲۳ء تک صقلیہ اور اطالیہ میں مسلم اسپین کے علم وفضل کی نمائندگی کرتا رہا۔ اسکاٹ نے شہنشاہ فریڈرک کے لیے ارسطو کی نباتیاتی اور حیوانیاتی تصانیف اور ابن سینا کی شرح کا عربی سے لاطینی زبان میں ایک خلاصہ لکھ کر اس کو شہنشاہ کے نام معنون کیا۔ تلاش وتحقیق اور تجربہ کا ذوق وشوق فریڈرک کے دربار کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور اسی سے اطالیہ کے نشأۃ ثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

لیکن شہنشاہ فریڈرک کا سب سے بڑا اور بے نظیر کارنامہ جامعۂ نیپلز کی تاسیس ہے۔ یہ جامعہ ۱۲۲۴ء میں قائم ہوئی اور برّ اعظم یورپ کی یہی وہ سب سے پہلی جامعہ ہے جو ایک واضح شاہی منشور کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ اس جامعہ میں فریڈرک نے عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرایا تھا۔ شہنشاہ فریڈرک نے ارسطاطالیس اور ابن رشد کی جن تصانیف کے ترجمے کرائے تھے وہ بھی اس جامعہ کے نصابِ تعلیم میں داخل کرلی گئیں اور ان ترجموں کے نسخے پیرس اور بلوگنا (Bologna) کی جامعات کو بھی بھیجے گئے تھے۔ جامعہ نیپلز کے طلبا میں تھامس آلیوناس (Thomas Aquinos) کا بھی شمار ہوتا ہے

چودہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں میں یورپ کی بہت سی جامعات میں عربی علوم وفنون سیکھے جانے لگے تھے۔ ان جامعات میں آکسفورڈ اور پیرس کی جامعات بھی شامل ہیں۔ لیکن ان علوم وفنون کے سیکھنے کا بنیادی مقصد کچھ اور ہی تھا۔ ان علوم کی تعلیم دے کر یہ جامعات اسلامی ملکوں کے لیے نصرانی مبلغ تیار کررہی تھیں۔

جزیرۂ صقلیہ قدیم ثقافت اور قرونِ وسطیٰ کی ثقافت کے دھاروں کا سنگم بن گیا تھا۔ اور یہ مقام ان دونوں ثقافتوں کے علم وفضل کی منتقلی کے باب میں ایک نہایت ہی موزوں ذریعہ

ثابت ہوا۔ اس جزیرہ کی آبادی میں یونانیوں کا ایک طبقہ بھی تھا۔ یہ یونانی زبان بولتا تھا
ایک مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ یہ عربی زبان بولتا تھا۔ علماء کی ایک جماعت تھی۔ یہ لاطینی زبان جانتی تھی
یہ تینوں زبانیں شہر پالرمو میں (جہاں بہت سے زبانیں بولی جاتی تھیں) رائج ہونے کے سوا
سرکاری دفتروں اور شاہی فرمانوں میں بھی روزمرہ استعمال کی جاتی تھیں۔

صقلیہ کے نارمن بادشاہوں کے قبضہ میں صرف صقلیہ ہی نہ تھا بلکہ وہ جنوبی اطالیہ
پر بھی قابض و متصرف تھے۔ اسی لیے انہوں نے اسلامی ثقافت کے مختلف عناصر کو جزیرہ نما
اور وسطی یورپ میں منتقل کرنے کے لیے گویا ایک پل کا کام دیا۔ دسویں صدی کے وسط میں
آلپس کے شمالی علاقوں میں عربی علوم کی اشاعت و ترویج نمایاں ہو چلی تھی۔ ہو سکتا ہے
کہ دانتے (Dante) نے دوسری دنیا سے متعلق اپنے تصورات کسی خاص عربی کتاب
کی بجائے یورپ ہی کی مقبول عام روایات و اساطیر سے حاصل کیے ہوں، لیکن اس سے
کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان اساطیر و روایات کا سرچشمہ حقیقت میں مشرق کی سرزمین
ہی میں تھا۔ یورپ میں مشرقی ادب اور سائنس کی طرح مشرقی فنون بھی کئی ذریعوں سے
منتقل ہوئے ہیں۔ پلاٹائین کے کلیسا (Palatine Chapel) کی پچی کاری اور اس کے
کتبات سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ صقلیہ اور جزیرہ نما کے مسلم صناع اور فن کاران
علاقوں پر نصرانی تسلّط کے بعد بھی عرصہ دراز تک پھلتے پھولتے رہے۔ پالرمو (بَلَرم) کے
شاہی محل میں مسلمان حکمرانوں نے پارچہ بافی کا ایک مشہور کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس میں
یورپ کے بادشاہوں کی خلعتیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ یہ خلعتیں عربی تحریروں سے مزیّن
ہوتی تھیں۔ کسی زمانے میں یورپ میں مشرقی کپڑوں کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ جب تک
کوئی یورپی کم سے کم ایک مشرقی پوشاک نہ پہن لیتا اس کو اپنی خوش پوشی کا کبھی اطمینان
نہ ہوتا تھا۔

پندرہویں صدی کے دوران میں جب وینس کا متمول شہر آرٹ میں اسلامی طرز و

کو بڑی سرگرمی کے ساتھ اختیار کرتا اور پھیلتا جا رہا تھا، اس وقت اطالوی کارخانوں میں جلد سازوں نے مشرقی نمونوں پر کتابوں کی جلدیں بنانی شروع کیں۔ چنانچہ اس زمانے کی نصرانی کتابیں عربی جلد سازی کی نزاکتوں اور نمایاں خصوصیتوں (ان میں جلد کا وہ لٹکتا ٹکڑا بھی شامل ہے جو کتاب سے اس کے اگلے کناروں کو محفوظ رکھنے کے لیے لپیٹ دیا جاتا ہے) سے مزین نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اطالیہ کے بہت سے شہروں میں مشرقی فن کاروں سے چرمی منبت کاری اور نقش نگاری کے جدید طریقے بھی سیکھے جا رہے تھے۔ اس کے سوا شہر وینس ایک اور عربی صنعت یعنی سونے چاندی یا سُرخ تانبے کے ساتھ پیتل کی مرصع کاری کا بھی مرکز بن گیا تھا۔ صقلیہ نے اسلامی ثقافت کو منتقل کرنے میں اس قدر اہم حصہ ادا کیا ہے کہ اس کو صلیبی لڑائیوں کے دور میں اہمیت کے اعتبار سے اسپین کے بعد کا اور شام سے بلند تر درجہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

اِدھر یورپ سے مسلمانوں کے اقتدار کی آخری نشانیاں مٹتی جاتی تھیں تو اُدھر مشرق میں خلافت بغداد اندرونی سازشوں اور خوں ریزیوں کے پھندوں میں پھنس کر آخری سانس لے رہی تھی۔ نویں صدی میں آلِ طولون کو جو عروج حاصل ہوا اس نے نہ صرف آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر دی تھی بلکہ یہ تک بتا دیا تھا کہ یہ واقعات کس کس رنگ میں ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ آل طولون اصل میں ان سرکش اور متمرد ترکوں کی ہیئت سیاسیہ کے اولیں مظہر ہیں جو قلبِ خلافت میں اس وقت تک ایک غیر مربوط عنصر کی صورت میں آباد تھے۔ ان کے بعد ہی ترکوں کے دوسرے مشہور حکمراں خاندان منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگے۔ احمد ابن طولون نے ۸۶۶ء میں اقتدار حاصل کیا تھا خلافت کے کھنڈروں پر جن متعدد ریاستوں کی بنیادیں رکھی گئیں، ان کے بانیوں میں احمد ابن طولون ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان ریاستوں نے مرکزی حکومت

سے اپنا رشتہ یا تو قطعی طور پر توڑ لیا تھا یا یہ خلیفۂ بغداد کے برائے نام زیرِ نگیں تھے۔ احمد نے اپنی ذات سے ایک ایسی مثال قائم کی کہ اس مملکت کا ایک سپاہی اپنے غیر متزلزل عزم اور اپنے مضبوط ہاتھوں اور اپنے غلاموں کی مدد سے کس طرح ایک وسیع اور ناقابل انتظام خلافت سے فوجی اور سیاسی اقتدار حاصل کر سکتا ہے لیکن ابن طولون اور ایسے دوسرے کئی خاندانوں کو جن جن ملکوں پر حکومت کرنے کا موقع ملا ہے وہاں ان خاندانوں کی کوئی قومیت ہی نہ تھی۔ اس لیے ان کو بساط سیاست سے بہت جلد ہٹ جانا پڑا۔ ان خاندانوں کی عام کمزوری یہ بھی تھی کہ ان کی ریاستوں میں ان کے اپنے قبیلوں کی کوئی ایسی تنظیم اور طاقت ور جماعتیں موجود نہ تھیں جو آڑے وقتوں میں ان کے آگے سینہ سپر ہو جائیں۔ خود والیانِ ریاست کی حیثیت ناخواندہ مہمانوں کی سی ہوتی تھی اور یہ لوگ اپنے محافظ دستوں کے سپاہیوں کو بہت سی غیر قوموں سے بھرتی کرنے پر مجبور تھے۔ اور ان ہی دستوں سے فوج کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی حکومت تو صرف وہی ہستیاں چلا سکتی ہیں جو بہت بڑی شخصیت کی مالک ہوں عام طور پر تو یہی ہوتا آیا ہے کہ اِدھر ریاست کے بانی کی آنکھ بند ہوئی اور اس کا زبردست ہاتھ لوگوں کی گردنوں پر سے ہٹا اور اُدھر ملک میں افراتفری کا طوفان بپا ہو گیا۔ ابن طولون نے جس ریاست کی بنیاد رکھی تھی اس کو عباسیوں نے ۹۰۵ء میں ابن طولون کے بیٹے اور اس کے چوتھے جانشین کے ہاتھوں سے پھر چھین لیا۔

ایک اور خاندان جو بنی فاطمہ یا فاطمیین کے نام سے مشہور رہے دو سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جو قابل توجہ ہے۔ یہ شیعوں کی ایک ہی بڑی سلطنت تھی جو ۹۰۹ء میں بمقام تونس عالم وجود میں آئی۔ اصل میں یہ پوری دنیائے اسلام کی اس دینی قیادت کے خلاف ایک کھلی بغاوت تھی جو اب تک بغداد کے عباسیوں کو حاصل رہی تھی۔ بہت جلد یہ ریاست پورے شمالی افریقہ اور مصر تک پھیل گئی۔ فاطمیوں کے عہد میں شہر قاہرہ کو بڑی اہمیت اور

شان وشکوہ حاصل ہوا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اپنی تمام دولت وثروت کے باوجود فاطمی مصر بساطِ سیاست پر زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے۔ ان کی رعایا کی روزی کا مدار نیل کے سیلاب پر تھا اور یہ لوگ آئے دن قحطوں، وباؤں اور محصلوں کی زیادتیوں کا شکار بنے ہوئے تھے ان تمام مصیبتوں کے ساتھ سازشوں اور رشوت لینے کی پرانی عادتوں نے ساز باز کر کے فاطمی اقتدار کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ ۱۱۷۱ء میں یعنی صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں مشہور آفاق سلطان صلاح الدین ایوبی نے فاطمی اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

سیاسی اعتبار سے فاطمیوں نے تاریخ مصر کے ایک عہد جدید کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ مصر کو فراعنہ کے بعد سے پہلی مرتبہ ان ہی فاطمیوں کے عہد میں پوری پوری آزادی نصیب ہوئی اور اسے کامل اقتدار حاصل ہوا۔ ایک طرف اگر یہ اقتدار زندگی کی ساری توانائیوں سے مالا مال تھا تو دوسری طرف اس کی بنیادیں مذہب پر رکھی گئی تھیں۔ ایک ایرانی مبلغ سیاح ناصر خسرو نے ۱۰۴۶ء سے لے کر ۱۰۴۹ء تک مصر کی سیاحت کی ہے اس نے یہاں کی ایک نہایت ہی رنگیں داستان لکھی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ خلیفہ کے محل میں تیس ہزار آدمیوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ ان میں بارہ ہزار خادم، ایک ہزار سوار اور پیدل محافظ تھے۔ اس سیاح نے یہاں کے خلیفہ مُستنصِر کو کسی تقریب میں خچر پر سوار جاتے دیکھا ہے اس کا بیان ہے کہ خلیفہ حسین جمیل اور نوجوان تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ دونوں صاف تھیں۔ اس کا لباس سیدھا سادا تھا۔ جسم پر سفید خفتان اور سر پر ایک عمامہ تھا۔ ایک خادم اس کے سر پر ایک چھوٹا سا چتر۔ مَظلّہ۔ اُٹھائے جا رہا تھا۔ یہ چتر قیمتی جواہرات سے مزّین تھا۔ نیل کے ساحل پر سات بادبانی جہاز لنگر انداز تھے اور یہ مجموعی حیثیت سے بچھتر گز رقبے کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں لنگر کے ساٹھ دستے تھے۔ دارالحکومت میں خلیفہ کے اپنے بیس ہزار مکان بھی تھے۔ ان میں سے اکثر مکان اینٹ کے بنے ہوئے تھے اور پانچ پانچ چھ چھ منزلیں ان میں بنی ہوئی تھیں، ان کے سوا خلیفہ کے قبضہ میں اتنی ہی

دکانیں بھی تھیں۔ اور ہر دکان دو سے لے کر دس دینار ماہانہ کے حساب سے کرایہ پر اٹھائی گئی تھی۔ شہر کی شاہراہیں مسقف تھیں اور قندیلیں لگا کر ان پر روشنی کی جاتی تھی۔ دکاندار مقررہ قیمت پر مال بیچا کرتے تھے اور کوئی دکاندار کسی گاہک کو دھوکا دیتا تو اس کو اونٹ پر بٹھا کر شہر میں گھمایا جاتا تھا، اس کے آگے حکومت کے کارندے گھنٹے بجا بجا کر منادی کرتے جاتے تھے کہ جو کوئی دکاندار ایسی خطا کریگا اُسے بھی ایسی ہی سزا دی جائیگی۔ قانون اور سیاست کا یہ رعب تھا کہ جوہریوں اور صرافوں کی دکانیں تک تالے لگائے بغیر یوں ہی چھوڑ دی جاتی تھیں۔ سارا ملک مالا مال اور رعایا خوش حال تھی۔ ملک کی اس خوش حالی سے متاثر ہو کر جذبۂ ستائش میں ناصر خسرو یہ تک لکھ گیا ہے کہ "اس ملک کی دولت و ثروت کا حساب و شمار میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس کا اندازہ تک نہیں کر سکتا۔ جیسی خوش حالی میں نے مصر میں دیکھی ویسی خوش حالی مجھے کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔

جس زمانے میں مصر اور شمالی افریقہ میں فاطمیوں کا دور دورہ تھا، اس وقت بغداد کی قدیم مملکت کے قلب پر انتشار و زوال کا طوفان پوری قوت اور تیزی کے ساتھ حملہ آور ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں تک سلجوقی ترکوں کو عروج حاصل ہوا اور انہوں نے اپنے ایک سلطان یعنی طغرل بک کو ۱۰۳۶ء میں خلیفہ کے دارالحکومت میں حاکم کے درجہ تک پہنچایا۔ جوں جوں سلجوقیوں کی فوجوں میں نئے نئے اور تازہ دم ہم قبیلہ ترک جوق در جوق داخل ہونے لگے ان کی فتوحات کے دامن بھی بڑی تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ مغربی ایشیا پھر ایک بار ایک ہی اسلامی حکومت کے پرچم تلے متحد ہو گیا۔ اور اسلامی فوجوں کی عظمت کا چاند پھر بدلی سے نکل آیا۔ اسلام کی طرف سے دنیوی اقتدار اور فضیلت کے حصول کی جو جد و جہد شروع کی گئی تھی اب وسط ایشیا کی ایک نئی نسل اس کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہی تھی۔ اس نسل کے وحشی اور بے دین افراد نے اگر کبھی رسول اللہ کے ماننے والوں کی گردنیں اپنے پیروں تلے روندی تھیں تو یہی لوگ اب اپنے مفتوحوں کا دین یعنی اسلام قبول

کر کے دین اسلام کے پرجوش علم برداروں میں داخل ہو گئے تھے لیکن یہ بھی خوب یاد رہے کہ دین اسلام کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا۔ ان کے عمزاد بھائی یعنی تیرہویں صدی کے منگولی اور دوسرے رشتہ دار عثمانی ترکوں نے بھی چودھویں صدی کی ابتدا میں یہی کہانی دہرائی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے تاریک ترین سیاسی دور میں بھی دینِ اسلام نے اپنی بعض نہایت شاندار فتوحات حاصل کی ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ زمانہ اسلام کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ ۱۲۲۶ء میں چنگیز خاں اپنے تقریباً ساٹھ ہزار وحشی منگلوں کا ہولناک غول لیے منظر تاریخ پر نمودار ہوا اور اس نے ایک دنیائے رنگین میں ہلاکت اور ویرانی پھیلا کر رکھ دی۔ اسلامی مملکت کے مشرق میں ان وحشیوں کا یہ ہولناک غول جس طرف نکل گیا وہاں کے ثقافتی مرکزوں کو روندتا اور نیست و نابود کرتا آگے بڑھ گیا۔ جہاں کسی وقت عالی شان محل اور کتب خانے کھڑے تھے وہاں اس غولِ بیابانی کے ہاتھوں ویرانوں اور بھائیں بھائیں کرتے کھنڈروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ تاریخ میں ان وحشیوں کی گزرگاہ انسانیت کے خون سے سرخ دکھائی دیتی ہے۔ ان درندوں نے شہر ہرات کے ایک لاکھ باشندوں میں سے ساٹھ ہزار آدمیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ شہر بخارا اسلامی علوم اور تقوے کا گہوارہ تھا۔ اس شہر کی مسجدوں کو وحشیوں نے گھوڑوں کا اصطبل بنا ڈالا۔ سمرقند اور بلخ کے بے شمار باشندوں کو یا تو نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ قتل کر ڈالا یا انہیں غلام کر کے ساتھ لے لیا۔ خوارزم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد ہی بغداد کی باری تھی۔ ابعد کی ایک روایت سے ظاہر ہے کہ تسخیر بخارا کے موقع پر چنگیز خاں نے اپنی ایک تقریر میں اپنے بارے میں کہا تھا کہ "میں خدائی تازیانہ ہوں جو لوگوں کے گناہوں کی پاداش میں نازل ہوا ہے" اس کے جتھوں نے تیرہویں صدی کے نصف اول میں چین سے لے کر بحیرۂ اڈریاٹک تک کی تمام سلطنتوں کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ اس طوفان میں روس کا ایک حصہ پامال ہوا۔ وسطی

یورپ میں مشرقی پروشیا تک یہ وحشی بڑھ آئے ۱۲۴۱ء میں چنگیز خاں کے بیٹے اور اس کے جانشین کی موت ہی نے مغربی یورپ کو ان منگولی غولوں کی دست برد سے بچالیا۔ لیکن بدنصیب بغداد کے لیے کوئی راہِ نجات نہ تھی۔

۱۲۵۳ء میں چنگیز کا پوتا ہلاکو ایک جرار فوج کے ساتھ خلافت کو تباہ و برباد کرنے کے ارادے سے منگولیا سے نکلا۔ اب منگولی غولوں کی دوسری موج اُمڈ رہی تھی۔ اس موج کے راستہ میں جتنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں آئیں ان سب کو یہ خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی اور یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وہ تھیں جو خلافت بغداد کے کھنڈروں پر گھاس پھونس کی طرح اُگ رہی تھیں ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے دارالخلافۂ بغداد کو گھیر لیا۔ جلد ہی مغلوں کی منجنیقوں سے شہر پناہ کے ایک بُرج میں رخنہ پڑ گیا۔ خلیفہ مستعصم کا وزیر ابن العلقمی ایک نسطوری جاثلیق کو ساتھ لیے۔ کیونکہ ہلاکو کی ایک بیوی نصرانی تھی ۔ صلح کی شرطیں معلوم کرنے کے لیے آموجود ہوا۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی باریاب نہیں کیا گیا۔ ہلاکو پر ان دھمکیوں کا بھی کچھ اثر نہ ہوا جو "دارالسلام" کو گزند پہنچانے یا خلافت عباسیہ کو ڈھانے کی کوشش کرنے والوں کے خطرناک انجام کے بارے میں دی جا رہی تھیں۔ ہلاکو سے کہا گیا تھا کہ "اگر خلیفہ کو قتل کر دیا گیا تو ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائیگا، سورج اپنا مُنہ چھپا لیگا، مینہ نہ برسیگا، اور کبھی درخت نہ اُگینگے" لیکن ہلاکو کے نجومیوں کا بُرا ہو کہ ان کے ذریعہ اسے بہتر انجام کی خبر مل گئی تھی۔ دسویں فروری کو اس کے وحشی غول کا ریلا شہر کے اندر گھس پڑا۔ بدنصیب خلیفہ مستعصم باللہ اور اس کے تین سو عمائد غیر مشروط اطاعت قبول کرنے کے لیے ہلاکو کی طرف دوڑے لیکن اس دن کے بعد ان سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ شہر کی گلی گلی میں شہریوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی اور پورے شہر کو آگ لگا دی گئی۔ آبادی کا بڑا حصہ جس میں خلیفہ کا خاندان بھی شامل تھا صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا[۱]۔ شہر کی شاہراہوں پر بے گور و کفن پڑی ہوئی لاشوں کی عفونت کی وجہ سے ہلاکو

[۱] صفحہ ۲۱۰ پر دیکھیے۔

کو کچھ دنوں کے لیے شہر سے ہٹ جانا پڑا۔ چونکہ ہلاکو بغداد کو اپنی قیام گاہ بنانا چاہتا تھا اس لیے یہ شہر دوسرے شہروں کے مقابلے میں پوری طرح سے تباہ و تاراج ہونے سے بچ رہا۔ ہلاکو نے نسطوری جاثلیق کو عنایات خاص سے سرفراز کیا۔ اس کے حکم سے بعض مدرسوں اور مسجدوں کو یا تو تباہ ہونے سے بچا لیا گیا یا انہیں دوبارہ تعمیر کر دیا گیا۔ تاریخ میں یہی سب سے پہلا موقع تھا کہ دنیائے اسلام اپنے خلیفہ کے وجود سے محروم رہی جس کا نام جمعہ کے خطبہ میں لیا جاتا تھا۔

۱۲۶۰ء میں ہلاکو نے شام کے شہروں کو اپنی درندگی کا شکار بنایا۔ اس ملک میں اس نے حلب کے سوا جہاں اس نے تقریباً پچاس ہزار آدمیوں کو ہلاک کیا، حماۃ، اور حارم کے شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس نے دمشق کی تسخیر کے لیے اپنے ایک جرنل کو بھیجا ہی تھا کہ اسے اپنے بھائی خان اعظم کی موت کی خبر ملی۔ یہ خبر سُن کر ہلاکو ایران واپس ہونے پر مجبور ہو گیا۔ شام فتح ہو جانے کے بعد ہلاکو نے یہاں جو فوج چھوڑی تھی اس فوج کو ۱۲۶۰ء

(نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۰۹) ؎ بغداد کی تباہی اور زوال خلافت پر اسی عہد کے فارسی کے بے نظیر و بے مثال شاعر اور ادیب سعدیؒ نے جو پرسوز مرثیہ لکھا ہے، اس میں ہلاکو کی لائی ہوئی تباہی پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں اور ان پُردرد واقعات کا ایسا دلگداز نقشہ کھینچا ہے کہ آج بھی اس کو پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں یہ مرثیہ ایک خلیفہ کا یا ایک شہر کا مرثیہ نہیں، پوری ایک قوم کا مرثیہ ہے، اسی مرثیہ کے چند شعر ہیں:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ۔۔۔ بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں

اے محمدؐ! در قیامت می براری سر ز خاک ۔۔۔ سر برآور دیں قیامت در میان خلق بیں

نازنینانِ حرم را خونِ موج بید ریغ ۔۔۔ ز آستاں بگذشت و ما را خون چشم از آستیں

زینہار از دورِ گیتی و انقلاب روزگار ۔۔۔ در خیال کس نگردد کانچناں گردد چنیں

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام ۔۔۔ قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقانِ چین

خون فرزندانِ عم مصطفیٰؐ شد ریختہ ۔۔۔ ہم بداں خاکے کہ سلطاناں نہادندی جبیں

وہ کہ گر بر خوں ایں پاکاں فرو آید مگس ۔۔۔ تا قیامت در دہانش تلخ گردد انگبیں

(مترجم)

میں ناصرہ کے قریب قرون وسطیٰ کے آخری عرب خانوادے یعنی مملوکوں کے ایک سپہ سالار بیبرس نے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

ہلاکو ہی نے سب سے پہلے ایل خان ۔"چھوٹا خان"۔ کا لقب اختیار کیا تھا۔ ۱۲۶۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کو مرے ہوئے پچاس برس بھی نہ ہوئے تھے کہ مغلوں کے ساتویں خاں نے اسلام کو حکومت کا مذہب قرار دیا اور اس طرح دین اسلام نے اپنی ایک اور انتہائی شاندار فتح حاصل کر لی۔ سلجوقیوں کی طرح تاتاریوں پر اسلامی لشکر غالب نہ آسکا لیکن دین اسلام نے ان کو زیر کیا۔ اور ان پر پوری فتح پائی۔

اس زمانے میں مغرب بعید کے ایک محاذ پر اسلام ایک اور طوفان سے دوچار تھا۔ اس طوفان نے خود ہمارے تمدن کی تاریخ پر نہایت درخشاں نقوش ثبت کیے ہیں۔ اسی طوفان نے اسلام کے ایک بہت بڑے مجاہد اور اس کے علم بردار کا عروج دیکھا ہے۔ یہ صلیبی لڑائیوں اور سلطان صلاح الدین اعظم کا زمانہ ہے۔

# ۱۷۔ صلیبی لڑائیاں

قرون وسطیٰ کی تاریخ میں صلیبی لڑائیاں مشرق اور مغرب کی طویل کشمکش کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ قدیم زمانے میں ٹراجنون (Trojan) اور ایرانیوں میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان کو اس داستان کی تمہید اور مغربی یورپ کے سامراجی پھیلاؤ کو اس کا جدید ترین باب قرار دیا جا سکتا ہے۔

صلیبی لڑائیاں اور بھی واضح طور پر اسلامی ایشیا کے خلاف یورپی نصرانیت کے ردِ عمل کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ ردِ عمل ۶۳۲ء میں نہ صرف شام اور ایشیائے کوچک ہی میں شروع ہو چکا تھا بلکہ اسپین اور صقلیہ میں بھی یہ ردعمل اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ اس ردعمل کے بعض اسباب یہ تھے کہ یورپ کے ٹیوٹانی قبیلوں میں مہاجرت اور فوجی تنظیم کے میلانات پیدا ہو گئے تھے یہ ٹیوٹانی قبیلے وہی لوگ ہیں جنہوں نے منظر تاریخ پر ظاہر ہوتے ہی یورپ کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔ فلسطین میں حضرت عیسیٰ کا ضریح مقدس جو ہزاروں نصرانی اہل یورپ کی زیارت گاہ بنا ہوا تھا اور جس کی کنجیاں ۸۰۰ء میں بیت المقدس کے بطریق نے شارلمین کے پاس حصول برکت کے لیے بھیج دی تھیں اس کو ایک فاطمی خلیفہ الحاکم نے ۱۰۰۹ء میں تباہ کر ڈالا تھا۔ اس کے سوا نصرانی زائروں کو مسلم ایشیائے کوچک میں سے گزر کر جانے میں طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تاہم صلیبی لڑائیوں کا فوری سبب بازنطینی شہنشاہ الکسس کامنی نیس (Alexius Comneveus) کی وہ اپیل تھی جو اس نے ۱۰۹۴ء میں پاپائے روم اربن دوم (Pope Urbon) سے کی تھی۔ کیونکہ اس کے ایشیائی مقبوضات پر بحیرۂ مارمورہ تک سلجوقی ترکوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ ان مسلمانوں کی یلغاروں سے خود شہر قسطنطنیہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ یونانی اور رومی کلیساؤں

میں ایک زمانے سے ان بن چلی آرہی تھی اور ۱۰۵۴ء میں ان دونوں کلیساؤں میں قطعی تفرقہ پڑ گیا تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کی اپیل میں پاپائے روم کو ان دونوں بچھڑے ہوئے کلیساؤں کے باہم متحد ہونے کے امکانات نظر آنے لگے۔

پاپائے روم اربن نے ۲۶۔ نومبر ۱۰۹۵ء کو جنوب مشرقی فرانس کے شہر کلرمونٹ (Clermont) میں جو تقریر کی تھی اس کو غالباً تاریخ کی موثر ترین تقریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس تقریر میں پاپائے روم اربن نے نصرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف یہ کہہ کر ابھارا کہ "ضریح مقدس کی طرف جانے والے راستے پر ڈٹ جاؤ، اس کے لیے نابکاروں کی نسل سے لڑو اور اسے اپنا غلام بنالو"۔ ساری نصرانی دنیا "خدا کی مشیت یہی ہے" کے نعرے سے گونج اٹھی۔ اور یہ نعرہ ہر کہ ومہ کے قلب وروح پر اپنی تمام اچھی اور بری، روحانی اور اخلاقی قوتوں کے ساتھ مسلط ہو گیا۔ اسی سال کے موسم بہار میں ایک لاکھ پچاس ہزار آدمیوں نے پاپائے روم کی دعوت پر لبیک کہا۔ ان میں بڑی تعداد فرانکوں اور نارمنوں کی تھی۔ یہ سب کے سب شہر قسطنطینہ میں جمع ہو گئے۔ پھر دنیا کی سب سے پہلی صلیبی لڑائی کا آغاز ہوا۔ ان لڑائیوں کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں حصہ لینے والے سپاہی اپنے سینوں پر بیاج کے طور پر صلیب لٹکایا کرتے تھے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ ان لڑائیوں میں تمام نصرانیوں نے صرف مذہبی جوش اور مذہبی تحریک کی بنا پر حصہ نہیں لیا تھا بلکہ ان کے بہت سے قائد جن میں بوہمنڈ (Bohemond) بھی شامل ہے، ایسے تھے جنہوں نے صرف چند علاقوں کی حرص و ہوس میں ان جنگوں میں شرکت کی تھی۔ پیسا، وینس اور جنیوا کے تاجروں کے مفاد الگ ان میں شامل تھے۔ رومان پسندوں، بے چین لوگوں اور مہم جو طبیعتوں کو ان لڑائیوں کی صورت میں یکجا ہونے کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ بہت سے مجرموں کو اپنا کفارہ ادا کرنے کی یہی صورت نظر آئی۔ فرانس، لورین، اطالیہ اور صقلیہ میں بسنے والے عوام میں معاشی اور سماجی ابتری

پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے کچھ مذہب پر قربان ہونے کے لیے ہی نہیں بلکہ ان حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے بھی صلیب اُٹھائی تھی۔

عام طور پر صلیبی لڑائیوں کی تعداد سات سے نو تک متعین کی جاتی ہے وہ کچھ درست نہیں۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ کم وبیش متواتر جاری رہا اور ان کے درمیان کوئی قطعی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان کو زیادہ منطقی طور پر اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۱۴۴ء تک جاری رہا۔ یہ فتح وظفر کا دور ہے۔ دوسرا دور اسلامی ردعمل کا دور ہے اور یہ دور سلطان صلاح الدین کی شاندار فتوحات پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا دور خانہ جنگیوں اور ایسے جھگڑوں کا دور ہے جو ۱۲۹۱ء تک جاری رہے۔ اس دور میں شام کے اصل علاقے کا آخری قلعہ تک نصرانی مجاہدوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فتح وظفر کا دور نام نہاد دوسری صلیبی لڑائی (۱۱۴۷ء۔ ۱۱۴۹ء) سے پہلے تمام ہو جاتا ہے اور تیسرا دور کم وبیش تیرہویں صدی کی ابتدا میں آتا ہے۔ اس آخری دور میں ایک صلیبی لڑائی (۱۲۰۲ء۔ ۱۲۰۴ء) شہر قسطنطنیہ کے خلاف اور دو لڑائیاں (۱۲۱۸ء۔ ۱۲۲۱ء) مصر کے خلاف اور ایک لڑائی (۱۲۷۰ء میں) تونس کے خلاف لڑی گئی۔ یہ سب لڑائیاں بے نتیجہ اور بے حاصل رہیں۔

پہلے نصرانی مجاہدوں نے اپنے مقام اجتماع قسطنطنیہ سے نکل کر ایشیائے کوچک کے راستہ پر بڑھنا شروع کیا۔ الکسس نے ان کے تمام قائدوں سے فوجی اطاعت اور وفاداری حلف لے لیا تھا۔ ان لوگوں کی فاتحانہ پیش قدمی کی بدولت الکسس نہ صرف مغربی جزیرہ نما کے آدھے پر دوبارہ قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اس سے ترکوں کا حملۂ یورپ ساڑھے تین سو سال تک معرض التوا میں پڑ گیا۔

نصرانیوں نے پہلے طرسوس، انطاکیہ، اور حلب پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں کہ انطاکیہ میں وہ مقدس نیزہ برآمد ہوا تھا جو حضرت عیسیٰ کے پہلو میں ان کے صلیب پر لٹکتے وقت چبھویا گیا تھا۔ اور یہ نیزہ انطاکیہ کے کسی کلیسا میں مدفون پڑا تھا۔ اس نیزہ کا برآمد ہونا

تھا کہ نصرانی مجاہدوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی اور اسی کی بدولت شہر انطاکیہ فتح ہو سکا۔ ۷۔جون ۱۰۹۹ء کو تقریباً چالیس ہزار نصرانی بیت المقدس پہنچ گئے۔ ان میں بیس ہزار کے قریب طاقتور فوجیں تھیں۔ شہر کے اندر جو فاطمی مصری محافظ فوج تھی اس کی تعداد کا تخمینہ ایک ہزار کیا جاتا ہے نصرانیوں کو اُمید تھی کہ بیت المقدس بھی آسانی کے ساتھ فتح ہو جائیگا۔ اس لیے پہلے پہل وہ اپنے بوق بجاتے برہنہ پا شہر کے اطراف میں پھرنے لگے لیکن محاصرے نے لگاتار ایک مہینے تک طول کھینچا۔ ۱۵۔جولائی کو نصرانیوں نے شہر پر دھاوا کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس میں انہوں نے بوڑھوں، معذوروں، عورتوں اور بچوں تک کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔" شہر کی شاہراہوں پر، سڑکوں پر، گلی کوچوں میں انسانی ہاتھ پیر اور سروں کے ڈھیر کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے" بہت سے نصرانی جانبازوں اور زائروں نے یہ سمجھا کہ اب ان کی قسم پوری ہو چکی، اس لیے وہ اپنے وطنوں کو واپس لوٹ گئے۔

فرانس کے سب سے طاقتور سردار ریمنڈ (Raymond of Toulouce) بھومنڈ (Bohemond)، بالڈون (Baldwin) اور گاڈفرے (Godfrey) کی قیادت میں نصرانی مجاہدوں کے لشکر نے شام و فلسطین میں تین چھوٹی لاطینی ریاستیں قائم کیں اور بعد میں اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوتی رہیں ان کی آپس کی بھڑپیں اور بے معنی رقابتیں تاریخ عرب کا نہیں تاریخ یورپ کا ایک باب ہیں لیکن اس دوران میں مغرب کے رہنے والوں اور دیسی باشندوں کے درمیان جو پُرامن اور دوستانہ تعلقات پیدا ہو چلے تھے، وہ یہاں ضرور قابلِ ذکر ہیں۔

یورپ کے نصرانی ارض مقدس میں یہ تصور لے کر آئے تھے کہ وہ یہاں کے باشندوں سے ہر طرح افضل و برتر ہیں۔ اول تو وہ مسلمانوں کو بت پرست سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ حضرت محمدؐ کو خدا مانتے اور ان کی پرستش کیا کرتے ہیں لیکن مسلمانوں

کے ساتھ پہلے ہی سابقے نے ان کے سارے تصورات کو باطل ثابت کر کے رکھ دیا لیکن خود ان لوگوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں اپنا جو تصور پیش کیا اس کا حال ایک عرب مورخ اسامہ کی زبانی ہی سنیے۔ وہ اپنی تصنیف "کتاب الاعتبار" میں لکھتا ہے:"یہ لوگ جانور ہیں، اور ان میں دلیری اور جنگجوئی کے سوا اور کوئی دوسرا وصف نہیں پایا جاتا"۔ نصرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان امن کے زمانوں میں — اور یہ زمانے لڑائیوں کے زمانوں سے زیادہ طویل ہوا کرتے تھے — مجبوراً جو ربط قائم ہو جاتا تھا اس سے ان لوگوں کے باہمی احساسات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ فریقوں میں دوستانہ اور ہمسائگی کے تعلقات قائم کیے جانے لگے۔ فرانکوں نے بھروسے کے مقامی صناعوں اور کاشتکاروں کی خدمات حاصل کیں۔ فرانکوں کے جاگیری نظام نے رفتہ رفتہ زمین کی ملکیت کے مقامی اصول کو اختیار کر لیا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ گھوڑے، باز اور کتے لے کر آتے تھے۔ اس لیے شکار کھیلنے والی جماعتوں کو حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جلد ہی ہمسایوں سے بعض معاہدے بھی طے کر لیے گئے۔ مسافروں اور تاجروں کے لیے بدرقوں کا احترام دونوں فریق کیا کرتے تھے۔ فرانکوں نے اپنا یورپی لباس ترک کر کے مشرق کا نسبتاً زیادہ آرام دہ اور زیادہ موزوں لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں فرانکوں کو نئے نئے کھانوں اور خاص کر ایسی چیزوں کا چسکا لگ گیا تھا جن میں شکر اور مسالے کافی مقدار میں استعمال کیے جاتے تھے۔ رہنے کے لیے مشرقی وضع کے مکان زیادہ پسند کیے جانے لگے۔ کیونکہ ان مکانوں میں کھلے صحن اور پانی کے حوض ہوتے تھے۔ بعض نصرانیوں نے دیسی عورتوں سے شادی بیاہ کر لیا تھا، اور ان عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوئی اس کو "پُولان" (*Poulains*) یا "نِھنے" کہا جانے لگا۔ بعض صورتوں میں ان تبرکات اور مزاروں تک کا احترام کیا جانے لگا جنھیں مسلمان اور یہود دونوں مقدس مانتے تھے۔ روز مرہ کے جھگڑے چکانے کے لیے اکثر اوقات یہ لاطینی اپنے ہموطنوں کے مقابلہ میں "بے دینوں"

کی امداد اور مسلمان اپنے ہم دینوں کے مقابلہ میں لاطینیوں کی امداد کا خیر مقدم کیا کرتے تھے۔

شام اور خاص کر مصر کی فتح کے خلاف جو ردِ عمل ۱۱۲۷ء میں شروع ہوا اس میں سب سے نمایاں حصہ موصل کے زنگی سلطان اور اس کے بیٹے سلطان دمشق نور الدین زنگی نے لیا۔ پھر یہ ردعمل الملک الناصر سلطان صلاح الدین یوسف کے عہد میں پوری شدت اختیار کر گیا۔ اسی کشمکش نے دنیا کی تاریخ کو وہ بلند پایہ اور رومانی کردار عطا کیا جسے آج دنیا سلطان صلاح الدین کے نام سے یاد کرتی ہے۔ صلاح الدین دجلہ کے کنارے آباد تکریت کے مقام پر ۱۱۳۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین کرد نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمیں اس کے بچپن کے حالات بالکل معلوم نہیں۔ شام میں اس نے کیا تعلیم پائی یہ بھی معلوم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اسے دینی علوم کی تعلیم دی گئی تھی اور ان علوم سے اُسے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۱۶۴ء تک اس کی زندگی گمنام رہی، لیکن اسی سال اسے اپنی مرضی کے خلاف اپنے چچا شیر کوہ کے ساتھ مصر کی مہم میں شریک ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اسے اب اپنی زندگی کی سب سے بڑی دو تمناؤں کے پورا کرنے کا موقع ملا تھا۔ مصر میں شیعت کی جگہ سنیت کا پھیلانا اور فرانکوں کے خلاف جہاد کرنا۔ ان دونوں کاموں کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ۱۱۶۹ء میں وہ اپنے چچا شیر کوہ کی وفات کے بعد مصر کی وزارت پر فائز ہوا۔ ۱۱۷۱ء میں اس نے خطبہ سے فاطمی خلیفہ کا نام نکال دیا اور اس کی جگہ عباسی خلیفہ المستضی کا نام پڑھنے کا حکم دیا۔

صرف چھ دن کے محاصرے کے بعد صلاح الدین نے پہلی جولائی ۱۱۸۷ء کو طبریہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حطین کی جنگ ہوئی۔ یہ مقام طبریہ سے بالکل قریب ہے۔ اس جنگ کی ابتدا جمعہ کے دن ہوئی۔ یہ دن مسلمانوں کی اجتماعی عبادت کا دن ہے اور لڑائی شروع کرنے کے لیے سلطان اسی دن کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ جس روز لڑائی شروع ہوئی وہ فرانکوں کے لیے انتہائی المناک دن ثابت ہوا۔ فرانکوں کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ

تھی اور سب کے سب گرمی اور پیاس سے مرے جا رہے تھے۔ ان کی تقریباً پوری فوج مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی۔ ممتاز قیدیوں میں بیت المقدس کے والی گئے دی لوزگ نان (Guy de Luisignan) کا نام سرفہرست تھا۔ بہادر سلطان نے اس شکست کھانے والے حکمراں کی دوستوں کی طرح پذیرائی کی لیکن گئے دی لوزگ نان کا ساتھی ریجینالڈ (Regiald of Chatillon) اس کے برعکس سلوک کا مستوجب تھا۔ غالباً ریجینالڈ تمام لاطینی قائدوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ دلیر اور سب سے کم محتاط قائد تھا۔ اور دوسرے قائدوں کے مقابلہ میں یہ عربی زبان نہایت روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ شہر کرک کی کمان داری اسے سونپی گئی تھی۔ اس نے کئی بار ان پُرامن کاروانوں پر جو اس کی گڑھی کی دیوار کے نیچے سے گزرتے تھے، چھاپے مار کر انہیں لوٹ لیا تھا۔ اس کی یہ حرکتیں دوستی اور محبت کے معاہدوں کے خلاف تھیں۔ اس نے یہ تک کیا کہ ایک بحری بیڑہ تیار کر کے ارض حجاز کے ساحلوں پر چھاپے مارے اور حاجیوں کو لوٹ کر ہر طرف ہراسانی پھیلا دی۔ صلاح الدین تک جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے اس پیماں شکن کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی قسم کھائی۔ اب اس قسم کے پورا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ عربوں کی مہمان نوازی سے ریجینالڈ خوب واقف تھا۔ اس نے مہماں نوازی کے ایک مسلمہ اصول سے فائدہ اُٹھا کر سلطان کے خیمہ سے پانی کا ایک پیالہ حاصل کر لیا لیکن یہ پیالہ خود سلطان نے پیش نہیں کیا تھا۔ اس لیے قیدی اور قید کرنے والے کے درمیان میزبانی اور مہمانی کا کوئی رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ ریجینالڈ نے غداری کی پاداش میں اپنی جان کھوئی۔ اس کے ساتھ تمام ٹمپلروں (Templurs) اور ہاسپٹلروں (Hospitallers) کو بھی مجمع عام میں قتل کر دیا گیا۔

حطین کی فتح نے فرانکوں کی قسمت پر مہر لگا دی۔ ایک ہفتہ کے محاصرے کے بعد ۱۲۔ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو بیت المقدس نے بھی اسلامی فوجوں کے آگے اپنا سر اطاعت خم کر دیا

مسجد اقصیٰ میں نصرانی گھنٹوں کی بجائے اذان دینے کے لیے مؤذن مقرر کیا گیا اور قبۃ الصخرہ پر جو طلائی صلیب نصب کی گئی تھی اس کو صلاح الدین کے آدمیوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ بیت المقدس لاطینی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ اس کی فتح سے فرنگی شام و فلسطین کے اکثر علاقے سلطان کے زیر اقتدار آ گئے۔ جو قلعے بچ رہے تھے ان میں سے اکثر قلعوں پر مختلف معرکوں میں قبضہ کر لیا گیا۔ یہ معرکے نہایت دلیری سے سر کیے گئے تھے۔ ارض شام و فلسطین میں فرانکوں کا وجود تقریباً مٹ گیا تھا۔ ان کے قبضہ میں چند قصبوں اور قلعوں کو چھوڑ کر صرف انطاکیہ، طرابلس اور صور کے شہر باقی رہ گئے تھے۔

بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے سے پورے یورپ میں کھلبلی پڑ گئی۔ یہاں کے حکمرانوں نے اپنے آپسی لڑائی جھگڑوں کو بالکل بھلا دیا۔ جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک باربروسا (Frederick Barbarossa)، انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیر دل (Richard Coeur de Lion) اور فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس (Philip Augustus) تینوں بادشاہوں نے صلیب اٹھالی۔ مغربی یورپ کے یہی تین طاقتور ترین حکمراں تھے اور ان تینوں ہی نے تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹ء-۱۱۹۲ء) کی ابتدا کی تھی۔ تعداد کے لحاظ سے اس لڑائی میں سب سے زیادہ فوج استعمال کی گئی تھی۔ رچرڈ شیر دل اور صلاح الدین اس کے عظیم ترین کردار ہیں۔ اس لڑائی نے مشرقی اور مغربی قصوں، کہانیوں، روایتوں اور افسانوں کے لیے نہایت دلکش موضوع مہیا کیے ہیں۔

میدان کارزار کی طرف سب سے پہلے فریڈرک نے اپنا قدم بڑھایا۔ وہ اپنی فوجوں کو لے کر خشکی کے راستے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا اور ایک سلیسی (Cilician) دریا کو عبور کرتے وقت ڈوب گیا۔ اس کی فوج کے اکثر سپاہی وطن لوٹ گئے۔ راستے میں رچرڈ جزیرہ قبرس کو فتح کرنے کے ارادے سے ٹھہر گیا۔ آگے چل کر یہی جزیرہ ارض شام و فلسطین سے نکالے ہوئے نصرانی مجاہدوں کی آخری پناہ گاہ بننے والا تھا۔

اسی اثناء میں ارض مقدس کے لاطینیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کھوئے ہوئے علاقوں پر پھر سے قبضہ کرنے کے لیے عکا سے کلیدی مرکز کا کام لیا جائے۔ اس لیے یہ لوگ اپنی تمام فوجوں کو لے کر اس مقام کی طرف بڑھے۔ ان فوجوں میں فریڈرک کے بچے کھچے سپاہی اور فرانس کے بادشاہ کے امدادی دستے بھی شامل ہو گئے تھے۔ بیت المقدس کے والی گئے دی لوزگ نان نے اپنی عزت کی قسم کھا کر صلاح الدین سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ اس کے خلاف کبھی تلوار نہیں اٹھائیگا۔ اس لیے صلاح الدین نے اسے رہا کر دیا تھا۔ لیکن اس معرکہ میں یہی شخص قیادت کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ دوسرے دن صلاح الدین شہر کی حفاظت کے لیے آپہنچا اور دشمنوں کے مقابل پڑاؤ ڈال دیا۔ خشکی اور تری ہر جگہ کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ رچرڈ کی آمد پر نصرانیوں نے بڑی خوشی منائی اور آتشبازی چھوڑ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ محاصرے کے دوران میں بہت سے پُر لطف واقعات پیش آئے۔ ان پر لطف واقعات کو ہم عصر لاطینی اور عربی دونوں وقائع نگاروں نے لکھا ہے۔ اس محاصرے میں یہ تک ہوا کہ صلاح الدین اور رچرڈ نے ایک دوسرے کے پاس تحفے تحائف بھیجے لیکن دونوں کے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ رچرڈ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ شہر کی دیوار کے جتنے بھی پتھر اکھیڑے جائینگے، اکھیڑنے والوں کو ایک ایک پتھر کے بدلے بیش قرار انعام دیا جائیگا۔ پھر تو سورماؤں نے، جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اپنی جانوں کی بازی لگا دی اور جوانمردی کے خوب ہی جوہر دکھائے۔ اس محاصرے کا شمار قرون وسطیٰ کے عظیم ترین حربی کارناموں میں ہوتا ہے۔ یہ محاصرہ لگاتار دو سال یعنی ۲۸۔ اگست ۱۱۸۹ء سے ۱۲۔ جولائی ۱۱۹۱ء تک جاری رہا۔ فرانکوں کو مسلمانوں پر اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کے پاس بحری بیڑہ اور قلعہ شکن عصری توپخانہ تھا۔ اور مسلمانوں کو فرانکوں پر اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کی قیادت کی باگ صرف ایک شخص کے ہاتھ میں تھی۔ آخر کار قلعہ کی فوج نے ہتھیار رکھ دیے۔

صلح کی دو شرطیں طے ہوئیں۔ اول یہ کہ دولاکھ اشرفیوں کی ادائی پر قلعہ کی فوج کو رہا کردیا جائیگا اور دوسرے یہ کہ مقدس صلیب نصرانیوں کے حوالے کردی جائیگی جب ایک مہینے کے ختم پر رقم ادا نہیں ہوئی تو رچرڈ نے دو ہزار سات سو قیدیوں کے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ رچرڈ کی یہ حرکت سلطان صلاح الدین کے اُس برتاؤ کے بالکل برعکس تھی جو اس نے بیت المقدس فتح ہو جانے کے بعد نصرانی قیدیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ صلاح الدین نے بھی اس وقت نصرانیوں پر تاوان کی ادائی کی شرط لگائی تھی۔ اس وجہ سے کئی ہزار نادار نصرانیوں کے لیے رہائی کی کوئی صورت نہ رہی تھی لیکن سلطان نے اپنے بھائی کی درخواست پر ان میں سے ایک ہزار قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور نصرانی بطریق کی درخواست پر قیدیوں کی ایک اور جماعت کو رہائی دے دی تھی۔ اس کے بعد سلطان نے سوچا کہ میرے بھائی اور بطریق دونوں نے اپنا اپنا صدقہ ادا کر دیا، اب میری باری ہے۔ اس نے باقی قیدیوں میں سے بہتوں کو تاوان لیے بغیر چھوڑ دیا۔ ان قیدیوں میں بہت سی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

اس وقت تک نصرانی قیادت کا مرکز بیت المقدس کا شہر تھا لیکن مذکورہ محاصرے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ مرکز شہر عکہ منتقل ہو گیا۔ فریقوں کے درمیان جو امن کے معاہدے ہوئے ان پر کسی خلل اور کسی ردوبدل کے بغیر عمل ہونے لگا۔ رچرڈ رومانی تصورات سے سرشار تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کی بہن کی شادی سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل سے کردی جائے اور دولہا دلہن کو شادی کے تحفے کے طور پر بیت المقدس کا شہر دے کر اس طرح نصرانیوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزش کا خاتمہ کردیا جائے۔ ۲۹۔ مئی ۱۱۹۲ء کو عید فصح (Palun Sunday) کے موقع پر رچرڈ نے صلاح الدین کے بھتیجے الملک الکامل کو پورے رسوم کے ساتھ سر کا خطاب عطا کیا۔ صلح نامے کی تکمیل ۲۔ نومبر ۱۱۹۲ء کو اس بنیاد پر عمل میں آئی کہ ملک کا

تمام ساحلی علاقہ لاطینیوں کا اور اندرونی پورا علاقہ مسلمانوں کا ہوگا۔ اور یہ کہ جو زائر بیت المقدس آئینگے انہیں پریشان نہیں کیا جائیگا۔ اس معاہدے کے طے ہونے کے بعد صلاح الدین صرف چند مہینے زندہ رہا۔ دوسرے سال ۱۹۔ فبروری کو وہ دمشق میں بیمار ہوا، اور اس کے بارہ دن بعد پچپن سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ آج بھی اس کا مزار شامی دارالحکومت دمشق کی مسجد امیہ کے قریب واقع ہے اور زائروں کی قبلہ گاہ بنا ہوا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایک سچا سپاہی اور سنی اسلام کا علم بردار ہی نہ تھا، اس میں اور بھی بہت سی خوبیاں اور اچھائیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ عالموں کا سرپرست اور دینی تعلیم کی نشرواشاعت کا بڑا حامی تھا۔ اس نے مورچے اور دمدمے تعمیر کرائے، نہریں کھدوائیں اور مدرسے اور مسجدیں بنوائیں۔ قاہرہ کا قلعہ اسی کی ایک تعمیری یادگار ہے۔ قاہرہ کے قلعہ اور شہر پناہ کی تعمیر ۱۱۸۳ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس میں سلطان نے مصر کے چھوٹے چھوٹے اہراموں کے پتھر استعمال کیے ہیں۔ ہارون اور بیبرس جیسے مشاہیر اسلام کی فہرست میں مسلمان اس کا نام گنتے ہیں، اور آج بھی صلیبی مجاہدوں کے مقابلے میں حامی اسلام مردِ خدا کی حیثیت سے اس کا نام بہت مقبول ہے۔ اس کے عظیم الشان کردار نے نہ صرف قرون وسطیٰ کے انگریز شاعروں کے سازِ تخیل کو چھیڑا بلکہ ہمارے زمانے کے ناول نگاروں کے تصورات کو اپنے کردار سے مالامال کیا ہے۔ آج بھی اس کو نظام سپہ گری کا ایک مکمل کردار سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد تقریباً سو سال تک اِکا دُکا لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان لڑائیوں سے کوئی فیصلہ کن نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ ہاں اس سے اتنا ضرور ہوا کہ لاطینیوں نے ان لڑائیوں کے ذریعہ اپنی حیثیت کو بہرحال سنبھالے رکھا۔ ان تمام واقعات کو چھٹی صلیبی لڑائی کے تحت لایا جا سکتا ہے۔ اس لڑائی کی ابتدا فرانس کے بادشاہ لوئی نہم (King Louis) اور اس کے سورما امیروں نے کی تھی۔ یہ بادشاہ تاریخ میں سینٹ لوئی

یعنی "ولی لوئی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ۱۲۴۹ء میں مصر کے شہر دمیاط پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی فوجوں کو قاہرہ کی طرف ایک ایسے دلدلی خطے میں سے ہو کر کوچ کرنا پڑا تھا جس پر نہروں کا جال بچھا ہوا تھا اور دریائے نیل بھی اس وقت پورے سیلاب پر تھا، اس لیے لوئی کی فوجوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ رسل و رسائل کے یکسر منقطع ہو جانے کی وجہ سے بھی اس کی ساری فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ بادشاہ لوئی کو اس کے اکثر امیروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ ایک مہینے کی قید کے بعد تاوان کی ادائی اور شہر دمیاط کی واپسی کی شرط پر ان سب کو رہا کر دیا گیا۔ ۱۲۷۰ء میں لوئی نے تونس کے مقام پر دوسری بے حاصل صلیبی لڑائی چھیڑی اور یہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ نصرانی مجاہدوں کے تمام قائدوں کے مقابلے میں لوئی کا کردار سب سے زیادہ شاندار رہا ہے۔ ایک مورخ نے اس کے بارے میں لکھا ہے "اس کی زندگی سراپا نماز تھی اور اس کے سارے کام مشیئتِ الٰہی کے تابع تھے"۔

مصر کے عجیب و غریب خاندان مملوک کی بنیاد الملک الظاہر بیبرس (۱۲۶۰ء۔ ۱۲۷۷ء) نے رکھی تھی۔ بیبرس اور اس کے جانشینوں ہی نے نصرانی مجاہدوں کے داعیہ پر آخری اور فیصلہ کن ضربیں لگائی ہیں۔ ۱۲۶۳ء میں بیبرس نے کرک پر قبضہ کر کے ناصرہ کے کلیسا کو ڈھا دیا۔ قیساریہ، یافا اور انطاکیہ کے شہروں نے بھی اس کے ناقابلِ مقاومت اور بے جگرانہ نرغوں کی تاب نہ لا کر سر اطاعت خم کر دیا۔ انطاکیہ کی محافظ فوج جس کی تعداد سولہ ہزار بیان کی جاتی ہے، تہ تیغ کر دی گئی، اور تقریباً ایک لاکھ مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں لونڈی غلام بنا کر بیچ دیے گئے۔ مال غنیمت جب تقسیم ہوا تو پیالوں سے نقدی ناپی گئی۔ ہر چھوٹے سے بچے کے حصے میں بارہ درم اور ہر لڑکی کے حصے میں پانچ درم آئے۔ یہ ایسی تاخت و تاراج تھی کہ انطاکیہ پھر پنپ نہ سکا۔

۱۲۷۱ء میں بیبرس نے اکراد فرانکوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ طرطوس کے جوار میں

مرقب کے علاقے پر بیبرس کے جانشین ملک الاشرف قلاؤں نے ۱۲۸۵ء میں قبضہ کر لیا اور اس کے چار سال بعد طرابلس پر بھی قابض ہو گیا۔ اب حما اور عکا کے سوا فرانکوں کے اور کوئی مرکز باقی نہ رہے تھے۔ سلطان قلاؤں کے عہد میں شہر عکا کا محاصرہ کیا گیا۔ اس کے دمدموں اور مورچوں کے سامنے ۹۲ منجنیقیں نصب کی گئیں اور ۱۲۹۱ء میں ہجوم کر کے اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ جو ٹمپلر اس شہر کی حفاظت کر رہے تھے وہ تقریباً سب کے سب ہلاک کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مشرق میں لاطینیوں کا آخری قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ اسی سال اسلامی فوجیں صور، صیدا، بیروت اور طرطوس پر بھی قابض ہو گئیں۔ نصرانی مجاہدوں کو سمندر کی طرف ڈھکیل دیا گیا اور اس طرح تاریخ شام کے ایک ڈرامائی باب کا خاتمہ ہو گیا۔

صلیبی لڑائیوں کا دامنِ تاریخ بعض حسین و دلکش رومانی واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ان واقعات کی وجہ سے ان لڑائیوں کی تاریخی اہمیت کے اظہار میں کچھ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ یہ لڑائیاں مشرق کے مقابلہ میں مغرب کے لیے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان لڑائیوں نے جو تمدنی اثرات مرتب کیے ہیں وہ سائنس اور ادب سے زیادہ فنی، صنعتی اور تجارتی نوعیت کے ہیں۔ ان لڑائیوں نے شام میں تباہی و بربادی، کھنڈر اور ویرانی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اور سارے مشرق قریب میں نصرانیوں اور مسلمانوں اور ان کی آنے والی نسلوں کے درمیان نفرت و عداوت کی ایک ایسی وسیع خلیج پیدا کی ہے کہ آج تک یہ خلیج پاٹے نہیں پٹتی۔

صلیبی لڑائیوں کے دور میں اسلامی ثقافت مشرق میں پہلے ہی سے زوال پذیر ہو چکی تھی۔ فلسفہ، طب، موسیقی اور علم کے دوسرے شعبوں میں اس کا زبردست نور تقریباً غائب ہو چکا تھا غالباً یہی وجہ تھی کہ ملک شام جو تیرھویں اور چودھویں صدی کے دوران میں نصرانیت اور اسلام کے باہمی تعلقات کا مرکز بنا ہوا تھا، عربی اثر کو مغرب میں منتقل کرنے

کے معاملہ میں اسپین، یا صقلیہ حتیٰ کہ بازنطینی شہنشاہیت سے اس قدر پیچھے رہا۔ اگرچہ شام میں اسلام نے نصرانی یورپ پر اپنے اثرات نصرانی مجاہدوں کے ساتھ راست تصادم کے ذریعہ مرتب کیے ہیں، اور اسی طرح مغرب کے خلاف اس تصادم کے راست ردِّ عمل کے ذریعہ اور تجارتی راہوں سے ہو کر یہ اثرات آئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کے اثرات میں سے صرف روحانی اور ذہنی اثرات ہی قابل ذکر ہیں۔ دوسری طرف ہمیں اس حقیقت کو بھی کبھی نہ بھلانا چاہیے کہ اس ملک میں جو فرانک آبسے تھے وہ نہ صرف اپنے حریفوں کے مقابلے میں پست معیار ثقافت کے حامل تھے بلکہ ملک کے سمجھ دار اور شائستہ طبقہ کی بجائے انہوں نے اپنے قریبی تعلقات کاشتکاروں اور صناعوں کے ساتھ جوڑ رکھے تھے۔ اس کے سوا یہ لوگ آبادی سے دور قلعوں اور فوجی چھاؤنیوں میں رہا کرتے تھے۔ پھر قومی بغض و عناد اور مذہبی تعصبات الگ تھے جو عاملانہ قوتوں کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ جہاں تک سائنس اور آرٹ کا تعلق ہے ان میں فرانکوں کی معلومات خود اس قدر حقیر تھیں کہ وہ دیسی باشندوں کو کچھ سکھانے کے قابل نہ تھے۔ دونوں حریفوں کی طبی معلومات میں جو فرق تھا اس کا اندازہ ایک ہم عصر عربی مورخ اسامہ کے محاضرات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس نے فرانکوں کے عدالتی نظام، ڈوئل اور پانی کے ذریعہ تحقیقات کا بھی مذاق اڑایا ہے

بارہویں صدی سے یورپ میں محتاج خانے شفا خانے اور خاص کر برص کے مریضوں کے لیے خیرات خانے بڑی تعداد میں قائم ہونے لگے۔ ان کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں باقاعدہ شفاخانوں کے قیام کی تحریک اصل میں اسلامی مشرق ہی سے آئی تھی۔ اس کے سوا یہاں عام غسل خانوں نے اسی اسلامی مشرق کے اثر سے دوبارہ رواج پایا۔ ان حماموں کی کسی زمانے میں رومیوں نے سرپرستی کی تھی لیکن نصرانی ان کے مخالف رہے تھے۔

ادب کی دنیا میں اسلامی اثرات دوسرے شعبوں کی بہ نسبت زیادہ گہرے ثابت ہوئے۔ "مقدس پیالہ" (Holy Grail) کے افسانے بے شبہ شامی سرچشموں ہی سے لیے گئے تھے۔ نصرانی مجاہدوں نے حکیم بیدپائے کے اخلاقی قصے اور الف لیلہ کی کہانیاں ضرور سُنی ہونگی، اور ان کو اپنے ساتھ وطن لے گئے ہونگے۔ چاسر (Chaucer) کی کہانی "اسکوائرز ٹیل" (Squieres Tale) اصل میں الف لیلہ ہی کی ایک کہانی ہے بوکاشیو (Boccacio) نے زبانی مشرقی قصے سن سن کر انہیں اپنی کتاب ڈی کے میران (Decameran) کی صورت میں پیش کیا۔ یورپی مبلّغوں نے عربی اور دوسری اسلامی زبانوں سے جو دلچسپی لی ہے اس کو بھی نصرانی مجاہدوں کے اثر کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔

حسب توقع فنونِ جنگ کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اثرات اور بھی نمایاں رہے ہیں۔ قوسی کمانیں، وزنی زرہ بکتر (اسے صلیبی مجاہد خود بھی پہنتے تھے اور اپنے گھوڑوں کو بھی پہناتے تھے) اور زرہ کے نیچے روئی کی گدیوں کا استعمال بھی صلیبی جنگوں کی یادگار ہے۔ اس وقت تک فرانکوں کے فوجی باجے صرف بوق اور نفیر ہی تھے لیکن شام میں فرانکوں کی فوجوں نے طبل ۔ انگریزی میں Tabor کا لفظ اسی عربی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ اور نقارہ بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ فوجی خبررسانی کے لیے انہوں نے دیسی باشندوں سے پیام رساں کبوتروں کا سدھانا سیکھا، جشن فتح کے موقع پر چراغاں کرنے کی رسم اور اسی طرح رات کے وقت مردانہ کھیلوں کا طریقہ بھی یہیں سے لیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نظام سپہ گری کا بڑا حصہ شام ہی کے میدان میں پروان چڑھا ہے۔ مسلمان مجاہدوں سے ربط کے بعد ہی سے ہتھیار بندی اور اسلحہ سے تزئین کا رواج عام ہوا۔

صلیبی لڑائیوں نے محاصرے کی تدبیروں اور چالوں، نقب اور سرنگ اندازی

کے فنون، منجنیقوں، فصیل شکن آلوں اور طرح طرح کی آتشگیر چیزوں کے استعمال کے طریقوں کو بھی فروغ دیا۔ اسی دور کے ربع آخر میں بارود شام یا لاطینی یورپ میں ایجاد ہوئی۔ غالباً اس کی ایجاد کا سہرا یورپ ہی کے سر ہے۔ چین کا یہ دعویٰ کہ اس نے بارود ایجاد کی ہے بے بنیاد ہے۔ آتشیں اسلحہ کی ایجاد جو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم چیز ہے۔ چودھویں صدی کے چوتھے دہے سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ بارود کا سب سے پہلا یورپی نسخہ ایک کتاب کے ضمیمے میں ملتا ہے جسے ۱۳۰۰ء میں مارک یونانی (Marc the Greek) نامی ایک شخص نے لکھا ہے۔ بیکن کا نسخہ غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔

نصرانی مجاہدوں نے علم و حکمت کی بہ نسبت زراعت، صنعت اور تجارت کے میدان میں کہیں زیادہ شاندار نتائج پیش کیے۔ مغربی بحیرۂ روم کے خطوں میں تل، خرنوب، باجرہ چاول، لیموں، خربوزہ، خوبانی اور عسقلان جیسے پھلوں اور اناجوں کو ان ہی صلیبی مجاہدوں کی بدولت عام رواج حاصل ہوا۔ انگریزی لفظ (Carob) خروب سے اور Lemon کا لفظ ہندی یا ملائی لفظ لیموں سے مشتق ہے۔ اور Shallot اور Scallian کے الفاظ جو فلسطینی شہر عسقلان نام کی غمازی کرتے ہیں، ابتدا میں عسقلان کی پیاز کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ ایک زمانے تک خوبانی کو "آلوچۂ دمشق" (Plums of Damascus) کہا جاتا تھا۔

اپنے قیام مشرق کے دوران میں فرانکوں کو مشرق کی لذتوں کا مزا لگ گیا تھا۔ خاص کر یہ عطریات، گرم مسالوں، مٹھائیوں اور عرب و ہند کی گرم سیر پیداواروں کے بڑے شائق ہو گئے تھے۔ عرب و ہند کی یہ گرم سیر پیداواریں، گرم مسالے، مٹھائیاں، شام کے بازاروں میں خوب بکتی تھیں۔ ان ہی چیزوں کی چاٹ نے آگے چل کر اطالوی اور سواحل بحیرۂ روم کے شہروں کی تجارت کو خوب فروغ دیا۔ لوبان اور دوسری خوشبودار چیزیں جن کی تیاری اور فراہمی میں دمشق کو امتیازِ خاص حاصل تھا۔ اور کئی قسم کے ایرانی

خوشبودار تیل اور عطر بھی مغرب میں عام طور پر مقبول ہو گئے تھے۔ مشرق کی جن نئی دواؤں سے فرانک روشناس ہوئے، ان میں قابل ذکر پھٹکری اور ایلوا ہیں۔ کالی مرچ اور اسی قسم کے دوسرے چٹپٹے مسالوں کے سوا لونگ اور دوسرے خوشبودار مسالوں کا استعمال بھی بارہویں صدی سے عام ہو گیا۔ اس وقت سے مسالہ دار کھانوں کے بغیر کوئی دعوت مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ مصر میں نصرانی مجاہدوں کے طعام نامے میں ادرک (ادرک کے لیے انگریزی لفظ Ginger عربی لفظ "زنجبیل" سے لیا گیا ہے) بھی شریک کر لی گئی۔ سب سے زیادہ اہم چیز شکر ہے۔ انگریزی زبان کا لفظ Suger عربی لفظ السکر سے لیا گیا ہے۔ جب تک یورپ والے شکر سے آشنا نہ ہوئے تھے وہ مٹھائیوں کی تیاری میں شہد استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ گنے کے پودے سے پہلے پہل شام کے اس میدانی علاقے میں روشناس ہوئے جو سمندر سے لگا ہوا ہے، اور جہاں آج بھی بچے گنا چوستے نظر آتے ہیں۔ اس پودے نے بھی ہماری گھریلو معاشیات اور دواؤں کی تیاری میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ لذائذ مشرق میں شکر پہلی چیز تھی جس سے مغرب روشناس ہوا اور اس کے ذائقہ کو یہی چیز سب سے زیادہ بھا گئی۔ پھر تو مزیدار اور خوشگوار شربت، گلاب بنفشہ اور دوسرے پھولوں کے معطر اور خوش ذائقہ عرق، ہر قسم کے قوام (انگریزی لفظ Candy عربی سے لیا گیا ہے، اور تمام مٹھائیاں شکر ہی سے تیار کی جانے لگیں۔ ململ، مشجر، اطلس اور ساٹن جیسے کپڑے بھی —— جیسا کہ خود ان کے ناموں سے ظاہر ہے —— عربی مشرق ہی سے لائے گئے تھے۔

یورپ کے سامنے سب سے پہلے نصرانی زائروں اور مجاہدوں کو مشرق میں منتقل کرنے کا مسئلہ آیا۔ پھر یہاں مشرق کی زرعی اور صنعتی پیداواروں کے بازار کھل گئے۔ ان جہلوں نے مل کر بحری اور بین قومی تجارت کے دامن اتنے وسیع کر دیے کہ رومیوں کے بعد سے اب تک تجارت کو ایسی وسعت نصیب نہیں ہوئی تھی بڑھتی ہوئی دولت کے حصہ دار اور جہازرانی کے مرکز کی حیثیت سے فرانس کا شہر مارسلیز اطالوی شہری جمہوریتوں کا حریف بن گیا۔ نئی معاشی صورت حال کی بنا پر جو بالیاتی

ضرورتیں پیش آئیں ان سے زر کی کافی رسد اور تیز گردش ناگزیر ہوگئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اس ضرورت کے نتیجے کے طور پر ہنڈی کا طریقہ ایجاد ہوا۔ جنیوا اور پیسا میں بنک قائم ہوئے اور ان کی شاخیں لیوانت (Lavant) میں بھی قائم ہوگئیں۔ ٹیمپلر ہنڈیوں کا کاروبار کرنے لگے اور انہوں نے سود اور ضمانت پر رقموں کے سودی لین دین کا کاروبار شروع کر دیا۔

صلیبی لڑائیوں کے دور کی سرگرم جہاز رانی سے دنیا کی ایک نہایت ہی اہم ایجاد کا تعلق ہے۔ یہ ایجاد قطب نما ہے۔ غالباً چینیوں نے سب سے پہلے مقناطیسی سوئی کی اس خصوصیت کو دریافت کیا تھا کہ وہ ایک ہی سمت بتاتی ہے لیکن جہاز رانی کے فن میں اس سوئی کا عملی استعمال سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے کیا تھا۔ جن کی تجارت خلیج فارس اور مشرق بعید کے درمیان ایک عرصے سے پھیل چکی تھی۔ اب اس دریافت کو انہوں نے مغرب میں منتقل کر دیا۔

اس پورے دور میں عرب سلطنت کے وسیع دامن سمٹتے جا رہے تھے اور مسلمانوں کا ذہن بھی اپنی جودت اور بداعت کھوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں مرد یورپ پر ایک ایسی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے جو بڑے ڈرامائی انداز سے پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم عرب سلطنت کے مرد بیمار کے دنیا سے اُٹھنے سے پہلے شاہی مصری خاندان نے اس کو سنبھالا دینے کی آخری کوشش کی تھی۔

---

# ۱۸۔ آخری عرب حکمراں خاندان

## مَملُوک

قرون وسطیٰ کی دنیائے عرب کا آخری حکمراں خاندان جو مملوک کے نام سے مشہور ہے، غیر معمولی اوصاف اور خوبیوں کا حامل تھا۔ مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم وملت کی تاریخ میں ایسے خاندان کا ظہور اور اس کی ترقی کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ مملوک اصل میں مختلف نسلوں اور مختلف قوموں سے خریدے ہوئے غلام تھے۔ ان زرخرید غلاموں نے غیر ملک میں اپنی ایک فوجی عدید یہ بنالی تھی۔ تاریخ اسلام میں یہ لوگ نہ صرف اس لیے قابل ذکر ہیں کہ یہ ایک طرح سے عربوں کی سماجی زندگی میں صدیوں کی عیاشی کا منطقی نتیجہ اور اس کا آخری نقطہ ہیں۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اُنھوں نے بڑی ہی شاندار خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہ غلام سلاطین بہر صورت اس کے مستحق ہیں کہ ان کے متعلق عرب مملکت کی تاریخ کے خاتمہ پر ایک مستقل باب لکھا جائے

ان مملوکوں میں ایوبی خاندان (۱۱۷۱ء۔ ۱۲۵۰ء) ہے جس کی بنیاد سلطان صلاح الدین ایوبی نے رکھی تھی۔ ان کے بعد ترک غلام آئے اور اُنھوں نے سنہ ۱۲۵۰ء سے لے کر سنہ ۱۳۸۲ء تک حکومت کی۔ ان کے بعد برجی اور چرکسی غلاموں کی حکومت سنہ ۱۳۸۲ء سے لے کر سنہ ۱۵۱۷ء تک چلی۔

مملوکوں نے اپنی شامی مصری سلطنت کو رہے سہے نصرانی مجاہدوں کے وجود سے بالکل پاک کر لیا۔ اسی خاندان نے ہلاکو اور تیمور کے خوفناک منگولی جتھوں کی پیش قدمیوں کو ہمیشہ کے لیے روک دیا۔ ان کی یہ پیش قدمیاں اگر روکی نہ جاتیں تو شاید مغربی ایشیا اور

مصر کی تاریخ اور ثقافت کا رُخ ہی بدل گیا ہوتا۔ ان پیش قدمیوں کی روک تھام کی بدولت مصر اس تباہی و تاراجی سے محفوظ رہا جس تباہی اور بربادی سے شام و عراق کو دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح مصر کے ثقافتی اور سیاسی اداروں میں تسلسل باقی رہا اور یہ نعمت عرب سے باہر کسی دوسری اسلامی سرزمین کو نصیب نہ ہو سکی۔ دنیا کے ایک انتہائی پُرآشوب خطہ پر مملوک تقریباً پونے تین سو سال تک (۱۲۵۰ء-۱۵۱۷ء) قابض و متصرف رہے۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے نسلی طور پر اپنے آپ کو ممتاز رکھا اور دوسری نسلوں کے ساتھ گھل مل کر اپنی نسل کو معدوم نہیں کیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجموعی حیثیت سے ناشائستہ اور ظالم تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کا جتنا اعلیٰ مذاق انہیں ملا تھا وہ یقیناً دنیا کے ہر شائستہ حکمراں خاندان کے لیے باعثِ فخر ہو سکتا ہے چنانچہ اسی اعلیٰ مذاق کی وجہ سے آج بھی قاہرہ کا شہر دنیائے اسلام کا ایک حسین و جمیل خطہ بنا ہوا ہے ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم عثمانی نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں سے آخری خاندان تھا جو عربی خلافت کے کھنڈروں پر ضیا پاشی کر رہے تھے۔ اسی خاندان نے ایک نئی اور غیر عربی خلافت یعنی ترکوں کی خلافت عثمانیہ کے لیے راستہ صاف کیا۔

مملوک خاندان کا سب سے مشہور اور ممتاز ترین سلطان اور مملوک سلطنت کا حقیقی بانی الملک الظاہر رکن الدین بیبرس (۱۲۶۰ء-۱۲۷۷ء) ہوا ہے۔ مملوکوں سے پہلے مصر کا حکمراں خاندان بغداد کے اولین خلفاء کی تقلید میں اپنے محافظ دستوں میں غیر ملکی غلاموں کو بھرتی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا بھی آخر کار وہی نتیجہ ہوا جسے بغداد کے آلِ عباس کی آنکھیں دیکھ چکی تھیں۔ چونکہ یہ غلام اپنے آقاؤں سے زیادہ قابل اور طاقتور ہوتے تھے۔ اس لیے یہ فوج کے امیر اور پھر مصر کے سلطان بن گئے۔ بیبرس بھی ایک ترکی غلام تھا۔ سلطانِ وقت نے اپنے ایک محافظ دستے کی کمان اس کے

سپرد کی تھی ۔ اس عہدے سے ترقی کرتے کرتے بیبرس نے مصر کے عظیم ترین عہدے یعنی سلطانی تک رسائی حاصل کرلی ۔ یہ سچ ہے کہ اس نے جبر و استبداد اور خونریزی کے ذریعہ مصر کے تخت و تاج پر قبضہ جمایا تھا ۔ لیکن اس زمانے کی زوال پذیر دنیائے عرب کی اصطلاح میں اس نے "مصاف زندگی میں اپنے ذاتی جوہر دکھا کر یہ فیروز مندی حاصل کی"۔ مملوک خاندان میں نہ تو جانشینی کا کوئی اصول مقرر تھا اور نہ کسی کا ادعائے حکومت حق بجانب سمجھا جاتا تھا ۔ حکومت صرف اسی کو مل سکتی تھی جو سب سے زیادہ طاقت ور ہوتا تھا ۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مسلسل تین سو سال تک سب سے زیادہ طاقتور اور اقتدار غلاموں یا ان کی اولاد ہی کو حاصل رہا ۔ خود بیبرس اونچا پورا آدمی تھا ۔ اس کا رنگ سانولا اور آواز رعب دار تھی ۔ قیادت کے تمام حقیقی صفات اس کی ذات میں موجود تھے ۔

بیبرس کی سب سے پہلی امتیازی کامیابی وہ ہے جو اسے فلسطین میں منگولوں کے مقابلے میں حاصل ہوئی ۔ نصرانی مجاہدوں کے ساتھ اس کی جو متعدد لڑائیاں ہوئیں وہی بڑی حد تک اس کی عظمت و شہرت کا سبب بنیں ۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں ۔ بیبرس کے ان ہی معرکوں نے فرانکوں کا سارا زور ختم کر کے رکھ دیا تھا ۔ اسی زمانے میں اس کے فوجی امیروں نے اس کی سلطنت کے دامن مغرب میں برقہ اور جنوب میں نوبیا کے آگے تک پھیلا دیے تھے ۔ اور اب اس وسیع سلطنت پر سلطان مصر مستقل طور پر قابض و متصرف تھا ۔

بیبرس صرف ایک فوجی قائد ہی نہ تھا بلکہ اس میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں اس نے نہ صرف فوجوں کو منظم کیا ، بحری بیڑے کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور شام کے قلعوں کو مستحکم بنایا بلکہ نہریں کھدوائیں ، بندرگاہوں کو درست کرایا اور قاہرہ اور دمشق کے درمیان ایسا فوری بریدی نظام قائم کیا جس کی مدد سے قاہرہ سے

دمشق صرف چار روز کے اندر خط پہنچ جایا کرتے تھے۔ قاہرہ اور دمشق کے درمیان ڈاک کی ہر چوکی پر گھوڑوں کی ایک جوڑی تیار کھڑی رہتی تھی۔ تقریباً ایک ہی ہفتہ کے اندر سلطان ان دونوں شہروں میں چوگان کھیل سکتا تھا۔ معمولی ڈاک کے سوا مملوکوں نے کبوتر ڈاک کو بھی انتہائی منظم کیا تھا۔ فاطمی دورِ حکومت کی طرح اس دور میں بھی پیام رساں کبوتروں کے شجروں کے خاص رجسٹر تیار کیے گئے تھے۔

بیبرس نے بہت سے رفاہی کام بھی انجام دیے۔ اس نے مسجدوں کو آراستہ کیا اور مذہبی اور خیراتی اوقاف قائم کیے۔ اس کی تعمیری یادگاروں میں قاہرہ کی جامع مسجد اور مدرسہ دونوں اب بھی موجود اور اسی کے نام سے موسوم ہیں۔ مسجد کو نپولین نے قلعہ بنا لیا تھا۔ اور بعد میں برطانیہ کی قبضہ گیر فوج نے اس میں رسد کا محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ مصر کا یہی وہ پہلا سلطان ہے جس نے فقہ کے چار مکتبوں کے لحاظ سے چار قاضیوں کا تقرر کیا تھا۔ اور مصریوں کے لیے حج بیت اللہ کا نہایت معقول اور مستقل انتظام کیا تھا۔ اس کی دینداری، اس کی حمیت اور صلیبی لڑائیوں میں اس کی اسلام کے لیے بیش بہا خدمات، غرض ان سب باتوں نے مل کر اس کو شہرت و عظمت میں ہارون رشید کا مدِمقابل بنا دیا ہے۔ روایتی تاریخوں میں اس کا نام سلطان صلاح الدین کے نام سے بھی کہیں زیادہ تابناک نظر آتا ہے۔ عرب مشرق میں بیبرس اور عنترہ کا فسانہ الف لیلہ کے افسانوں سے بھی زیادہ مقبول ہے۔

بیبرس کے عہد حکومت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سلطان بیبرس نے منگولوں اور یورپی سلطنتوں سے معاہدے طے کیے۔ حکومت پر قبضہ کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد بیبرس نے وادی گنگا کے منگولوں یعنی قپچاقی قبیلہ ۔ زریں گروہ ۔ کے سب سے بڑے سردار سے رشتہ اتحاد قائم کر لیا۔ اسی طرح ارغون کے والی جیمیس James (of Arragon)، اشبیلیہ کے والی الفانسو کے سوا صقلیہ کے حاکم لوئی نہم کے بھائی

چارلس انجو (Charles of Anjon) کے ساتھ تجارتی عہد نامے طے کیے۔

بیبرس کے دور حکومت کا سب سے اہم قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ اس نے عباسی خلفاء کے نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ یہ صرف نام کے خلیفہ تھے اور ان کے ہاتھ میں نام کو بھی اقتدار نہ تھا۔ اس سے سلطان کا یہ مقصد تھا کہ اس کے تخت وتاج کو شرعی جواز اور مسلمانوں کی نظروں میں اس کے دربار کو ایک طرح کا بلند مقام حاصل ہو جائے۔ اس کے سوا اس طرح وہ ان شیعی سازشوں کا بھی خاتمہ کرنا چاہتا تھا جو فاطمی دور کے بعد سے خاص طور پر مصر میں کافی زور پکڑتی چلی آرہی تھیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے سلطان نے جون ۱۲۶۱ء میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے ایک چچا کو جو بغداد کے قتل عام سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا، دمشق سے اپنے پاس بلایا اور اس کو پورے آداب و رسوم اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ مسند نشین کرایا۔ سب سے پہلے فقہا کی ایک مجلس سے اس خلیفہ کے حسب ونسب کی صحت کی نسبت فیصلہ صادر کرایا گیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کے نام کے سکے ڈھالے گئے۔ اسے خلیفہ مستنصر کا لقب دیا گیا۔ اس کے جلوس میں یہودی و نصرانی بھی توریت اور انجیل اونچی اُٹھائے چل رہے تھے۔ اس کے بعد سلطان نے اس کٹھ پتلی خلیفہ سے اپنے لیے مصر وشام، حجاز و یمن اور ارض فرات کی حکومت کی سند لکھوائی۔ اس کے تین مہینے بعد بیبرس اپنے خلیفہ کو بغداد میں دوبارہ مسند نشین کرانے کے ارادے سے بڑے کروفر کے ساتھ قاہرہ سے نکلا لیکن دمشق پہنچنے کے بعد بیبرس نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ بغداد کے منگولی عامل نے جب اس کٹھ پتلی اور بے یار ومددگار خلیفہ کی آمد کا حال سُنا تو ریگستان ہی میں خلیفہ پر حملہ کر دیا۔ پھر دنیا کو اس خلیفہ کا کچھ حال معلوم نہ ہوا لیکن اس کے بعد ڈھائی سو سال تک اس قسم کے دعویدار خلیفہ مصر وشام کی بساطِ سیاست پر یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے رہے۔ یہ صرف اسی حد تک خلیفہ تھے کہ ان کے نام کے سکے ڈھالے جاتے اور جمعہ کے خطبہ میں ان کا نام پڑھا جاتا تھا۔

۱۵۱۷ء میں ترکی سلطان سلیم نے مصر کو مملوکوں کے ہاتھ سے چھین لیا تو اس سلسلہ کے آخری خلیفہ المتوکل کو اپنے ساتھ قسطنطینہ لے گیا۔

مصر کی تاریخ کا احیا اس کے ایسے قابل فخر اور فیروزمند فرمانرواؤں کے دور سے ہوتا ہے جنہوں نے دیار شام کے دامنوں کو فرانکوں کی سلطنت کی باقیات سے بالکل پاک کر دیا۔ ان حاکموں نے منگولی حملہ آوروں کا نہایت مردانگی اور کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن اس دور کے آخر میں فوج اور صاحب اقتدار جماعت کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے۔ اس کے سوا کھوٹے سکوں کے چلن محصول کی بھاری شرح، جان و مال کا عدم تحفظ، اور کبھی کبھی وبا اور قحط کے دوروں اور آئے دن کی بغاوتوں کے ہاتھوں مصر اور اس کے زیر فرمان شام کا ملک دونوں کے دونوں تقریباً پوری طرح تباہ و برباد ہوگئے۔ خاص کر وادی نیل میں تو اوہام پرستی اور جادو ٹونے کا بڑا دور دورہ تھا۔ اور اندھی تقلید نے ایسی چیزوں کو خوب پروان چڑھایا تھا۔ ان حالات میں کسی اعلیٰ ذہنی کارنامے کی توقع ہی فضول ہے۔ سچ پوچھیے تو تیرہویں صدی کی ابتدا ہی سے پوری عرب دنیا اپنی ذہنی برتری سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ذہنی برتری وہ تھی جسے عرب دنیا آٹھویں صدی سے سنبھالے لیے چلی آ رہی تھی۔ سالہا سال کی جدوجہد کے نتیجے کے طور پر ذہنی تکان اور دولت و قوت کی فراوانی کے نتیجے کے طور پر اخلاقی فساد ملک کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا تھا۔

تیرہویں صدی کے بعد سے عربوں کے ہاتھ میں سائنس کے صرف دو شعبوں یعنی ہیئت اور ریاضی کی قیادت باقی رہ گئی تھی۔ ہیئت و ریاضی میں علم مثلث، طب اور خاص کر علم بصریات بھی شامل ہے۔ طب میں ابن النفیس کا نام سب سے ممتاز ہے۔ اس نے دمشق میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ابن النفیس نے قاہرہ کے ایک شفا خانے کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے بعد ۱۲۸۹ء

میں بمقام دمشق وفات پائی۔ عام طور پر دورانِ خون کی دریافت کا سہرا سرفیتس (Servetus) نامی ایک پرتگالی کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ دورانِ خون کے متعلق سرفیتس سے بھی تین سو سال پہلے ابن النفیس دنیا کے آگے واضح تصوّر پیش کر چکا تھا۔ اس دور میں بہت سی ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں جنسی اور نسوانی بیماریوں کے مباحث ہوتے تھے۔ ان کتابوں کی حیثیت وہی تھی جسے آج کل ہم "جنسی ادب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تقریباً ہر دور کا وہ عربی ادب جو مردوں کی صنف سے متعلق ہے ایسے ایسے لطائف و ظرائف سے معمور ہے جسے آج کل کا مذاق سلیم گوارا نہیں کر سکتا۔

اگرچہ عہد مملوک کی تاریخ آہنگ فولاد سے معمور اور خون کی سرخی سے رنگین ہے، لیکن حیرت انگیز خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود اس دور میں حد درجہ حسین و جمیل عمارتیں تیار ہوئیں اور غیر معمولی صناعی کا مظاہرہ ہوا۔ یہ کام ایسے وسیع پیمانے پر ہوئے کہ معیار اور نوعیت کے اعتبار سے مصر کی تاریخ بطلیموس اور فراعنہ کے دور کے بعد سے ان کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ تیرہویں صدی عیسوی میں جب منگولوں کی تاخت و تاراج شروع ہوئی تو مغلوب موصل، دمشق اور بغداد کے مسلمان فن کار اور صناع بھاگ کر مصر میں پناہ لینے لگے۔ اس طرح مملوکوں کے مکتب تعمیر کاری پر جدید شامی عراقی اثرات مرتب ہونے لگے۔ صلیبی لڑائیوں کے خاتمہ کے بعد مملوکوں نے شمال کے سنگی تعمیر کے علاقوں تک پھر ایک بار رسائی حاصل کر لی اور اب مسجدوں کے میناروں کی تعمیر میں اینٹ کی جگہ پتھر استعمال ہونے لگے۔ مدرسے والی مسجدوں کے چلیپائی نقشے کو نہایت خوبی اور کمال کے ساتھ ترقی دی گئی۔ عمارتوں میں ایسے گنبد تعمیر ہونے لگے جو اپنے سبک پن، خاکے کی دل آویزی اور تزئین اور آرائش کی لطافت میں بے نظیر تھے۔ پتھر میں

نقاشی کی وہ طرز جس میں مختلف رنگ کے پتھروں کو ترتیب کے ساتھ جمایا جاتا ہے اور جو رومیوں یا بازنطینیوں کی ایجاد ہے، مصری فن تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی تھی۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے فن تزئین و آرائش کی دو مشہور طرزوں یعنی ہندسی گلکاری اور خط کوفی ــــ تمام اسلامی دوروں میں مصر اور شام نے اندلس اور ایران کے مقابلہ میں جانداروں کی تصویروں کو بہت کم استعمال کیا ہے ــــ کے علاوہ گنبدوں کے کروی حصے میں قلمی آرائش کی طرز کے فروغ و ترقی کے لیے بھی مشہور رہے۔ خوش بختی سے مملوکوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کے نفیس ترین نمونے زمانے کے دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں اور آج بھی یہ عمارتیں عالم و سیاح دونوں کے لیے مرکزِ جذب و کشش بنی ہوئی ہیں۔

چودھویں صدی کے آخر پر مملوکوں کا عہد شامی مصری تاریخ کا ایک بدترین باب بن گیا۔ اس دور کے اکثر سلطان ظالم، خونخوار، دغا پیشہ، بعض نااہل بلکہ حد یہ کہ ذلیل اور ناشائستہ گزرے ہیں۔ ۱۴۱۲ء سے لے کر ۱۴۲۱ء تک مصر ایک پرلے درجہ کے میخوار ــــ المؤید الشیخ ــــ کے زیرنگیں رہا۔ یہ سلطان غلام تھا۔ اسے سلطان برقوق نے ایک چرکسی بردہ فروش سے خریدا تھا۔ اس کی زندگی بڑی بدعنوانیوں اور زیادتیوں سے داغدار ہے۔ ایک اور سلطان یعنی برسبائی (۱۴۲۲ء۔ ۱۴۳۸ء) عربی زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے اپنے دو طبیبوں کے ہاتھ اس لیے کٹوا دیے کہ وہ اس کے ایک نہایت خطرناک مرض کا علاج کرنے سے عاجز رہے تھے۔ ایک اور سلطان یعنی اینال (۱۴۵۳ء ــــ ۱۴۶۰ء) جو خود بھی سلطان برقوق کا غلام تھا، لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھا۔ سرکاری کاغذوں پر اس کا معتمد جو کچھ لکھ دیتا اس پر سلطان اپنا قلم پھیر دیتا تھا۔ بیبرس کی طرح اس کا دامن بھی امرد پرستی کے الزام سے پاک نہیں۔ مملوکوں کی سرپرستی میں غلمانوں کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا۔ غلمانوں کی یہی لعنت عباسی خلفاء کے لیے ایک بدترین مصیبت ثابت ہو چکی تھی۔ ایک اور مملوک سلطان یعنی اینال کا تیسرا بیٹا

یلبائی (۱۴۶۷ء) نہ صرف جاہل تھا بلکہ اس کے ہوش وحواس تک ٹھکانے نہ تھے۔ ایک اور سلطان یعنی قائت بائی (۱۴۶۸ء۔۱۴۹۵ء) نے جسے برسبائی نے پچاس دینار میں خریدا تھا، ایک کیمیاگر علی بن الموشوشی کی آنکھیں نکلوادی تھیں اور زبان کھنچوادی تھی کیونکہ وہ کسی دھات کو سونے میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

مملوک سلاطین کی خودغرض حکمت عملی کی وجہ سے ملک کی معاشی صورتِ حال اور بھی بگڑتی چلی جارہی تھی۔ مثال کے طور پر سلطان برسبائی نے ہندوستان سے گرم مسالے اور کالی مرچ کی درآمد ممنوع قرار دے دی اور اس ملک میں گرم مسالوں کی بڑی مانگ تھی۔ پھر ان چیزوں کی قیمتیں بڑھنے سے پہلے ملک میں ان کا جتنا کچھ بھی ذخیرہ موجود تھا اُسے اکٹھا کرلیا اور اُسے اپنی رعایا کے ہاتھ کافی نفع کے ساتھ فروخت کردیا۔ اس نے شکر کی صنعت کا اجارہ بھی لے لیا تھا اور صرف نفع کمانے کے لیے ایک عرصہ تک ملک میں گنّے کی کاشت کی ممانعت کردی تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں مصر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ایک ایسی وبا پھوٹ پڑی جس کے علاج کے لیے خاص طور پر شکر کی بڑی ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ وبا چودھویں صدی کے یورپ کی "کالی وبا" (Black death) یعنی طاعون جیسی تباہ کن نہ تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ تین مہینے کے اندر صرف دارالسلطنت کی تین لاکھ آبادی اس وبا کی نذر ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وبا مسلمانوں کے گناہوں کی پاداش میں پھیلی ہے۔ اس لیے سلطان برسبائی نے حکم دیا کہ کوئی عورت اپنے گھر سے باہر قدم نہ نکالے۔ دوسری طرف اس نے یہودیوں اور نصرانیوں پر نئے نئے محصول عائد کرکے ان گناہوں کا کفارہ کرنے کی کوشش کی۔

یہاں یہ واضح رہے کہ نئے اور زائد محاصل صرف غیرمسلموں ہی سے وصول نہیں کیے جاتے تھے۔ مالگذاری کی تشخیص کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ ہونے کی

وجہ سے یہ سلاطین اپنی فوجی مہموں، مسرفانہ درباداریوں اور یادگاری عمارتوں کی تعمیر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی رعایا اور اپنے عہدہ داروں سے جبراً اور من مانے روپیے وصول کرلیا کرتے تھے۔ سرکاری عہدہ داروں کی حالت یہ تھی کہ یہ خود بھی رعایا کو لوٹ کھسوٹ کر کافی مالدار ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ڈلٹا اور مشرقی ریگستان کے لٹیرے بدوی مصری تنگ زرعی وادی میں آباد فلاحوں پر پے در پے چھاپے مار مار کر اس حصّہ کو تباہ و برباد کرتے جاتے تھے۔ وباؤں کی طرح ٹڈی دل کی بلا بھی خاص خاص موسموں میں ملک پر نازل ہوتی رہتی تھی۔ قحط کثرت سے پڑنے لگے تھے۔ خاص کر وباؤں کے زمانے میں اور اس وقت جب دریائے نیل میں پانی کم ہوجانے کی وجہ سے خشک سالی رونما ہوجاتی تھی تو ان قحطوں کی ہلاکت آفرینیاں اور بھی بڑھ جاتی تھیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ مملوکوں کے دور حکومت میں مصر اور شام کی آبادی کا ایک تہائی حصّہ گھٹ گیا تھا۔

اس دور کے خاتمہ پر چند بین قومی عوامل نے بھی ملک کے افلاس میں اضافہ کرنا شروع کردیا تھا۔ ۱۴۹۷ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما نے راس اُمید کے اطراف بحری راستہ دریافت کرلیا تھا اور شامی مصری سلطنت کی تاریخ میں یہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔ اب نہ صرف بحیرۂ احمر اور بحر ہند میں مسلمانوں کے جہازوں پر پرتگالی اور دوسرے یورپی بیڑوں کی تاختیں عام ہوگئی تھیں بلکہ گرم مسالوں اور عرب و ہند کی دوسری گرم سیر پیداواروں سے لدے ہوئے جہازوں کا رُخ بڑی حد تک شام و مصر کی بندرگاہوں سے پھر گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہوکر رہ گیا۔

پندرھویں صدی کی ابتدا میں درندگی میں مملوکوں سے کہیں زیادہ بڑھے چڑھے ایک انسان نما درندے نے ملک شام کو روند ڈالا۔ تیمور لنگ ۱۳۳۶ء کے قریب ماوارالنہر

میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے اسلاف میں کوئی شخص چنگیز کے بیٹے کا وزیر رہ چکا تھا لیکن اس کا خاندان خود چنگیز کی اولاد ہونے کا دعوئی دار ہے۔ ایک ہجو نگار مصنف (ابن عرب شاہ) نے تیمور کی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس مصنف نے بتایا ہے کہ تیمور ایک گڈریے کا بیٹا تھا۔ یہ پہلے پہل لوٹ مار اور ڈاکوں پر اپنی گزران کیا کرتا تھا۔ ایک بار بھیڑیں چرانے پہنچا تو پکڑا گیا، اور اس کی ایسی پٹائی ہوئی کہ ایک گہرے زخم کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ اس وقت سے اس کا لقب "لنگ" یعنی لنگڑا پڑ گیا۔ ۱۳۸۰ء میں تیمور نے اپنے غول کو لے کر شہروں اور ملکوں پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ افغانستان، ایران اور کردستان پر اس نے قبضہ کر لیا۔ ۱۳۹۳ء میں وہ بغداد پر بھی مسلط ہو گیا۔ اور اسی سال کے آخر میں عراق کو لوٹ لیا۔ سلطان صلاح الدین کے مولد تکریت میں اس نے مقتولوں کے سروں کا ایک مخروطی مینار بنایا۔ ۱۳۹۵ء میں حدود والگا تک ہلّہ بول دیا۔ اور ایک سال سے زیادہ عرصہ تک ماسکو پر قابض رہا۔ تین سال کے بعد شمالی ہندوستان کو اس نے پامال کیا اور دہلی کے اسی ہزار باشندوں کا قتل عام کیا۔

۱۴۰۱ء میں تیمور کے غول آندھی کی طرح شام کے شمالی حصہ پر جھپٹ پڑے اور شہر حلب میں مسلسل تین دن تک لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے رہے۔ اس شہر کے بیس ہزار سے زیادہ مسلمان باشندے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے اور مقتولوں کے سروں کے پانچ گز اونچے اور بیس گز قطر کے کئی مینار بنائے گئے۔ ان میناروں میں مقتولوں کے چہروں کا رُخ باہر کی طرف رکھا گیا تھا۔ یہاں کی بے بہا مسجدوں اور مدرسوں کو کچھ اس طرح مسمار کیا گیا کہ وہ دوبارہ تعمیر ہونے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس کے بعد حماۃ، حمص اور بعلبک کے شہر تیمور کی درندگی کا نشانہ بنے۔ دمشق کی مصری فوج نے بُری طرح شکست کھائی اور شہر پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ تاہم قلعہ والوں نے مسلسل ایک مہینے تک مقابلہ کیا۔ شہر دمشق کو آگ لگا دی گئی اور اس نام نہاد مسلمان مغل درندے نے

اپنے شیعی علماء سے اس قتل و غارت گری کے جواز کا فتویٰ حاصل کیا۔ مسجد امیہ کو مسمار کر دیا۔ اور دیواروں کے سوا اس کی کوئی چیز باقی نہ چھوڑی گئی۔ یہ خونخوار بھیڑیا اپنے چند سرداروں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے بغداد پر جھپٹا اور ایسا قتل عام کیا کہ مقتولوں کے سروں کے ایک سو بیس مینار کھڑے کیے گئے۔

بعد کے دو سالوں کے دوران میں تیمور نے ایشیائے کوچک پر دھاوا کر کے ۲۱۔ جنوری ۱۴۰۲ء کو عثمانی نوجوں کو انقرہ کے مقام پر فاش شکست دی اور سلطان بایزید اول کو گرفتار کر لیا۔ تیمور نے پائے تخت بروسہ اور ازمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ مملوکوں کی سلطنت کی عین خوش بختی تھی کہ دو سال کے بعد خود تیمور موت کا شکار ہو گیا۔ اس وقت وہ چین کی طرف ایک زبردست حملے کے ارادے سے کوچ کر رہا تھا۔ تیمور کے جانشین اپنے اندرونی جھگڑوں میں کچھ ایسے اُلجھے کہ ان کی ساری توانائیاں انہی جھگڑوں میں صرف ہونے لگیں۔

یہ عثمانی ترک ہی تھے جنہوں نے عرب سلطنت کی جڑوں پر سولھویں صدی کی ابتدا میں آخری فیصلہ کن ضرب لگائی۔ ان ترکوں کا وطن منگولیا تھا۔ وسط ایشیا کے ایرانی قبیلوں کے ساتھ مخلوط ہو کر یہ ایشیائے کوچک میں در آئے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنے عمزاد بھائیوں یعنی سلجوقیوں کو بتدریج اپنے اندر جذب کر کے انہیں حکومت سے بیدخل کر دیا۔ اور پھر چودھویں صدی کی ابتدا میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ ۱۴۸۱ء میں سلاطین مصر اور عثمانی ترکوں کے درمیان شدید چشمک شروع ہو گئی۔ ان دونوں سلطنتوں کی باہمی رقابت پہلے پہل ایشیائے کوچک اور شام کی سرحدوں پر اس طرح شروع ہوئی کہ ان کے جہاز ایک دوسرے پر پے در پے حملے کرنے لگے۔ پھر یہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی چلی گئی اور اتنی تیز ہوئی کہ ۲۴۔ جنوری ۱۵۱۶ء کو عثمانی ترکوں اور مملوکوں کی فوجیں حلب کے قریب ایک دوسرے سے بھڑ گئیں۔ مملوک فوجوں کی قیادت قانصوہ الغوری (۱۵۰۰-۱۶ء) نے

کر رہا تھا۔ ترکوں نے مملوکوں پر مکمل فتح پائی۔ ترکی فوج جدید آلات حرب جیسے توپ خانوں تفنگوں اور دوسرے دور مار ہتھیاروں سے لیس تھی۔ ان کے مقابلے پر مملوکوں کی فوج بدوی اور شامی رسالوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ نئے ہتھیاروں کے استعمال کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک عرصے سے ترک بارود استعمال کرتے چلے آرہے تھے لیکن شامی مصری اسی پرانی لکیر کو پیٹ رہے تھے کہ مقابلہ کی لڑائی میں فیصلہ کن عنصر صرف ذاتی شجاعت ہی ہے سلطان سلیم شہر حلب میں فاتحانہ داخل ہوا اور وہاں کے باشندوں نے مملوکوں کے ظلم اور ان کی زیادتیوں سے نجات دلانے والے کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اب شام کا ملک ترکوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ یہاں سے ترک فاتح جنوبی مصر پر آدھمکے۔ ایک سال کے بعد یعنی ۱۵۱۷ء میں مملوک سلطنت کا تختہ ہمیشہ کے لیے اُلٹ دیا گیا۔ سلطان صلاح الدین کے زمانے سے قاہرہ مشرقی اسلام کا مرکز بنا ہوا تھا، لیکن اب اس کی وہ شان باقی نہیں رہی۔ بلکہ وہ سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبائی شہر بنا دیا گیا۔ مکہ اور مدینہ کے شہر خود بخود ترکی سلطنت میں شامل ہوگئے۔ مصر کے خطیب جمعہ کے خطبہ میں سلطان سلیم کے لیے خدا سے ان الفاظ میں دعا مانگنے لگے:

"وانصر اللہ السلطان بن السلطان مالک البرین والبحرین، کاسر الجیش، وسلطان العراقین وخادم الحرمین الشریفین، الملک المظفر سلیم شاہ اللھم انصرہ نصراً عزیزاً، وافتح لہ فتحاً مبیناً، یا مالک الدنیا والآخرہ یا رب العالمین!"

بیان کیا جاتا ہے کہ آخری کٹھ پتلی خلیفہ المتوکل نے اپنا منصب خلافت عثمانی سلطان کو سونپ دیا تھا، لیکن اب تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ قسطنطینہ کے ترکی سلطان نے منصب خلافت پر بتدریج قبضہ کر کے اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا۔ اگرچہ سلیم کے بعض جانشین اپنے آپ کو خلیفہ مشہور کرتے رہے اور خلیفہ کے لقب سے

مخاطب بھی ہوتے رہے، لیکن اس لقب کی حیثیت ایک اعزازی لقب کی سی تھی اور اس لقب کو ترکی سلطنت کی حدود کے باہر کوئی تسلیم نہ کرتا تھا۔ اولین سیاسی دستاویز جس میں عثمانی سلطان پر خلیفہ کی اصطلاح کا اطلاق کیا گیا اور اسے ترکی سلطنت کے باہر بھی مسلمانوں کا مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا گیا، وہ روسی ترکی معاہدہ ہے جو ۱۷۷۴ء میں طے ہوا تھا۔

قسطنطینہ کا ترکی سلطان رفتہ رفتہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ طاقتور حکمران بن گیا۔ وہ نہ صرف بغداد کی میراث خلافت پر قابض ہو گیا بلکہ بازنطینیہ کی میراث شہنشاہیت بھی اس کے قبضہ میں آگئی تھی۔ مملوکوں کی سلطنت کی تباہی اور باسفورس کے کنارے ترکی سلطنت کے قیام کی وجہ سے اسلامی اقتدار کا محور مغرب میں منتقل ہو گیا۔ یوں بھی اب تمدن عالم کا مرکز مغرب میں منتقل ہو چکا تھا اور ادھر امریکہ اور راس امید کی دریافت سے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان تمام اسباب کی بنا پر عربی خلافت اور وہ تمام چھوٹی چھوٹی اسلامی سلطنتیں جو عربی سلطنت کے کھنڈروں پر قرون وسطیٰ میں قائم ہو گئی تھیں ان سب کی تاریخ تمام ہو جاتی ہے اور پوری دنیائے عرب پر عثمانیوں کے اقتدار کا دور شروع ہوتا ہے۔

---

# ۱۹۔ عربوں کا مستقبل

قرونِ وسطیٰ اپنے تمام تاریک زمانوں کے باوجود عرب ملکوں پر اندھیرا نہ کر سکے لیکن عہدِ حاضر نے ان ملکوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیا۔ عثمانی دورِ اقتدار ۱۵۱۷ء سے شروع ہو کر مسلسل چار سو سال تک باقی رہا اور اس پورے دور میں پورا عرب مشرق تنزل و انحطاط کی منزلیں طے کرتا رہا۔ عثمانی ترکوں نے نہ صرف عرب ملکوں کو فتح کیا بلکہ قفقاز سے لے کر ویانا کے دروازوں تک سارے علاقوں پر وہ اپنے دار السلطنت قسطنطینیہ میں بیٹھے حکومت کرتے رہے۔ بحیرۂ روم کے پورے رقبہ پر ان ہی کا جھنڈا لہراتا رہا۔ اور مسلسل چار سو سال تک مغربی یورپ کی بساطِ سیاست پر وہ ایک زبردست مہرہ بنے رہے۔ اس دوران میں مدینہ، دمشق، بغداد اور قاہرہ جیسے شہر جو کسی زمانے میں عظیم الشان سلطنتوں کے دار السلطنت اور تہذیب و تمدن کے پرشکوہ مرکز رہ چکے تھے، اب پستی اور زوال کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اب یہ شہر قسطنطنیہ سے بھیجے ہوئے عاملوں اور محافظ فوجوں کے مستقر بنا لیے گئے۔ اسی شہر قسطنطینیہ سے جس کی دیواروں نے دمشق اور بغداد سے اُمنڈتے ہوئے عربی لشکروں کے سیلاب تاریخ کے چار یادگار موقعوں پر کامیاب مقابلہ کیا تھا۔ اب اقتدار کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باسفورس کے کنارے آباد شہر پر اپنی ضیا پاشیوں کے ساتھ دمک رہا تھا۔

ترکی سلاطین نے اپنی مملکت کی حدود میں عربوں کے سوا بے شمار مختلف وضع اور مختلف خیال قوموں، مذہبی فرقوں اور لسانی وحدتوں کو تلوار کے بل پر متحد کر رکھا تھا۔ مفتوحہ قومیں مشترکہ طور پر ان ترکی سلطانوں کے عائد کیے ہوئے بھاری محصولوں

اوران کی ظالمانہ حکومت کا نشانہ بنی رہیں۔ اگر ان حالات میں عربی بولنے والی قومیں تخلیقی آرٹ، سائنس یا ادب کا کوئی شاہکار دنیا کے آگے نہ پیش کر سکیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

اس زمانے میں جبکہ ترکوں نے اپنی سلطنت کی جڑیں مضبوط کر لی تھیں، دنیائے عرب جس کے دامن کبھی ایران سے لے کر اسپین تک پھیلے ہوئے تھے، اپنی موجودہ حدوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ ایرانی قومیت اور ایرانی زبان دونوں پھر سے زندہ ہو گئے اسپین ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل گیا۔ شمالی افریقہ، مصر، جزیرہ نمائے عرب اور عرب کی ہلال نما شاداب سرزمین ۔ بحر الکاہل سے لے کر بحیرۂ فارس تک کا متصل علاقہ ۔ ان سب ملکوں نے صرف عربی زبان اور اسلامی کردار ہی کو برقرار رکھا اور آج ان کی زندگی کے بس یہی دو اثاثے محفوظ و سلامت رہ گئے ہیں۔

ان ملکوں میں سب سے پہلے مصر نے اپنے اندر ایک نئی زندگی ۔ قومیت اور مادی نشاۃ ثانیہ ۔ کی تڑپ محسوس کی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں نپولین کا جو حملہ مصر پر ہوا تھا اسی نے مصر میں سب سے پہلے یہ تڑپ پیدا کی تھی۔ اس وقت سے مصر نے مغربی دنیا کے ساتھ گہرا ربط اور تعلق پیدا کیا اور اس کو استوار رکھا۔ نصرانی مبلغ ۔ استاد، واعظ، طبیب، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک، برطانوی، فرانسیسی اور امریکی ۔ سیاح، آثار قدیمہ کے ماہر، تاجر اور یورپی اداروں اور ایجنسیوں کے نمائندے بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر جوق جوق اترنے لگے اور دن پر دن ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ شامیوں اور خاص کر لبنان کے ترقی پسند نصرانیوں نے یورپی اور امریکی مدرسوں کی سرپرستی کی۔ ان میں سے بہتوں نے مغرب کا سفر کیا یا یورپ میں جا بسے۔ جلد ہی تجدد یا مغربیت کی دوڑ میں لبنان اور شام مصر سے بہت آگے نکل گئے۔ تجدد یا مغربی رنگ میں رنگے جانے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ یورپ اور امریکہ کے معاشی، سماجی اور سب سے بڑھ کر قومی

تصورات یا تو پورے کے پورے یا جزئی طور پر اختیار کر لیے گئے یا انہیں ملک کے حالات کے مطابق بنا لیا گیا۔

تجدّد کا عمل پچھلی صدی کے ساتویں دہے میں عرب قومی تحریک کی صورت میں اپنے اوج وکمال پر پہنچا۔ یہ تحریک عربی ادب عالیہ کے ذہنی احیا اور عربی ادب و تاریخ کے مطالعہ کی تجدید سے شروع ہوئی تھی۔ عربوں کی عظمتِ رفتہ اور قرونِ وسطیٰ کی عربی بولنے والی قوموں کے ثقافتی کارناموں کی شہرت دوام نے اس چنگاری کو ہوا دے کر اسے شعلہ ور کر دیا۔ شاندار ماضی نے روشن مستقبل کی راہ سجھائی۔ سیاسی بیداری نے ذہنی بیداری پیدا کی اور نئے دور میں پہلی بار ایک متحد عرب دنیا کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی اور اس ضرورت کو سب سے زیادہ شامیوں اور مصریوں نے محسوس کیا۔

اس سے بھی بہت پہلے مصر کے ایک عالی ہمت والی محمد علی نے ایک آزاد عربی سلطنت کا منصوبہ سوچا تھا اور اس کا صدر مقام قاہرہ تجویز کیا تھا۔ محمد علی نے عرب میں وہابی تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور شام کو ترکوں سے چھین لیا، اس کے حوصلے یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ خود ترکوں کی خلافت کو اس سے بھاری خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن بدنصیبی سے محمد علی کا منصوبہ اپنے وقت سے کچھ اتنا پہلے تھا کہ کسی اور میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی قابلیت نہ تھی۔ اس کے سوا اس منصوبے میں اور بھی کئی نقص ہی نہ تھے بلکہ یہ منصوبہ مشرق میں برطانیہ اور دوسری یورپی حکومتوں کے مفادوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

چونکہ عربوں کی قومی تحریک علاقائی مسئلوں میں الجھ گئی تھی اور ان مسئلوں کا جلد سے جلد سلجھانا ازبس ضروری تھا اس لیے اس تحریک پر مقامی رنگ غالب آ گیا۔ چنانچہ اس تحریک نے اپنی ساری قوتیں شام و لبنان میں عثمانی اقتدار کے خلاف جھونک دیں، اس

دوران میں شمالی افریقہ اپنے آس پاس کے علاقوں کے ساتھ یورپ کی دوسری نصرانی قوموں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر عرب دنیا سے الگ ہو گیا۔

سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں الجیریا کے گلے میں فرانس نے اپنی غلامی کا پھندا ڈالا۔ اس کے بعد تونس نے ۱۸۸۱ء میں اپنے گھٹنے ٹیکے۔ ۱۹۱۲ء تک تو فرانس، اسپین اور اطالیہ نے مراکش سے لے کر لیبیا تک سارے علاقہ پر قبضہ جما لیا۔ مسلم دنیائے عرب سے پورے شمالی افریقہ کے کٹ جانے اور بڑی حد تک خود اپنے الگ سیاسی راستے پر گامزن ہونے کے دو بنیادی اسباب تھے۔ پہلے تو یہ تھا کہ جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقے اسلامی ملکوں کے آخری سرے پر واقع تھے۔ دوسرے یہ کہ مغربی دنیا نے سب سے پہلے اسی علاقے کو اپنے تسلط و اقتدار کا نشانہ بنایا تھا کیونکہ عربیت اور اسلام کا قلب و مرکز ہمیشہ مغربی ایشیا اور مصر ہی میں رہا ہے۔

ایک نئی عرب سلطنت کے قیام کی ایک اور کوشش شریف مکہ حسین نے کی تھی۔ اس نے پہلی جنگ عظیم سے فائدہ اٹھا کر ترکی اقتدار کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کی اور دوسرے عربوں کو بھی ترکوں کے خلاف ابھارا۔ حسین اپنی خلافت کے خواب دیکھ رہا تھا اور مکہ کو اپنا صدر مقام بنانا چاہتا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں عربوں کے اس بادشاہ نے "خلیفۃ المسلمین" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کا بیٹا فیصل پہلے شام کے تخت پر پھر عراق کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ شرق اردن کا والی بن گیا لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ محمد علی کی طرح حسین کی جدوجہد بھی قبل از وقت تھی۔ شام و لبنان پر فرانسیسی اور فلسطین اور شرق اردن پر برطانوی انتداب قائم ہو گیا۔ تیز نظر، پر عمل، حد درجہ قدامت پرست اور پر خشونت وہابیوں کے سردار ابن سعود نے حسین سے اس کی سلطنت چھین لی۔ آج ابن سعود عرب کے جتنے بڑے حصہ پر قابض و حکمراں ہے رسول اللہ کے عہد کے بعد سے کسی اور کو عرب کے

اتنے بڑے علاقے پر حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔

پہلی جنگ عظیم نے سینا سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی ہلال نما سرزمین کو اور جنوب کے پورے علاقے کو ترکوں کی غلامی سے آزاد کرا دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے سات بڑی عرب ریاستیں ایک نئے ادارے یعنی عرب لیگ کے تحت متحد ہو گئی ہیں یہ سات ریاستیں مصر، عراق، سعودی عرب، یمن، لبنان، شام اور شرق اردن ہیں۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں ان ساتوں ریاستوں نے قاہرہ میں عرب لیگ کے منشور پر دستخط کیے ہیں عرب لیگ کا مقصد رکن ریاستوں میں اتحادِ عمل پیدا کرنا ہے اور خاص کر تعلیمی، تجارتی اور حمل و نقل کے مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے۔ منشور میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اراکین ریاستوں میں سے کسی ایک پر حملہ ہو تو اس کی مدد کی جائیگی۔ منشور میں آپسی جھگڑوں کو لڑائی کے ذریعہ طے کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ عرب کی یہ ساتوں ریاستیں جن میں یمن اور شرق اردن بھی شامل ہیں، اقوام متحدہ کی رکن ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عرب لیگ دنیا کے اس علاقے میں امن و استحکام پیدا کرنے میں کامیاب رہیگی۔ شمالی افریقہ کی دوسری عرب ریاستیں جیسے ہی آزاد ہو جائینگی، یقیناً وہ بھی اس لیگ کی رکن بن جائینگی۔

عربوں نے پچھلے زمانوں میں دنیا کی ثقافت کی بڑی خدمت کی ہے اور اسے بڑے اونچے درجے پر پہنچایا ہے۔ پھر ایک بار دنیا کی ترقی پذیر جمہوری قوموں کی صف میں عرب اپنا مقام پیدا کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آثار بتا رہے ہیں کہ یہی عرب انسانیت کی ترقی میں آگے چل کر مزید حصہ لینے والے ہیں۔

---

تمت